ابنِ انشا
خمارِ گندم

خمارِ گندم

ابنِ انشا

فہرست

خوشۂ اوّل	۱۰
اُستاد مرحُوم	۱۳
فیض اور میں	۳۳
جنتری نئے سال کی	۴۲
نجات کا طالب، غالبؔ	۵۰
ناول مینو فیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ	۶۳
مکمّل باورچی خانہ جدید	۷۱
ہماری کمرشل سروس	۷۷
چند غیر ضروری اعلانات	۸۲
اشتہارات 'ضرورت نہیں ہے' کے	۸۸
ہم مہمانِ خصوصی بنے	۹۵
ہم پھر مہمانِ خصوصی بنے	۱۰۶
چند اشتہار	۱۱۲
شادیاں بھی سلیس	۱۱۹
آپ سے ملیئے	۱۲۸
ایک سپاسنامہ۔ ایک بے لوث کارکن کی طرف سے	۱۳۷
کچھ اور ٹکٹ کچھ اور امیدوار	۱۴۲

چند مطالبات	۱۴۹
ذرا فون کر لوں؟	۱۵۵
اے مردِ مجاہد	۱۶۴
آج کچھ فلموں کے بارے میں	۱۶۹
فلم دیکھئے اور ثوابِ دارین حال کیجئے	۱۷۹
فلم مائی کالال سنسر ہوتی ہے	۱۸۷
رباعی سے رکابی تک	۱۹۵
شاہی ممیرے کا فقیری سرمہ	۲۰۰
ذکر ایک موٹر شناس کا	۲۰۹
ذکر حضرت مریض الملّت کا	۲۱۵
تعمیری شاعری	۲۲۳
انٹرویو علم دریاؤ ہے	۲۲۸
اخبار کل کے اور آج کے	۲۳۴
سورج کا ڈبّہ گول ہو گیا	۲۴۳
باعث تحریر آنکہ	۲۴۹
حکیم بقل بطورا	۲۵۴
سرکاری یوم اقبال	۲۶۱
اک ذرا چاند تک	۲۶۸
یونیورسٹی میں شعبہ حماقت کھل گیا	۲۷۴
یہ پاگل پاگل پاگل فلمی دنیا	۲۸۱

انجمن معین الاموات	۲۸۸
دراصل ہم صوفی ہیں	۲۹۳
یونیورسٹی پروفیسر اور طوطے کی توپ	۲۹۸
چڑیاگھر کے دروازے صحافیوں پر کھل گئے	۳۰۳
سائل اور گدا	۳۰۸
میلہ مویشیاں میں اول انعام ایک شاعر کو ملا	۳۱۳
اُردُو ادب میں ہمارا مقام	۳۱۷
کتّوں کے کاٹنے کے اوقات مقرر ہو گئے	۳۱۹
آ گئے قوم کی بے لوث خدمت کرنے والے	۳۲۳
انٹرویو رضیہ بٹ کا	۳۳۰
سپاس نامے بند مت کیجئے	۳۳۶
ٹیکس	۳۴۲
صدارت	۳۴۷
عدالت کی بے بی نے چھٹی کر دی ہے	۳۵۷
ہم نے افسانہ نگاری کیوں ترک کی	۳۶۳
کسٹم کا مشاعرہ	۳۷۰
خطبۂ صدارت حضرت ابنِ انشا	۳۸۳
دعوتوں پر پابندی	۳۹۳
بٹیر کی نہاری	۴۰۰
روپیہ کمانا	۴۰۹

مسئلہ بچوں کے ناموں کا	۴۱۶
خطبہ حضرت بھینس الملک	۴۲۲
ایک انار و صد بیمار	۴۲۸
دعوتوں پر پابندی (۲)	۴۳۶
کوڑے والی گلی سے کوچہ ابن انشا تک	۴۴۱
آئین پر ہماری رائے تولی ہی نہیں گئی	۴۴۵
اب موسم کا حال سنیے	۴۵۲

خوشۂ اوّل

یہ مضمون اور خاکے انشاجی نے اس زمانے میں لکھے تھے جب پاکستانی قوم اپنی راکھ بحال کرنے میں مشغول تھی۔ ان دنوں ہم لوگ ہنسنے ہنسانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ خوش رہنے یا خوش رکھنے کو شریفوں کا فعل نہ سمجھتے تھے اور اب جب کہ یہ مضمون کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہیں پاکستانی قوم پہلے سے زیادہ سخت اور کھڑی ہو گئی ہے اور اپنے آپ پر ہے یا دوسروں کی حماقتوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اپنی بیشتر توبہ احتسابِ عام پر صرف کرنے میں مصروف ہے۔ آدمی جب اس طرح کے تشنّج میں مبتلا ہوتا ہے تو معالج عام طور پر اسے تن بہ تقدیر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ لیکن انشاجی اپنے عہد کے وہ واحد جمع گیر ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی قرایا

دین سے خود پر ہنسنے کے نئے نئے نسخے دریافت کر کے بڑے بڑے جبڑا بند لوگوں کو زندہ رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اپنے آپ پر ہنسنے کے لیے بڑے وقار اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخص اصل کا خاص شریف ہو اور شرافت محض اس کا پہناوا نہ ہو، وہی ایسی ہنسی کا کھیل کھیل سکتا ہے۔ اوروں پر ہنسنا، دوسروں کا خاکہ اڑانا اور طنز کی تیغ سے کشتوں کے پُشتے لگانا بڑا آسان کام ہے۔ ہر متکبّر اسی طرح سے کیا کرتا ہے لیکن یہ مزاح نگار کا کام نہیں۔ مزاح نگار تو انشا جی ایسا ہوتا ہے کہ جس کے ریشے میں تکبّر نام کی کوئی چیز موجود ہی نہ ہو۔ نہ اصل زندگی میں نہ تحریر کے وجود میں۔ ان ہنستے بولتے مضامین میں آپ کو بس ایک ہی دست تسلّی کی تھپکی ملے گی کہ انسان کبھی بھی انسانی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا اور ہر حالت میں انسان کی حد تک ہی رہتا ہے اس کی بڑائی عظمت اور سربلندی کے دعوے فقط اپنے آپ کو خوش کرنے اور تشفی دینے کے لیے ہوتے ہیں ورنہ حقیقت میں ہوتا انسان ہی ہے اور یہ جو اس کی کبھی کبھار کی ڈینگ ہے تو محض خمار گندم کی وجہ سے ہے اور جو کہیں یہ خمار نہ ہو تو خود بھی بڑے آرام میں رہے اور دوسروں کو بھی آرام سے رہنے دے۔ انشا جی کا اپنا ایک فلسفہ تھا کہ زندگی اور زندگی کے مسائل کا کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کیونکہ نتیجہ کچھ نکلتا ہی نہیں۔ حاصل کچھ ہوتا ہی نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ

حال تو صرف حساب کے سوالوں کا ہوتا ہے اور زندگی میں حساب ہے نہ سوال!

جن دنوں یہ مضمون رسالوں میں چھپا کرتے تھے ہم انشا جی کو منع کرتے تھے کہ ایسے عام فہم، سادہ اور دل خوش کُن، مضمون لکھا کریں۔ ایسے مضمونوں کی اشاعت سے ہم سب دوستوں کے تبحر علمی کی ہیٹی ہوتی تھی اور لوگ ہمیں بھی عام فہم قسم کے ادیب سمجھنے لگے تھے۔ ہمارے بار بار زور دینے پر کہ آخر ہم کو بھی زندہ رہنا ہے اور تاریخِ ادب کے ایوان میں اپنے لیے مناسب گوشہ فراہم کرنا ہے، انشا جی نے اوپرے دل سے ہماری بات مان لی تھی لیکن وعدہ کرنے کے باوجود انہوں نے ہماری اس درخواست پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ عمل نہ کیا۔ ایسے ہی لکھتے رہے اور اس طرح لکھتے لکھتے چلے گئے۔

اشفاق احمد

اُستاد مرحُوم

الہ دین نام تھا اور چراغ تخلّص۔ وطن مالوت ریواڑی جو گڑ گاؤں کے مردم خیز ضلع میں اہلِ کمال کی ایک بستی ہے اور آم کے اچار کے لیے مشہور۔ وہاں دھنیوں کے محلّے میں ان کی خاندانی حویلی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ نگڑ دادا ان کے اپنے فن کے خاتم تھے۔ شاہ غازی اورنگ زیب عالمگیر نے شہرہ سنا تو خلعت و پارچہ دے کر دلی بُلوایا اور اپنی محل سرا کے لحاف بھرنے پر مامور کیا۔ اللہ یاد نام تھا۔ لیکن نداف المُلک کے خطاب سے مشہور تھے۔ دلّی میں یہ بارہ برس رہے۔

وجاہت خاندانی کے ساتھ دولت روحانی بھی اُستاد مرحوم کو ورثے میں ملی تھی۔

ننھیال کی طرف سے سولھویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب نو گزے پیر سے جاملتا ہے جن کا مزارِ اقدس پاکستان اور ہندوستان کے قریب قریب ہر بڑے شہر میں موجود ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ انھی دونوں نسبتوں کا ذکر کر کے بھی کبھی کہا کرتے کہ شاعری میرے لیے ذریعۂ عزّت نہیں۔ اپنے نام کے ساتھ ننگِ اسلاف ضرور لکھا کرتے۔ دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی انہیں یہی لکھنا شروع کر دیا۔

اُستاد مرحوم کہ پورا نام ان کا حضرت شاہ الہ دین چراغ چشتی نظامی ریواڑی تھا، ہمیں ہائی اسکول میں اُردُو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ وطن کی نسبت سے اُردُو تو ان کے گھر کی لونڈی تھی ہی، فارسی میں کمال کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ پچیس پشت پہلے ان کے مورثِ اعلیٰ خراسان سے آئے تھے۔ کیوں آئے تھے؟ یہ سوال راقم کے دل میں بھی اکثر اٹھتا تھا۔ آخر ایک روز موقع دیکھ کر پوچھ لیا اور احتیاطاً وضاحت کر دی کہ مقصد اعتراض نہیں دریافت معلومات ہے۔ فرمایا۔ بابر کیوں آیا تھا؟ احمد شاہ ابدالی کیوں آیا تھا؟ اب جو راقم نے اس سوال نما جواب کی بلاغت پر غور کیا تو اپنی کم فہمی پر بے حد شرمندگی ہوئی۔ بابر نہ آتا تو ابراہیم لودھی کس سے شکست کھاتا۔ خاندانِ مغلیہ کہاں سے آتا؟ اتنی صدیاں ہندوستان کی رعایا بادشاہوں کے بغیر کیا کرتی؟ مالیہ اور خراج کس کو دیتی۔ کچھ ایسی ہی حکمت اُستاد مرحوم کے مورثِ اعلیٰ

کے ہندوستان آنے میں ضرور ہو گی جس میں ایک معمولی ذہن کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ خیر یہ ذکر تو ضمناً آ گیا مقصودِ کلام یہ کہ خراسان کی نسبت سے فارسی ایک طرح ان کے گھر کی زبان تھی۔ عربی کے بھی فاضل تھے۔ اگرچہ باقاعدہ نہ پڑھی تھی۔ عزیزم اسرار احمد کا نکاح خان بہادر ولایت علی کی پوتی سے ہوا تو اُستاد مرحوم ہی نے نکاح پڑھایا تھا اور کوئی کاغذ پرچہ سامنے رکھے بغیر ماشا اللہ، استغفر اللہ، نعوذ باللہ، لا حول ولا قوۃ الا باللہ اور ایسے ہی کئی اور عربی کے جملے بے تکان بولتے تھے۔ خیر خراسان بھی کہیں عرب ہی کی طرف کو ہے۔ لہٰذا عربی پر ان کا عبور جائے تعجّب نہیں۔ ہاں انگریزی کی لیاقت جو انہوں نے از خود پیدا کی تھی، اس پر راقم کو بھی حیرت ہوتی تھی۔ ایک بار ایک دیہاتی منہ اٹھائے ان کی کلاس میں گھس آیا، حضرت نے فوراً انگریزی میں حکم دیا۔ گٹ آؤٹ۔ اسے تعمیل کرتے ہی بنی۔ علاقے کا مال افسر انگریز تھا۔ ایک روز اسکول میں نکل آیا اور آدھا گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ اُستاد مرحوم برابر سمجھتے گئے اور سر ہلانے لگے۔ بیچ بیچ میں موقع بموقع یس یس اور پلیز پلیز بھی کہتے جاتے تھے۔ پرانے بزرگوں سر سیّد، حالی، شبلی وغیرہ کے متعلق سنا ہے کہ انگریزی سمجھتے خوب تھے لیکن بولنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہمارے اُستاد کا بھی یہی عمل تھا۔ ہمیں انگریزی میں اِن کے تبحّر کا پہلے علم نہ تھا۔ ہوا کہ ایک

روز ہماری انگریزی کی کلاس میں نکل آئے اور پوچھا۔ لڑکو بتاؤ تو تو ماش کی دال کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟ سب چُپ، کون بتاتا۔ پھر سوال کیا۔ کریلے کی انگریزی کیا ہے؟ یہ بھی کوئی نہ بتا سکا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ آخر اُستاد مرحوم نے بنایا اور ''انگلش ٹیچر'' کھول کر اس کی تصدیق بھی کرادی۔ یہ کتاب جو انگریزی کے علم کا قاموس ہے، سفر و حضر میں اُستاد مرحوم کے ساتھ رہتی تھی اور بڑے بڑے انگریزی دان ان کے سامنے آتے کتراتے تھے کہ جانے کب کس ترکاری کا انگریزی نام پوچھ لیں۔ انگریزی تحریر پر ان کی قدرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دستخط انگریزی ہی میں کرتے تھے۔

استاد مرحوم نے اہلِ زبان ہونے کی وجہ سے طبیعت بھی موزوں پاتی تھی اور ہر طرح کا شعر کہنے پر قادر تھے۔ اُردو فارسی میں ان کے کلام کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جو غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے اگلی نسلوں کے کام آئے گا۔ اس علم و فضل کے باوجود انکسار کا یہ علم تھا کہ ایک بار اسکول میگزین میں جس کے یہ نگراں تھے، ایڈیٹر نے اُستاد مرحوم کے متعلق لکھ دیا کہ وہ سعدی کے ہم پلّہ ہیں۔ انہوں نے فوراً اس کی تردید کی۔ اسکول میگزین کا پرچہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے اور ایک ایک کو دکھاتے کہ دیکھو لوگوں کی میرے متعلق یہ رائے ہے۔ حالانکہ من آنم کہ من دانم ایڈیٹر کو

بھی جو دسویں جماعت کا طالبعلم تھا، بُلا کر فہمائش کی کہ عزیزی یہ زمانہ اور طرح کا ہے۔ ایسی باتیں نہیں لکھا کرتے۔ لوگ مُردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ حسد کے مارے جانے کیا کیا کہتے پھریں گے۔

اہل علم خصوصاً شعرا کے متعلق اکثر یہ سنا ہے کہ ہم عصروں اور پیشروؤں کے کمال کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ اُستاد مرحوم میں یہ بات نہ تھی۔ بہت فراخ دل تھے۔ فرماتے غالبؔ اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت اچھا لکھتا تھا۔ میرؔ کے بعض اشعار کی بھی تعریف کرتے۔ امیر خسروؔ کے بھی معترف تھے۔ برملا کہتے کہ ذہین آدمی تھے۔ اور ان کی کہہ مکرنیاں ہمیشہ یاد گار رہیں گی۔ امیر خسروؔ کی ایک غزل اُستاد مرحوم کی ایک غزل کی زمین میں ہے۔ فرماتے انصاف یہ ہے کہ پہلی نظر میں فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سی بہتر ہے۔ پھر بتاتے کہ امیر خسروؔ مرحوم سے کہاں کہاں محاورے کی لغزش ہوئی ہے۔ اقبالؒ کے متعلق کہتے تھے کہ سیالکوٹ میں ایسا شاعر اب تک پیدا نہ ہوا تھا۔ اس شہر کو ان کی ذات پر فخر کرنا چاہیئے۔ ایک بار بتایا کہ اقبالؒ سے میری خط و کتابت بھی رہی ہے۔ دو تین خط علامہ مرحوم کو انہوں نے لکھے تھے کہ کسی کو ثالث بنا کر مجھ سے شاعری کا مقابلہ کر لیجئے۔ راقم نے پوچھا نہیں کہ ان کا جواب آیا کہ نہیں۔

اُستاد مرحوم کو عموماً مشاعروں میں نہیں بلایا جاتا تھا کیونکہ سب پر چھا جاتے تھے اور اچھے اچھے شاعروں کو خفیف ہونا پڑتا۔ خود بھی نہ جاتے تھے کہ مجھ فقیر کو ان ہنگاموں سے کیا مطلب۔ البتّہ جوبلی کا مشاعرہ ہوا تو ہمارے اصرار پر اس میں شریک ہوئے اور ہر چند کہ مدعو نہ تھے منتظمین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دیوانہ کسمنڈوی، خیال گڑ گانوی اور مسرت بانس بریلوی جیسے اساتذہ اسٹیج پر موجود تھے۔ اس کے باوجود اُستاد مرحوم کو سب سے پہلے پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ وہ منظر اب تک راقم کی آنکھوں میں ہے کہ اُستاد نہایت تمکنت سے ہولے ہولے قدم اٹھانے مائیک پر پہنچے اور ترنم سے اپنی مشہور غزل یوں پڑھنی شروع کی:

ہے رشتۂ غم اور دل مجبور کی گردن

ہے اپنے لیے اب یہ بڑی دور کی گردن

ہال میں ایک سنّاٹا چھا گیا۔ لوگوں نے سانس روک لیے۔ اُستاد مرحوم نے داد کے لئے صاحب صدر کی طرف دیکھا لیکن وہ ابھی تشریف نہ لائے تھے۔ کرسئ صدارت خالی پڑی تھی۔ دوسرا شعر اس سے بھی زور دار تھا:

صد حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

اور دار پہ ہے حضرت منصور کی گردن

دوسرا مصرع تمام نہ ہوا تھا کہ داد کا طوفان پھٹ پڑا۔ مشاعرے کی چھت اُڑنا سنا ضرور تھا دیکھنے کا اتّفاق آج ہوا۔ اب تک شعرا ایک شعر میں ایک مضمون باندھتے رہے ہیں۔ وہ بھی مشکل۔ اس شعر میں اُستاد مرحوم نے ہر مصرع میں ایک مکمل مضمون باندھا ہے۔ اور خوب باندھا ہے۔ لوگ اسٹیج کی طرف دوڑے۔ غالباً اُستاد مرحوم کی پابوسی کے لیے لیکن رضاکاروں نے انہیں باز رکھا۔ اسٹیج پر بیٹھے اُستادوں نے جو یہ رنگ دیکھا تو اپنی غزلیں چھاڑ دیں اور اُٹھ گئے۔ جان گئے تھے کہ اب ہمارا رنگ کیا جمے گا۔ اِدھر لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ تیسرے شعر پر ہی فرمائش ہونے لگی مقطع پڑھیے۔ مقطع پڑھیے۔۔۔۔ چوتھے شعر پر مجمع بے قابو ہو رہا تھا کہ صدر جلسہ کی سواری اور منتظمین نے بہت بہت شکریہ ادا کر کے اُستاد مرحوم کو ذیلی دروازے کے باہر چھوڑ کر اجازت چاہی۔ اب ضمناً ایک لطیفہ سن لیجئے جس سے اخبار والوں کی ذہنیت عیاں ہوتی ہے۔ دوسری صبح روزنامہ "پتنگ" کے رپورٹر نے لکھا کہ جن اُستادوں نے غزلیں پھاڑ دی تھیں وہ یہ کہتے بھی سنے گئے کہ عجب نا معقول مشاعرے میں گئے ہیں۔ لوگوں کی بے محابا داد کو اس بدباطن نے ہوٹنگ کا نام دیا اور اُستاد مرحوم کے اس مصرع کو ؎ صد حیف کوہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا۔

بوجہ لاعلمی یا شرارت بجائے توارد کے سرقہ قرار دیا۔ بات فقط اتنی تھی کہ منتظمین نے ایڈیٹر ''پتنگ'' کے اہلِ خانہ کو مشاعرے کے پاس معقول تعداد میں نہ بھیجے تھے۔ اگر یہ بات تھی تو اسے منتظمین کے خلاف لکھنا چاہیے تھا نہ کہ اُستاد مرحوم کے خلاف۔ اور پھر اس قسم کے فقروں کا کیا جواز ہے کہ استاد چراغ شعر نہیں پڑھ رہے تھے روئی دُھن رہے تھے۔ یہ محاورہ روئی دھننا نہیں روئی دُھنکنا ہے۔

اس دن کے بعد سے مشاعرے والے اُستاد مرحوم کا ایسا ادب کرنے لگے کہ اگر اُستاد اپنی کریم النفسی سے مجبور ہو کر پیغام بھجوادیتے کہ میں شریک ہونے کے لیے آ رہا ہوں تو وہ خود معذرت کرنے کے لیے دوڑے آتے کہ آپ کی صحت اور مصروفیات اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ اُستاد تو اُستاد ہیں۔ ہمیں ان کے ناچیز شاگردوں کو بھی رقعہ آجاتا کہ معمولی مشاعرہ ہے آپ کے لائق نہیں۔ زحمت نہ فرمائیں۔

اُستاد مرحوم کو رباعی، قصیدہ، غزل وغیرہ کے علاوہ تضمین سے خاص دلچسپی تھی۔ میونسپلٹی کے چیئرمین کے بچّے کے ختنے پر جو دھوم دھامی مشاعرہ ہوا اس کے لئے آپ نے غالبؔ کی غزل کی مخمّس میں تضمین کی تھی۔ اس پر بے انتہا داد ملی جب یہ بند کے چوتھے اور پانچویں مصرع پر آئے لوگ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے

ڈونگرے برساتے۔

یہ سچ ہے کہ اُستاد مرحوم کا نام اتنا مشہور نہ ہوا جتنا ان کے ہم عصروں اقبالؔ، حفیظؔ، جوشؔ وغیرہ کا۔ بات یہ ہے کہ یہ زمانہ پروپیگنڈے کا ہے اور اُستاد مرحوم نام و نمود اور چھپنے چھپانے کے قائل نہ تھے۔ ایک بار راقم نے اُستاد محترم کے ایما پر ان کی کچھ غزلیں مختلف رسالوں کو بھجوائی تھیں۔ ان میں سے ایک رسالہ چونّی لال خستہ کے ریواڑی گزٹ میں آب و تاب سے چھپا لیکن باقی واپس آگئیں۔ آئندہ کے لئے منع کر دیا اور اپنی طرف اشارہ کر کے یہ شعر پڑھا۔

اے تماشا گاہ عام روئے تو

تو کجا بہر تماشا می روی یہی حال ان کے مجموعوں کا ہوا۔ اپنا کلام مضبوط ولائتی کاغذ پر لکھتے تھے۔ اور جب پورا رجسٹر ہو جاتا تو اس کی جلد بندھوا کر جلد اوّل، جلد دوم وغیرہ لکھ کر الماری میں سجا دیتے۔ مولانا کے ہاں مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اور ایک بات میں تو یہ ذخیرہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس، خدا بخش لائبریری وغیرہ کے ذخیروں سے بھی ممیّز اور فائق سمجھنا چاہئے۔ ان کتب خانوں میں سب مخطوطات پرانے زمانے کے ہیں۔ بعض تو ہزار ہزار سال پرانے نسخے اور بد رنگ۔ ہاتھ لگا تو

مٹّی ہو جائیں لیکن اُستاد مرحوم کے سبھی مخطوطات نہایت اچھی شکل میں تھے اور زیادہ تر ان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے۔ بیسویں صدی کے مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ غالباً کسی کے پاس نہ ہو گا۔ اُستاد کی چیزیں جو طباعت کے عیب سے آلودہ نہ ہو تیں اسے بھی راقم مصلحتِ خداوندی سمجھتا ہے۔ اگر سبھی چیزیں چھپ جایا کریں تو قلمی نسخے کہاں سے آیا کریں اور قلمی نسخے نہ ہوں تو لوگ ریسرچ کس چیز پر کریں اور ریسرچ نہ ہو تو ادب کی ترقی رُک جائے اور پی ایچ ڈی نقّاد پیدا ہوئے بند ہو جائیں۔

راقم نے ایک بار عرض کیا کہ ان نوادر کو تو کسی ریسرچ لائبریری میں ہونا چاہیئے۔ فرمایا۔ میرا اپنا یہی خیال تھا اور میں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو لکھا بھی تھا۔ اور مسودات کی فہرست منسلک کی تھی۔ ان بے چاروں نے شکریہ ادا کیا لیکن معذرت کی کہ فی الحال ہماری لائبریری میں جگہ کی کمی ہے۔ البتّہ نعمت اللہ کباڑی مرحوم جو دہلی کے ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اکثر ان کے گھر کے چکر کاٹتے تھے۔ اور مخطوطات جدیدہ و مفیدہ کا یہ سارا ذخیرہ اٹھانے کو تیار تھے۔ امّاں بی یعنی اُستاد مرحوم کی منجھلی اہلیہ نے کتنی بار کہا بھی کہ اس وقت اچھا بھاؤ جا رہا ہے، تُلوا دو۔ لیکن اُستاد مرحوم نے کبھی لالچ گوارا نہ کیا۔ جواب دیا تو یہی کہ میرا

مقصد جلبِ منفعت نہیں۔ خدمتِ ادب ہے۔

اُستاد مرحوم کا خط نہایت پاکیزہ اور شکستہ تھا کسی خاص صنعت میں لکھتے تھے جس کا نام اس وقت راقم کے ذہن سے اتر گیا ہے۔ خوبی اس کی یہ ہے کہ صرف لکھنے والا اسے پڑھ سکتا ہے۔ راقم التحریر کے املا میں بھی جو لوگوں کو یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ اُدھر ہی کا فیضان ہے۔

طبیعت میں ایجاد کا مادہ تھا۔ لکیر کے فقیر نہ تھے۔ اب اسی لفظ فیضان کو لیجئے ایسے وہ ظ سے لکھتے تھے۔ ایک بار طوطا رام صیّاد نے اس پر اعتراض بھی کیا۔ یہ صاحب ہوشیار پور کے رہنے والے تھے اور معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ اُستاد مرحوم نے چمک کر جواب دیا۔ یہ ہماری زبان ہے پیارے۔ ہم جیسا لکھیں گے وہی سند ہو گا۔ ماسٹر جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بعد میں راقم کو اُستاد مرحوم نے ایک مستند علمی نسخے میں فیضان ظ سے لکھا ہوا دکھایا۔ اس نسخے کا نام یاد نہیں لیکن غالباً کم از کم پچیس سال پرانا ہو گا اور خود اُستاد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ ان شہادتوں کے باوجود وسیع القلب اتنے تھے کہ آخر عمر میں فرمایا کرتے ض سے لکھنا بھی غلط نہیں۔ اسی طرح بہت سے اور الفاظ تھے جن کا تلفّظ اور املا وہ رواجِ عام سے ہٹ کر کرتے تھے۔ کوئی انگشت نمائی کرتا تو جواب دیتے کہ ہمارے گڑ گاؤں میں یونہی لکھتے اور بولتے ہیں۔

معترض چُپ ہو جاتا۔

اُستاد مرحوم کے اوصافِ حمیدہ کا حال لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ دریادل آدمی تھے۔ کوئی شخص کوئی چیز پیش کرتا تو کبھی انکار نہ کرتے۔ دوسری طرف اس بات کا خیال رکھتے کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہ دیتے دوسروں کو بھی منع کر دیتے تھے کہ یہ بھی تمہاری طرح انسان ہے۔ اس کی خود داری مجروح ہو گی۔ اس شخص کو پند و نصائح سے مطمئن کر کے بھیج دیتے۔

اُستاد مرحوم کی طبیعت خوشامد سے نفوذ تھی۔ راقم کو معلوم نہیں کہ محکمۂ تعلیم کے افسر اور ڈپٹی کمشنر کے علاوہ کہ حاکمِ ضلع ہونے کے لحاظ سے اولو الامر کی تعریف میں آتے ہیں، انہوں نے کبھی کسی کا قصیدہ کہا ہو۔ البتّہ کسی افسر یا سیٹھ کے ہاں شادی ہو تو سہرا کہہ کر لے جاتے اور ترنّم سے پڑھ کر سناتے۔ فرماتے یہ وضعداری ہے۔ اس کا انعام کسی نے دے دیا تو لے لیا ورنہ اصرار نہ کرتے۔ اشاعت تعلیم سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب اور انسپکٹر تعلیمات کے بچّوں کو پڑھانے جایا کرتے تھے۔

اُستاد مرحوم کا مسلک صُلحِ کُل تھا۔ جس زمانے میں مولوی محمد عمر انسپکٹر تعلیمات تھے یہ تنظیم اہلِ سنّت کے جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ان کی جگہ ظلِّ حسنین امروہوی آئے تو اُن کو تنظیم سے شکائتیں پیدا ہو گئیں۔ اور اثنا عشری مسجد میں دیکھے جانے لگے۔ اہلِ بیت کے جو مرثیے ان کے دیوان میں ہیں اسی زمانے کے ہیں۔ کچھ دنوں قریشی نور احمد کا تقرر بھی اس خدمت پر رہا۔ یہ قادیانی احمدی تھے۔ اُستاد مرحوم ان دنوں برملا فرماتے کہ مجھے تو اگر اسلام کی سچی روح کہیں نظر آتی ہے تو انھی کے ہاں۔ اس سال عید کی نماز انہوں نے احمدیوں کی مسجد میں پڑھی۔ فرماتے سبھی خدا کے گھر ہیں کوئی فرق نہیں۔ پنڈت رادھے شیام ہیڈ ماسٹر ان سے ہمیشہ خوش رہے۔ انہیں اُستاد مرحوم ہی سے معلوم ہوا تھا کہ کرشن جی باقاعدہ نبی تھے۔ اور تورات میں ان کی آمد کا ذکر ہے۔

موسیقی سے شغف تھا اور گلے میں نور بھی تھا۔ لیکن محلے والے اچھے نہیں تھے۔ اُستاد کی خواہش تھی کہ شہر سے باہر تنہا کوئی مکان ہو تو دلجمعی سے تکمیل شوق کریں۔ ویسے کبھی کبھی محفل میں ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے تھے کہ یہی ان کا محبوب ساز تھا، اور سہگل مرحوم کی مشہور غزل 'نکتہ جیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے، سُنانی شروع کر دیتے۔ ایسے موقع پر نکتہ شناس لوگ آنکھوں ہی آنکھوں

میں اشارے کر کے ایک ایک کر کے اُٹھ جاتے کیونکہ اس فن کے ریاض کے لئے تنہائی ضروری ہے۔ اُستاد مرحوم ہاتھ دیکھنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اور طبیبِ حاذق بھی تھے۔ آخر میں طبابت تو انہوں نے ترک کر دی تھی کیونکہ ایک مریض کے رشتہ داروں نے، جو ان کے زیر علاج تھا اور ان کی تیر بہدف دوا حکیمی کی ایک خوراک کھانے کے بعد خالقِ حقیقی سے جاملا تھا، بے وجہ ایک فساد کھڑا کر دیا تھا اور نوبت پولیس تھانے تک پہنچی تھی۔ دست شناسی کا شوق البتہ جاری رہا۔ طبابت کی طرح اس فن میں بھی نہ کسی کے شاگرد تھے نہ کوئی کتاب پڑھی۔ خود فرماتے مبدا فیاض کی دین ہے۔ ماضی کا حال نہایت صحت سے بتاتے۔ لیکن اجنبیوں کا ہاتھ دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ انہی سے کھلتے جن سے دیرینہ واقفیت اور رسم و راہ ہوتی۔ مستقبل کے بارے میں ان کا اصول تھا کہ لوگوں کو صحیح بات نہ بتانی چاہئے ورنہ ان کا تقدیر اور عالمِ غیب پر سے ایمان اُٹھ جاتا ہے۔ اس فن سے ان کی آمدنی خاصی تھی۔ اور اسی پر قانع تھے۔ اسکول کی تنخواہ بچا کر خدا کی راہ میں لوگوں کو سود پر دے دیتے تھے۔

ایسی دیدہ زیب شخصیتیں چشمِ فلک نے کم ہی دیکھی ہوں گی جیسے استاد چراغ رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ قد پانچ فٹ سے بھی نکلتا ہوا، جسم بھرا بھرا، خصوصاً کمر کے آس

پاس۔ سر پر میل خورے کپڑے کی ٹوپی اور اس کے ساتھ کی شیر وانی۔ راقم نے کبھی ان کو ٹوپی کے بغیر نہ دیکھا۔ ایک بار خود ہی فرمایا کہ ایک تو یہ خلافِ تہذیب ہے۔ دوسرے کوّے ٹھونگیں مارتے ہیں۔ ٹانگیں چھوٹی چھوٹی تھیں جس کی وجہ سے چال میں بچّوں کی سی معصومیت تھی۔ رنگ سرمئی۔ آنکھیں سُرخ و سفید اور پھر جلال ایسا کہ مائیں دیکھ کر بچّوں کو چھپا لیتی تھیں۔ دانت تمباکو خوری کی کثرت سے شہید ہو گئے تھے۔ لہٰذا تمباکو چھوڑ دیا تھا۔ فقط نسوار کا شوق رکھا تھا۔ چشمہ لگاتے تھے لیکن ہماری طرح چشمے کے غلام نہ تھے۔ بالعموم اس کے اُوپر سے دیکھتے تھے۔ سُرخ کمر بند میں چابیوں کا گچھا چاندی کی گھنگھریوں کی طرح بجتا۔ دُور ہی سے معلوم ہو جاتا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں۔ اس لیے گیارہ تک آسانی گن لیتے تھے۔ حواس پر ایسا قابو تھا کہ جس محفل میں چاہتے بیٹھے بیٹھے سو جاتے اور خرّاٹے لینے لگتے۔ پھر آپ ہی آپ اٹھ بھی بیٹھتے۔ کھانے کا شوق ہمیشہ سے تھا، خصوصاً دعوتوں میں۔ فرماتے کھانے میں دو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اچھا ہو اور بہت ہو۔ کھانے کے آداب کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ سب سے پہلے شروع کرو اور سب سے آخر میں ختم کرو۔ جس ضیافت میں اُستاد مرحوم ہوتے لوگ کھاتے کم، ان کی طرف رشک سے دیکھتے زیادہ تھے۔ لیکن یہ جوانی کی باتیں

ہیں۔ آخر عمر میں پرہیزی کھانا کھانے لگے۔ میزبان کے ہاں پہلے سے کہلوا دیتے کہ یخنی وغیرہ کا انتظام کر لینا۔ اور میٹھے میں سوائے حلوے کے اور کچھ نہ ہو. چوزے کے متعلّق فرماتے کہ زود ہضم ہے، خون صالح پیدا کرتا ہے۔ دال سے احتراز فرماتے کہ نفخ پیدا کرتی ہے۔

بذلہ سنجی اُستاد مرحوم کی طبعیت میں ایسے تھی جیسے باجے میں راگ، جیسے تلوار میں جوہر۔ لطائف بیربل و ملادوپیازہ کے سب لطیفے نوک زبان تھے۔ ان سے محفلوں کو گرماتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ لطیفوں کی تخصیص نہیں لوگ ان کی دوسری باتوں پر بھی ہنستے تھے۔

ایسا بڑا آدمی اور سادگی کا یہ عالم کی کبھی خیال نہ کیا کہ لباس میلا ہے یا پیوند لگا ہے۔ فرماتے انسان کا مَن اُجلا ہونا چاہیے۔ تن تو ایک عارضی چولا ہے۔ اس مضمون کا کبیر کا ایک دوہا بھی پڑھتے۔ کپڑا پہننے کا سلیقہ تھا۔ ایک کالی اچکن کو پورے بیس برس تک چلایا۔ جب سردی آتی اسی کو جھاڑ کر پہن لیتے۔ فرماتے کپڑے کے دشمن دو ہیں۔ دھوبی اور استری۔ واقعی سچ ہے۔ یہ اچکن جو آخر میں ملگجے رنگ کی ہو گئی تھی اور دور سے چرمی نظر آتی تھی، دھوبی اور استری کے ہتھے چڑھ جاتی تو کبھی کی غارت ہو گئی ہوتی۔ ایک روز اسے پہنے راقم کے ہمراہ کسی قوّالی میں جا رہے تھے۔ قوّالی کرنے

نہیں سننے کہ چوراہے پر رُکنا پڑا۔ ایک مرد شریف نے نہ جانے کیا خیال کرکے ان کے ہاتھ پر ٹکا رکھ دیا۔ راقم کچھ کہنے کو تھا کہ اُستاد مرحوم نے اشارے سے منع کر دیا۔ اور ٹکا جیب میں ڈال لیا۔ یہی حال جوتے کا تھا۔ فرماتے جوتا ایسی چیز ہے کہ کبھی ناکارہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تلا پھٹ جاتا تو نیا لگوا لیتے۔ اوپر کا حصّہ پھٹ جاتا تو اسے بدلوا لیتے۔ داڑھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرح پُر رعب، گھنی اور لمبی۔ اسے ترشواتے نہیں تھے۔ فرماتے خدا کا نور ہے۔ بعض لوگوں کو یقین تھا کہ پیسہ بچانے کے لیے ایسا کرتے ہیں، لیکن یہ غلط ہے۔ ان کے پاس پیسے بہت تھے اور جمع کرنے کا شوق بھی تھا۔ لیکن پیسے کی طمع ان میں نہ تھی۔

اُستاد مرحوم یوں تو اپنے سبھی شاگردوں سے محبت کرتے تھے۔ حاجی امام دین سوختہ بیکری والے، خلیفہ اے ڈی مقراض مالک جنٹلمین ہیر کٹنگ سیلون، حسین بخش مدعی آعرائض نویس وغیرہ سبھی ان کے اخلاقِ حسنہ اور الطاف عمیم کی گواہی دیں گے۔ لیکن راقم سے ان کو ربطِ خاص تھا۔ فرماتے میرے علم و فضل کا صحیح جانشین تو ہو گا۔ رات کا کھانا اکثر راقم کے ساتھ کھاتے اور وقت کی پابندی کا لحاظ اس درجہ تھا کہ اُدھر دستر خوان پر بیٹھے اُدھر اُستاد مرحوم پھاٹک سے نمودار ہوئے۔ بچّوں سے لگاؤ تھا۔ جو بچّہ ہمّت کر کے ان کے قریب آتا انعام پاتا۔ ایک بار راقم کے بڑے

بھتیجے کو ایک اکنّی دی تھی۔ وہ اب تک اُستاد مرحوم کی یادگار کے طور پر رکھے ہوئے ہے۔

ایک دن فرمایا۔ ایک بات کہوں؟ راقم نے عرض کیا۔ فرمایئے۔ بولے جھوٹ تو نہ سمجھو گے؟ راقم نے کہا۔ خانہ زاد کی کیا مجال! فرمایا تو کان کھول کر سنو۔ میری نظر میں تم جوشؔ، جگرؔ وغیرہ بلکہ آج کل کے سبھی شاعروں سے اچھا لکھتے ہو۔ راقم نے آبدیدہ ہو کر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ سب آپ کا فیض ہے ورنہ بندہ کچھ بھی نہ تھا۔ قارئین اسی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُستاد مرحوم کی نظر کتنی گہری تھی اور رائے کتنی صائب ان کا یہ قول راقم نے اکثر لوگوں کو سنایا۔ بعضوں نے جو انصاف پسند تھے اعتراف کیا کہ ہاں ایسے استاد کا ایسا شاگرد کیوں نہ ہو۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے کہا کہ یہ بات شاید اُستاد نے فقط تمہارا دل بڑھانے کو کہی ہو۔ ان سے راقم کیا بحث کرتا۔ یہی کہا کہ آپ جو فرمائیں بجا ہے لیکن دل میں سوچا کہ جس شخص کو زندگی بھر تملّق اور زمانہ سازی سے مسئلہ نہ رہا ہو وہ اس بات میں کیوں مبالغہ کرنے لگا۔ اور پھر اا پنے ایک ادنیٰ شاگرد کے لیے؟

سنہ ۱۹۶۳ء عجب ظالم سال تھا۔ اس میں دنیا کو ایک طرف صدر کینیڈی کا داغ دیکھنا پڑا اور دوسری طرف علم و فضل اور جود و سخا کا یہ آفتاب جس نے واقعی چراغ بن کر

زمانے کو روشن کیا تھا غروب ہو گیا۔ عمرِ عزیز کے ۸۲ برس ابھی پورے نہ ہوئے تھے۔ کچھ دن باقی ہی تھے۔ ہائے اُستاد

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد دستار کے

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

وصال تاندلیانوالہ ہی میں ہوا جہاں اُستاد مرحوم پاکستان بننے کے بعد مقیم ہو گئے تھے اور گھی کی آڑھت کرتے تھے۔ سنا ہے معمولی بخار ہوا تھا۔ اور ہر چند کہ اپنے ہی مجربات سے علاج کیا طبیعت بگڑتی ہی گئی۔ راقم کو خبر ملی تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا۔ "ہائے الہ دین کا چراغ بُجھ گیا۔" عدد گنے تو پورے ۱۳۸۳ھ۔ کیسی برجستہ اور سہل ممتنع تاریخ ہے۔ آج استاد مرحوم زندہ ہوتے تو اس کی داد دیتے۔

اُستاد کے خاندان کی کیفیت بھی مختصر الفاظ میں عرض کروں۔ چار شادیاں تھیں۔ پانچویں عمر بھر نہ کی۔ کیونکہ شرع سے انحراف منظور نہ تھا۔ آہ بھر کر فرماتے جب تک چاروں زندہ ہیں ایک اور کیسے کر لوں۔ شروع میں چار کی اجازت بھی اس شرط کے ساتھ ہے کہ سلوک یکساں ہو۔ سو الحمد اللہ کے چاروں کا سلوک ان سے یکساں

تھا۔ لیکن اُستاد بھی ایسے صابر تھے کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ اولاد صرف ایک سے ہوئی۔ امید ہے کہ عزیز مکرم ہدایت علی ان کے فرزندِ اکبر جو خود بھی موزوں طبع ہیں اور فراغ تخلّص کرتے ہیں، اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ رسمی تعلیم ان کی زیادہ نہیں۔ صفائے باطن کے مراحل فقیروں کے تکیوں اور قوّالی کی محفلوں میں طے کئے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ استاد مرحوم کے وصال کے بعد سرِ عام شراب پینا انہوں نے ترک کر دیا ہے۔ اور افیم بھی اب اعتدال سے کھاتے ہیں۔ یہ بھی اپنے نامی والد کی طرح روپے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ لہٰذا تعزیت کے خط کے جواب میں فوراً پانچ سو روپے منگوا بھیجے۔ راقم نے لکھا کہ عزیزی اس خانوادے پر متاع دل و جان نثار کر چکا ہوں۔ روپیہ کیا پیچھے رہ گیا؟ تم یوں کرو کہ اُستاد مرحوم کی قبر پر سبز چادر چڑھا کر بیٹھ جاؤ۔ خدا برکت دے گا اور تمھیں رزق پہنچا دیا کرے گا۔ اور اگر فتح علی مبارک علی راضی ہو جائیں تو سبحان اللہ۔ سال کے سال عرس سیر اپا قدس کا اہتمام بھی کرو۔ معلوم نہیں یہ خط ان کو ملا کہ نہیں کیونکہ پھر جواب نہیں آیا اور راقم کو بھی مکروہاتِ دنیوی سے اتنی فرصت نہ ملی کہ دوبارہ خط لکھتا۔

فیض اور میں

(افکار کے فیض نمبر کے لیے)

بڑے لوگوں کے دوستوں اور ہم جلیسوں میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دوستی اور ہم جلیسی کا اشتہار دے کر خود بھی ناموری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ عجز و فروتنی کے پتلے جو شہرت سے بھاگتے ہیں کم از کم اپنے ممدوح کی زندگی میں۔ ہاں اس کے بعد رسالوں کے ایڈیٹروں کے پُر زور اصرار پر انہیں اپنے تعلقات کو الم نشرح کرنا پڑے تو دوسری بات ہے۔

ڈاکٹر لکیر الدّین فقیر کو لیجئے۔ جیسے اور پروفیسر ہوتے ہیں ویسے ہی یہ تھے۔ لوگ فقط

اتنا جانتے تھے کہ علامہ اقبال کے ہاں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ سو یہ بھی خصوصیت کی کوئی بات نہیں۔ یہ انکشاف علامہ کے انتقال کے بعد ہوا کہ جب کوئی فلسفے کا دقیق مسئلہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تو انہی سے رجوع کرتے تھے۔ ڈاکٹر لکیر الدّین نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز آدھی رات کو میں چونک کر اُٹھا اور کھڑکی میں سے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ صاحب کا خادمِ خاص علی بخش ہے۔ میں نے پوچھا "خیریت؟" جواب ملا "علامہ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت؟" بولا "جی ہاں اس وقت اور تاکید کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آنا۔" میں حاضر ہوا تو اپنے لحاف میں جگہ دی اور فرمایا۔ "آج ایک صاحب نے گفتگو میں رازی کا ذکر کیا۔ تم جانتے ہو میں تو شاعر آدمی ہوں۔ آخر کیا کیا پڑھوں؟ اس وقت یہ پوچھنے کو تکلیف دی ہے کہ یہ رازی کون صاحب تھے اور ان کا فلسفہ کیا تھا۔" میں دل ہی دل میں ہنسا کہ دیکھو اللہ والے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ بہر حال تعمیلِ ارشاد میں مَیں نے امام فخر الدّین رازی اور ان کے مکتبِ فکر کا سیر حاصل احاطہ کیا اور اجازت چاہی۔ علامہ صاحب دروازے تک آئے، آبدیدہ ہو کر رخصت کیا اور کہا "تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب اس شہر میں اور کون رہ گیا ہے جس سے کچھ پوچھ سکوں۔"

اگلی اتوار کو زمیندار کا پرچہ کھولا تو صفحۂ اوّل پر علامہ موصوف کی نظم تھی جس میں وہ

مصرع ہے

غریب اگرچہ ہیں رازیؔ کے نکتہ ہائے دقیق

ہر چند میں نے واضح کر دیا تھا کہ رازیؔ کا فلسفہ خاصا پیش پا افتادہ ہے۔ دقیق ہرگز نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے علامہ مرحوم کو ایسا ہی لگا۔

مدرسہ علمیہ شرطیہ موچی دروازے کے پرنسپل مرزا اللہ دِتّہ خیال نے جو کچھ ماہ میں میٹرک اور دو سال میں بی اے پاس کرانے کی گارنٹی لیتے ہیں ماہ نامہ "تصویر بتاں" میں پہلی بار اس بات کا اعتراف کیا کہ علامہ مرحوم کو مثنوی مولانا روم کے بعض مقامات میں الجھن ہوتی تو مجھے یاد فرماتے تھے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ آپ منشی فاضل کیوں نہیں کر لیتے، تمام علوم آپ کے لئے پانی ہو جائیں گے۔ بولے "اس عمر میں اتنی محنت شاقہ نہیں کر سکتا۔" بعد میں مَیں نے سوچا کہ واقعی شعرا تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں۔ ان کو علم اور ریسرچ کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ تو ہم جیسے سر پھروں کا کام ہے۔

علامہ کے ایک جگری دوست رنجور فیروز پوری کو بھی لوگ گوشۂ گمنامی سے نکال لائے۔ ایک بصیرت افروز مضمون میں آپ نے لکھا "خاکسار نے اپنے لیے شاعری

کو کبھی ذریعہ عزّت نہیں جانا۔ بزرگ ہمیشہ سے نیچہ بندی کرتے آئے تھے۔ اس میں خدا نے مجھے برکت دی۔ جو ٹوٹا پھوٹا کلام بسبیل ارتجال کہتا تھا علامہ صاحب کی نذر کر دیتا تھا۔ اب بھی دیکھتا ہوں کہ ارمغانِ حجاز وغیرہ کتابوں میں سینکڑوں ہی مصرعے جو اس ہیچ مداں کج مج زباں نے علامہ کے گوش گزار کیے تھے، نگینوں کی طرح چمک رہے ہیں۔

حکیم عزرائیلی مصنّف طب بقراطی نے نمائندہ ''صبح و شام'' کو انٹرویو دیا تو بتایا کہ ایک زمانے میں حکیم الامت کو بھی طِب کا شوق ہوا۔ بندہ نسخہ لکھتا اور علامہ مرحوم پُڑیاں بناتے اور جوشاندے کوٹتے چھانتے۔ اس دوران اگر فکرِ سخن میں مستغرق ہو جاتے تو کبھی کبھی ہاون دستے میں اپنا انگوٹھا پھوڑ بیٹھتے۔ دوسرے روز عقیدت مند پوچھتے کہ یہ کیا ہوا تو فقط مسکرا کر انگشتِ شہادت آسمان کی طرف بلند کر دیتے۔

عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ علامہ مرحوم آخری سالوں میں کبوتر بازی اور پہلوانی نہیں کرتے تھے اور مینڈھے لڑانے کا شوق بھی ترک کر دیا تھا۔ صحیح صورتِ حال سے میاں معراج دین گوجرانوالوی نے رسالہ ''غزل الغزلات'' کے اقبال نمبر میں پردہ اٹھایا۔ پھر علامہ مذکور کے احوال میں اکثر آیا ہے کہ فلاں بات سُنی اور آبدیدہ ہو گئے۔ فلاں ذکر ہوا اور آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اس کا بھید بھی علامہ مرحوم کے

ایک اور قریبی دوست ڈاکٹر معین الدّین ماہر امراضِ چشم نے کھولا۔

اسی زمرے میں ڈاکٹر محمد موسیٰ پرنسپل بانگِ دراہومیو پیتھک کالج گڑھی شاہو کو رکھتے جنہوں نے علامہ اقبال مرحوم کی زندگی کے ایک اور غیر معروف گوشے کو بے نقاب کیا۔ اپنی کتاب ''تسہیلِ ہومیو پیتھی'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں۔ ''یہ لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ ڈاکٹر اقبال فقط نام کے ڈاکٹر تھے۔ اس عاجز کا مطالعہ اتنا نہیں کہ ان کے شاعرانہ مقام پر گفتگو کرسکے۔ ہاں اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مرض کی تشخیص میں اپنے بعد میں نے انہی کو دیکھا۔ بعض اوقات دواؤں کے ضمن میں بھی ایسے قابلِ قدر مشورے دیتے کہ یہ عاجز اپنے تبحرِ علمی کے باوجود حیران رہ جاتا۔ بہر حال شاعر تو ہمارے ہاں اب بھی اچھے اچھے پائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک علامہ مرحوم کی رحلت ہومیو پیتھی طب کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ میں مریضوں پر توجہ دیتا اور وہ ایک کونے میں بیٹھے حقّہ پیتے رہتے۔ ہم اس عاجز کے مطب کی کامیابی میں جو مایوس مریضوں کی آخری امید گاہ ہے اور جہاں خالص جرمن ادویات بکفایت فراہم کی جاتی ہیں۔ ان کے نامِ نامی کا بڑا دخل تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ آپ نے اپنی ایک مشہور تصنیف کا نام بھی عاجز کے مطلب کے نام پر رکھا۔

فیضؔ صاحب کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے مجھے تامّل ہوتا ہے۔ دنیا حاسدانِ بد سے خالی نہیں۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ ہم نے تو اس شخص کو بھی فیضؔ صاحب کے پاس اٹھنے بیٹھتے نہیں دیکھا تو کون ان کا قلم پکڑ سکتا ہے۔ احباب پُر زور اصرار نہ کرتے تو یہ بندہ بھی اپنے گوشۂ گمنامی میں مست رہتا۔ پھر بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ لکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ آیا یہ لکھنے کی ہیں بھی یا نہیں۔ مثلاً یہی کہ فیض صاحب جس زمانے میں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے کوئی اداریہ اس وقت تک پریس میں نہ دیتے تھے جب تک مجھے دکھا نہ دیتے تھے۔ کئی بار عرض کیا کہ ماشاء اللہ آپ خود اچھی انگریزی لکھ لیتے ہیں لیکن وہ نہ مانتے اور اگر میں کوئی لفظ یا فقرہ بدل دیتا تو ایسے ممنون ہوتے کہ خود مجھے شرمندگی ہونے لگتی۔ پھر فیضؔ صاحب کے تعلق سے وہ راتیں یاد آتی ہیں جب فیضؔ ہی نہیں بخاری، سالک، خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ ہم سبھی ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست راوی کے کنارے ٹہلتے رہتے اور ساتھ ہی ساتھ علم و ادب کی باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ یہ حضرات مختلف زاویوں سے سوال کرتے اور یہ بندہ اپنی مہم کے مطابق جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتا۔ اور یہ بات تو نسبتاً حال کی ہے کہ ایک روز فیض صاحب نے صبح صبح مجھے آن پکڑا اور کہا ”ایک کام سے آیا ہوں۔ ایک تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یورپ میں آج کل آرٹ کے کیا رجحانات ہیں۔

اور آرٹ پیپر کیا چیز ہوتی ہے۔ دوسرے میں واٹر کلر اور آئل پینٹنگ کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹھمری اور دادرا کا فرق بھی چند لفظوں میں بیان کر دیں تو اچھا ہے۔" میں نے چائے پیتے پیتے سب کچھ عرض کر دیا۔ اٹھتے اٹھتے پوچھنے لگے۔ "ایک اور سوال ہے۔ غالبؔ کس زمانے کا شاعر تھا اور کِس زبان میں لکھتا تھا؟" وہ بھی میں نے بتایا۔ اس کے کئی ماہ بعد تک ملاقات نہ ہوئی۔ ہاں اخبار میں پڑھا کہ لاہور میں آرٹ کونسل کے ڈائریکٹر ہو گئے ہیں۔ غالباً اس نوکری کے انٹرویو میں اس قسم کے سوال پوچھے جاتے ہوں گے۔

اکثر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نقشِ فریادی کا رنگِ کلام اور ہے اور فیضؔ صاحب کے بعد کے مجموعوں دستِ صبا اور زنداں نامہ کا اور۔ اب چونکہ اس کا پس منظر راز نہیں رہا اور بعض حلقوں میں بات پھیل گئی ہے لہٰذا اسے چھپانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ فیضؔ صاحب جب جیل گئے ہیں تو ویسے تو ان کو زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ لیکن کاغذ قلم ان کو نہیں دیتے تھے۔ اور نہ شعر لکھنے کی اجازت تھی۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ان کی آتش نوائی پر قدغن رہے۔ اور لوگ انہیں بھول بھال جائیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ فیض صاحب جیل سے باہر آئے تو سالم تانگہ لے کر سیدھے میرے پاس تشریف لائے اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے۔

"اور تو سب ٹھیک ہے لیکن سوچتا ہوں میرے ادبی مستقبل کا اب کیا ہو گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے میز کی دراز میں سے کچھ مسوّدے نکالے اور کہا یہ میری طرف سے نذر ہیں۔ پڑھتے جاتے تھے حیران ہوتے جاتے تھے۔ فرمایا۔ "بالکل یہی جذبات میرے دل میں آتے تھے لیکن ان کو قلم بند نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے اس خوبصورتی سے نالے کو پابندِ نَے کیا ہے کہ مجھے اپنا ہی کلام معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا "برادر عزیز! بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ تم پر جیل میں جو گزرتی تھی، اسے میں یہاں بیٹھے بیٹھے محسوس کر لیتا تھا۔ ورنہ نم آنم کہ من دانم۔ بہر حال اب اس کلام کو اپنا ہی سمجھو۔ بلکہ اس میں مَیں نے تخلص بھی تمہارا ہی باندھا ہے۔ اور ہاں نام بھی میں تجویز کیے دیتا ہوں۔ آدھے کلام کو دستِ صبا کے نام سے شائع کرو۔ اور آدھے کو "زنداں نامہ" کا نام دو۔ اس پر بھی ان کو تامّل رہا۔ بولے۔ یہ بُرا سا لگتا ہے کہ ایسا کلام جس پر ایک محبِ صادق نے اپنا خونِ جگر ٹپکایا ہو اپنے نام سے منسوب کر دوں۔ میں نے کہا۔ "فیض میاں! دنیا میں چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ شیکسپئر بھی تو کسی سے لکھوایا کرتا تھا۔ اس سے اس کی عظمت میں کیا فرق آیا؟" اس پر لا جواب ہو گئے اور رقت طاری ہو گئی۔

فیضؔ صاحب میں ایک اور بات میں نے دیکھی۔ وہ بڑے ظرف کے آدمی ہیں۔

ایک طرف تو انھوں نے کسی پر بھی یہ راز افشانہ کیا کہ یہ مجموعے ان کا نتیجۂ فکر نہیں۔ دوسری طرف جب لینن انعام لے کر آئے تو تمغہ اور آدھے روبل میرے سامنے ڈھیر کر دیے کہ اس کے اصل حق دار آپ ہیں۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں۔ بیان کرنے لگوں تو کتاب ہو جائے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا نمود و نمائش سے اس بندے کی طبیعت ہمیشہ نفور رہی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

جنتری نئے سال کی

؏ آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج۔ یعنی بلبل بولتا تھا یا بولتی تھی تو لوگ جان لیتے تھے کہ بہار آئی ہے۔ ہم نئے سال کی آمد کی فال جنتریوں سے لیتے ہیں۔ ابھی سال کا آغاز دور ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مشہورِ عالم، مفیدِ عام جنتریاں دکانوں پر آن موجود ہوتی ہیں۔ بعض لوگ جنتری نہیں خریدتے۔ خدا جانے سال کیسے گزارتے ہیں۔ اپنی قسمت کا حال، اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنا ستارہ (چاند سورج وغیرہ بھی) کیسے معلوم کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جنتری اپنی ذات سے ایک قاموس ہوتی ہے۔ ایک جنتری خرید لو اور دنیا بھر کی کتابوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ فہرست تعطیلات اس میں، نماز عید اور نماز جنازہ پڑھنے کی تراکیب، جانوروں کی بولیاں، دائمی کیلنڈر، محبت کے

تعویذ، انبیائے کرام کی عمریں، اولیائے کرام کی کراماتیں، لکڑی کی پیمائش کے طریقے، کون سا دن کِس کام کے لئے موزوں ہے۔ فہرست عرس ہائے بزرگانِ دین، صابن سازی کے گُر، شیخ سعدی کے اقوال، چینی کے برتن توڑنے اور شیشے کے برتن جوڑنے کے نسخے، اعضا پھڑکنے کے نتائج، کرۂ ارض کی آبادی، تاریخ وفات نکالنے کے طریقے۔ یہ محض چند مضامین کا حال ہے۔ کوزے میں دریا بند ہوتا ہے اور دریا میں کوزہ، یوں تو سبھی جنتریاں مفید مضامین کی پوٹ ہوتی ہیں، ہر ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ لیکن روشن ضمیر جنتری (جیبی) کو خاص شہرت حاصل ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اسی کا تازہ ترین ایڈیشن ہے۔ ایک باب اس میں ہے۔ ''کون سادِن کون سے کام کے لیے موزوں ہے۔''

ہفتہ: سفر کرنے، بچّوں کو اسکول میں داخل کرانے کے لیے۔

اتوار: شادی کرنے، افسروں سے ملاقات کرنے کے لیے۔

بدھ: نیالباس پہننے، غسلِ صحت کے لیے۔

جمعرات: حجامت بنانے، دعوتِ احباب کے لیے۔

جمعہ : غسل اور شادی وغیرہ کرنے کے لیے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ اندھا دھند جس دِن جو کام چاہیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جنتری سب کے پاس ہو تو زندگی میں انضباط آ جائے۔ ہفتے کا دن آیا اور سبھی لوگ سوٹ کیس اٹھا کر سفر پر نکل گئے۔ جو نہ جا سکے وہ بچّوں کو اسکول میں داخل کرانے پہنچ گئے۔ اس سے غرض نہیں کہ اسکول کھلتے ہیں یا نہیں یا کسی کے بچّے ہیں بھی کہ نہیں۔ جدھر دیکھو بھیڑ لگی ہے۔ اتوار کو ہر گھر کے سامنے چھولداریاں تنی ہیں اور ڈھولک بج رہی ہے۔ لوگ سہرے باندھنے کے بعد جنتری ہاتھ میں لیے افسروں سے ملاقات کرنے چلے جا رہے ہیں۔ بدھ کو سبھی حماموں میں پہنچ گئے۔ اور جمعرات کو لوگوں نے حجامت بنوائی اور دوستوں کے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں کہ ہمارے ہاں اگر دعوت کھا جائیو۔ جمعہ کو نکاحِ ثانی کا نمبر ہے۔ جو لوگ اس منزل سے گزر چکے ہوں وہ دِن بھر نل کے نیچے بیٹھ کر نہائیں کہ ستاروں کا حکم یہی ہے۔

ہم جو خواب دیکھتے ہیں وہ بالعموم عام قسم کے ہوتے ہیں اور صبح تک یاد بھی نہیں رہتے۔ جنتری سے معلوم ہوا کہ خوابوں میں بھی بڑے تنوّع کی گنجائش ہے۔ خواب میں پھانسی پانے کا مطلب ہے بُلند مرتبہ حاصل ہونا۔ افسوس کہ ہم نے خواب تو کیا اصل زندگی میں بھی کبھی پھانسی نہ پائی۔ بلند مرتبہ مل سکنے کی اصل وجہ

اب معلوم ہوئی۔ من کردم شما حذر بکنید اسی طرح گھوڑا دیکھنے کا مطلب ہے دولت حاصل کرنا۔ قیاس کہتا ہے کہ مطلب وکٹوریہ کے گھوڑے سے نہیں ریس کے گھوڑے سے ہے۔ خچر دیکھنے سے مراد ہے سفر نہیں آنا۔ جو لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں ان کو ہوائی جہاز دیکھنا چاہیے۔ بلّی کا پنجہ مارنا بیماری کے آنے کی علامت ہے۔ سانپ کا گوشت کھانا دشمن کا مال حاصل ہونے کی، خواب میں کان میں چیونٹی گھس آئے تو سمجھئے موت قریب ہے۔ (خواب کے علاوہ گھس آئے تو چنداں حرج نہیں، سرسوں کا تیل ڈالیے سے نکل آئے گی) اپنے سر کو گدھے کا سر دیکھنے کا مطلب ہے عقل کا جاتے رہنا۔ یہ تعبیر ہم خود بھی سوچ سکتے تھے۔ کوئی آدمی اپنے سر کو گدھے کا سر (خواب میں بھی) دیکھے گا، اس کے متعلق اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ خواب میں مُردے سے مصافحہ کرنے کی تعبیر ہے درازیٔ عمر۔ خدا جانے یہاں عمرِ فانی سے مراد ہے یا عمرِ جاودانی سے۔

ایک باب اس میں جسم کے اعضا کے پھڑکنے اور ان کے عواقب کے بارے میں بھی ہے۔ آنکھ پھڑکنا تو ایک عام بات ہے۔ رخسار، شانہ راست، گوشِ چپ، انگشت چہارم، زبان، گلا، گردن بجانب چپ، ٹھوڑی، بغل راست وغیرہ ان پچاسی اعضا میں سے ہیں جن کے پھڑکنے پر نظر رکھنی چاہیے۔ ان میں سے بعض کے نتائج

ایسے ہیں کہ ہم نقل کر دیں تو فحاشی کی زد میں آ جائیں۔ ایک دو امور البتّہ فاضل مرتبین نظر انداز کر گئے مگر انتخاب کی پسلی پھڑک اٹھنا اُستادوں کے کلام میں آیا ہے۔ اس کا نتیجہ نہیں دیا گیا۔ ہماری رگِ حمیت بھی کبھی کبھی پھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے عواقب کی طرف بھی یہ جنتری رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ نقائص رفع ہونے چاہئیں۔

یہ معلومات تو شاید کہیں اور بھی مل جائیں لیکن اس جنتری کا مغز محبّت کے عملیات اور تعویذات ہیں جو حکیمی تاثیر رکھتے ہیں۔ قیس میاں کی نظر سے ایسی کوئی جنتری گزری ہوتی تو جنگلوں میں مارے مارے نہ پھرتے۔ ایک نسخہ حاضر ہے۔

"محبّت کے مارے کو چاہیے کہ ۱۲ مارچ کو بوقت ایک گھڑی بعد طلوع آفتاب مشرق کی طرف منہ کرکے نقش ذیل کو نام مطلوب بمعہ والدۂ مطلوب اُلّو کے خون سے لکھ کر اپنے داہنے بازو پر باندھے اور مطلوب کو ۲۰ مارچ بوقت صبح ایک گھڑی ۴۵ پل پر بعد طلوع آفتاب اپنا سایہ دے۔ مطلوب فوراً مشتاق ہو جائے گا۔

+ + ۹۱،۱۱م،وم۱۰اع۱۱ع۱۱ + +

نام مطلوب مع والدہ مطلوب، اپنا نام مع نام والدہ

یہاں بعض باتیں جی میں آتی ہیں۔ اگر مطلوب یا محبوب بات نہیں کرتا تو اس کی والدہ اور دیگر رشتہ داروں کے نام کیسے معلوم کیے جائیں؟ پھر اُلّو کیسے پکڑا جائے اور ۲۰ مارچ کو بوقت صبح عین ایک گھڑی ۴۵ پل بعد طلوع آفتاب مطلوب کو کیسے مجبور کیا جائے کہ طالب کے سائے میں آئے۔ ان باتوں کا اس جنتری میں کوئی ذکر نہیں۔ہاں جنتری کے پبلشر نے جنتر منتر مکمّل نامی جو کتاب قیمت چھ روپے شائع کی ہے اس میں ان کی تفصیل ملے گی۔

جو لوگ ہماری طرح تن آسان ہیں محبّت میں اتنا کشٹ نہیں اُٹھا سکتے ان کے لئے مرتّب جنتری نے کچھ آسان تر عمل بھی دیئے ہیں جن کی بدولت محبوب قدموں پر تو آکر خیر نہیں گرتا لیکن مائل ضرور ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تعویذ ہے جسے ہر روز کاغذ کے چالیس ٹکڑوں پر لکھ کر اور نیچے طالب و مطلوب کے نام درج کر کے آٹے کی گولیوں میں لپیٹ کر دریا میں ڈالنا چاہیے۔ اور چالیس دن تک ہی کرنا چاہیے۔ ہم نے حساب لگایا ہے۔ از راہِ کفایت آدھے تولے کی گولی بھی بنائی جائے تو ایک پاؤ روزانہ یعنی دس سیر آٹے میں محبوب کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ جو حضرت اس میں بھی خست کریں اور اپنی محبّت کو بالکل پاک رکھنا چاہیں وہ ایک اور عمل کی

طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کرو "جب بھی محبوب سامنے آئے آہستہ سے دل میں بسم اللہ، الصمد دس بار پڑھیں اور آخر میں محبوب کی طرف منہ کر کے پھونک ماریں۔ اس طرح کہ منہ کی ہوا اس کے کپڑوں کو چھُو سکے۔ پندرہ بیس مرتبہ ایسا کرنے سے اس کے دل میں قرار واقعی محبت پیدا ہو جائے گی۔"

یہ عمل بظاہر تو آسان معلوم ہوتا ہے لیکن عمل ایسا آسان بھی نہیں۔ اوّل تو محبوب کو اتنی دیر سامنے کھڑا رہنے پر مجبور کرنا کہ آپ دس بار عمل پڑھ کر پھونکیں مار سکیں اور وہ بھاگے نہیں اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے۔ پھر آپ جو پھونکیں ماریں گے اس کی بنا پر محبوب کیا رائے قائم کرے گا اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ شوقین مزاج ان دونوں سے قطع نظر کر کے محبت کا سرمہ استعمال کر سکتے ہیں جس کا بنانا تھوڑی محنت تو ضرور لے گا لیکن اس کا جادو بھی عالمگیر ہے۔ یعنی صرف محبوب ہی پر کاری اثر نہیں کرتا بلکہ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ یہ سرمہ ڈال کر "جس کی طرف بھی صبح سویرے دیکھے وہی محبت میں مبتلا ہو جائے گا۔"

یہ سرمہ بنانے کے لئے حاجت مند کو ۱۹ فروری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس روزہ وہ بوقت طلوع آفتاب پرانی داتن کو جلا کر اس کی راکھ میں چمگاڈر کا خون ملائے اور اس سے یہ نقش بوقت صبح ایک گھڑی ۱۵ پل بعد طلوع آفتاب لکھے اور اس پر سورہ فلق

گیارہ سو بار پڑھے۔ پھر نئے چراغ میں روغن کنجد (تِل کا تیل) ڈال کر جلائے اور اس کی سیاہی آنکھوں میں ڈالے، حسبِ ہدایت ایک صاحب نے یہ سرمہ دنبالہ دار لگایا تھا۔ اتنا ہم نے بھی دیکھا کہ محبوب انہیں دیکھتے ہی ہنس دیا۔ آگے کا حال نہیں معلوم نہیں۔

یہی نہیں، صابن اور تیل تیار کرنے، بوٹ پالش بنانے، کھٹمل اور مچھر مارنے اور مشہور عام ادویہ کی نقلیں تیار کرنے کی ترکیبیں بھی اس میں درج ہیں۔ لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ اُردُو میں کوئی انسائیکلوپیڈیا نہیں، معلومات کی کتاب نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا کیا ہوتی ہے۔ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔ ہم نے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا وغیرہ دیکھی ہیں۔ الم غَلّم مضامین کا طومار ہے۔ اہلِ دل کے مطلب کی ایک بات بھی نہیں۔ نہ نسخے۔ نہ تعویذ۔ نہ عُرسوں کی تاریخیں نہ محبّت کے عملیات، نہ خواب نہ خوابوں کی تعبیریں۔ ہمارا یہ دستور ہو گیا ہے کہ باہر کی چیز کو ہمیشہ اچھا جانیں گے۔ اپنے ہاں کے سونے کو بھی مٹی گردانیں گے۔

نجات کا طالب، غالبؔ

(چند خطوط)

(۱)

”لو مرزا تفتہ ایک بات لطیفے کی سنو۔ کل ہر کارہ آیا تو تمہارے خط کے ساتھ ایک خط کراچی بندر سے منشی فیض احمد فیض کا بھی لایا جس میں لکھا ہے کہ ہم تمہاری صد سالہ برسی مناتے ہیں۔ جلسہ ہو گا جس میں تمہاری شاعری پر لوگ مضمون پڑھیں گے۔ بحث کریں گے۔ تمہاری زندگی پر کتابیں چھپیں گی۔ ایک مشاعرہ بھی کرنے کا

ارادہ ہے۔ تم بھی آؤ اور خرچہ آمد و رفت کا پاؤ۔ دن کی روٹی اور رات کی شراب بھی ملے گی۔ بہت خیال دوڑایا سمجھ میں نہ آیا کہ یہ صاحب کون ہیں۔ ان سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اگر شاعر ہیں تو کس کے شاگرد ہیں۔ بارے منشی ہیرا سنگھ آئے اور دریافت ہوا کہ اِدھر لاہور اور ملتان کی عمل داری میں ان کا نام مشہور ہے۔ متوطن سیالکوٹ کے ہیں کہ لاہور سے آگے ایک بستی ہے جہاں کھیلوں کا سامان اور شاعر اچھے بنتے ہیں۔ ایسے کہ نہ صرف ملک کے اندر ان کی مانگ ہے بلکہ دساور کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ان میاں فیض کے متعلق بھی منشی ہیرا سنگھ نے بتایا کہ اکثر یہاں سے دساور بھیجے جاتے ہیں۔ وہاں سے واپس کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ پھر بھیجے جاتے ہیں۔ اِدھر جو ماورائے قفقاز روس کی سلطنت ہے وہاں کا والی ان کی بہت قدر کرتا ہے۔ اپنے ہاں بلاتا ہے۔ خلعت دیتا ہے اور پچھلے دِنوں ان کی شاعری سے خوش ہو کر تمغہ اور انعام صد ہزاری بھی بخشا ہے کہ لینن انعام کہلاتا ہے اور کسی کسی کو ملتا ہے۔ یہ قصیدہ اچھا ہی کہتے ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ دلی کا قلعہ آباد تھا تو بادشاہ کا قصیدہ اور جوان بخت کا سہرا ہم نے بھی لکھا تھا۔ غفرانِ مآب نواب رام پور کی مدح میں بھی اکثر اشعار لکھے اور ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ کہہ کر بھی لیفٹیننٹ گورنر کے توسط سے گزارا لیکن کبھی اپنی یافت نہ ہوئی کہ ساہوکار کا

قرضہ چکتا کرتے۔ اتنی سرکاریں دیکھیں۔ آمدنی اب بھی وہی ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے۔ فتوح کا اعتبار نہیں۔ آئے آئے نہ آئے نہ آئے۔ منشی ہیرا سنگھ نے یہ بھی بتایا کہ یہ فیض احمد فیض انگریزی دان ہیں۔ پھر بھی آدمی نیک اور شستہ ذوق کے ہیں۔ کسی مدرسے میں لڑکے پڑھاتے ہیں۔ لڑکے پڑھانے والوں کے متعلق میری رائے اچھی نہیں۔ وہ مرد مجہول منشی امین الدّین قاطع قاطع والا بھی توپٹیالے میں راجا کے مدرسے میں مدرس تھا لیکن خیر یہ آدمی اچھے ہی ہوں گے۔ خط تو بڑی محبّت اور ارادت کا لکھّا ہے۔ شروع خط میں چھاپے کے حرفوں میں ادارہ یادگارِ غالب بھی مرسوم ہے۔

اچھا ایک بات کل کے خط میں لکھنا بھول گیا تھا۔ منشی شیو نرائن سے کہو کہ دیوان کا چھاپا روک دیں کہ ایک سوداگر کتابوں کا بلادِ پنجاب سے آیا ہوا ہے۔ شیو نرائن سے ہماری شرط تھی کہ وہ چاہے تو پچاس نسخے احباب میں تقسیم کرنے اور صاحبانِ عالیشان کی نذر گزارنے کے لیے بایں تہی دستی و بے زری اس سے قیمتاً لیں گے تاکہ اس پر بار نہ پڑے۔ لیکن یہ شخص اس شرط پر چھاپنے کو آمادہ ہے کہ ہمیں کچھ نہیں دینا پڑے گا۔ بلکہ وہ پانچ نسخے حقِ تصنیف میں ہم کو دے گا۔ جب کہ شیو نرائن اور دوسرے مطبع والے ایک نسخہ دیتے تھے۔ بہت اخلاق کا آدمی معلوم ہوتا

ہے۔ آتے ہوئے دو شیشے شراب انگریزی کے بھی لایا تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ ہاں تو وہ صدی والی بات رہی جاتی ہے۔ اسی سے دیکھ لو کہ عناصر میں اعتدال کی کیا حالت ہے۔ سوچتا ہوں، جاؤں کہ نہ جاؤں؟ ہُنڈی بھیج دیتے تو کوئی بات بھی تھی۔ بعد میں یہ لوگ کرایہ آمد و رفت بھی دیں یا نہ دیں۔ نہیں بابا۔ نہیں جاتا۔ میں نہیں جاتا۔

نجات کا طالب

غالبؔ

(۲)

سعادت و اقبال نشاں مرزا علاؤ الدّین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دُعا پہنچے۔ لو صاحب یہ تمہارا پوتا، فرخ مرزا کا بیٹا مرزا جمیل الدّین عالی انعام اور جاگیریں بانٹنے لگا۔ یہ حال اکمل الاخبار سے کھلا۔ تم نے تو نہ بتایا۔ لوہارو سے میر اشرف علی آئے تو یہ بھی پتہ چلا کہ یہ عزیز لوہارو چھوڑ ادھر کہیں سندھ میں جانوکر ہوا۔ پہلے سرکار عالی کی پیشی میں تھا۔ اب کسی ساہو کار سے کے کارخانے میں منصرم ہے۔ اتنی دور کیوں

جانے دیا۔ افواہوں اور رئیسوں کے لڑکے سیٹھوں ساہوکاروں کے متصدی ہوئے۔ ہاں صاحب شاہی لد گئی تو کچھ بھی نہ رہا۔ عالیؔ شاید تخلص ہے۔ شعر کہتا ہو گا۔ اللہ ترقی دے۔ کس سے اصلاح لیتا ہے؟

ہاں تو وہ انعام جاگیر والی بات۔ اکمل الاخبار والے مضمون میں تھا کہ سال بھر میں جو دیوان یا قصّے کہانیاں وغیرہ از قسم داستان امیر حمزہ چھپتے ہیں اسی عزیز کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ یہ ان کو جانچتا ہے اور جو کلام یا تصنیف پسندیدہ ٹھہرے اس پر انعام دیتا ہے۔ کسی کو پانچ ہزار، کسی کو دس ہزار، کسی کو کم بھی۔ ہزار دو ہزار بھی۔ یہ جو میرا اُردُو کا کلام کانپور میں چھپا ہوا ہے مطبع والے نے بااُمّید انعام بھجوایا تھا۔ وہ تو مصر تھا کہ اس کے ساتھ ایک قصیدہ بھی خوشخط لکھوا کر طلائی جدول کے ساتھ بھیجا جائے لیکن میں نے اسے ضروری نہ جانا کہ تعلقات میرے تم لوگوں سے عزیز داری کے کسی سے مخفی نہیں۔ میں تو اس کے بعد ہنڈوی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُلٹا مطبع والوں کے نام لفافہ آیا کہ یہ فارم بھر کے بھیجو۔ چھ جلدیں داخل کرو اور پھر مصنّفوں کی کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مرزا جمیل الدّین عالی فقط انعام کی رقوم کا امانت دار ہے۔ فیصلے کا کچھ اور صاحبانِ علم کی رائے پر انحصار ہے۔ مطبع والے نے ان لوگوں کے نام دریافت کیے۔ اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔ اب اکمل

الاخبار کہتا ہے کہ ایک انعام سراج الدّین ظفر کو ملا۔ میں سمجھا شاہ نے رنگون میں کلام چھپوا کر بھیجا ہو گا لیکن بات جی لگتی نہیں تھی کہ وہ سرکار تو انعام دینے والی تھی۔ اب وضاحت ہوئی کہ یہ اور صاحب ان کے ہم نام ہیں لیکن شاعر اچھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ ایک اور صاحب نے انعام پایا لیکن خوش ہو کر لوٹا دیا کہ مجھے ضرورت نہیں۔ اللہ اللہ کیسے مستغنی لوگ ہیں۔ پورے ایک ہزار کا انعام تھا۔

صاحب میں دوبارہ لکھتا ہوں کہ اب وہ زمانہ نہیں کہ اِدھر منوہر اداس سے قرض لیا۔ اُدھر درباری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ، چاٹو، پھر کبھی خان نے کچھ دے دیا کبھی الور سے کچھ دلا دیا۔ میر امختار کار بنیا سود ماہ بماہ چاہے۔ گویا سود جدا۔ مول جدا۔۔۔ چوکیدار جدا۔ بی بی جدا۔ بچے جدا۔ شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی کہ تھی۔ اب کے جو یہ بنیا پنشن کے مجتمع دو ہزار لایا۔ اس نے اپنے پاس رکھ لیے کہ پہلے میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سو روپے اس کے ہوتے۔ قرض متفرق گیارہ سو روپے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو روپے یعنی دو ہزار مل کر بھی چھ سو روپے گھاٹا۔ یہ جو ایک ہزار روپے ان شاعر مستغنی الاحوال نے اپنے مقام سے فروتر پا کر لوٹا دیئے ہیں غالب غریب کو مل جاتے تو کم از کم اب تک کا قرض صاف ہو جاتا۔ شاعری سے بس یہی تو یافت تھی کہ

قصیدہ لکھا، انعام پایا۔ اب وہ سرکاریں نہ رہیں۔ کتاب چھپواؤ تو مطبع والا مشکل سے راضی ہوتا ہے۔ کہتا ہے اتنی جلدیں خریدو۔ اپنے دوستوں کے پاس بکواؤ۔ تب ہاتھ لگاتا ہوں۔ یہ تصانیف پر انعام و کرام والا قصّہ نیا ہے۔ اگر تم اس عزیز کو دو حرف لکھ دو تو بڑی بات ہو۔ اس بات کا میں بُرا نہیں مانتا کہ کلام ان کو یا ان کی بیٹی کو پسند نہیں آیا۔ مروّت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کسی اور سے نہ کہتا۔ تم سے واجب جان کر کہہ دیا کہ اتنا خیال کرتے ہو۔ محبت کا دم بھرتے ہو۔

راقم

غالبؔ

(۳)

"اہاہا۔ میرا پیارا میر مہدی آیا۔ غزلوں کا پشتارہ لایا۔ ارے میاں بیٹھو۔ شعر و شاعری کا کیا ذکر ہے۔ یہاں تو مکان کی فکر ہے۔ یہ مکان چار روپے مہینے کا ہر چند کہ ڈھب کا نہ تھا لیکن اچھا تھا۔ شریفوں کا محلّہ ہے۔ پہلے مالک نے بیچ دیا۔ نیا مالک اسے خالی کرانا چاہتا ہے۔ مدد لگا دی ہے۔ پاڑ باندھ دی ہے۔ اسی دو گز چوڑے صحن میں

رات کو سوتا ہوں۔ پاڑ کیا ہے۔ پھانسی کی ٹکٹکی نظر آتی ہے۔ منشی حبیب اللہ ذکا نے ایک کوٹھی کا پتہ دیا تھا جو شہر سے باہر ہے۔ سوار ہوا۔ گیا۔ مکان تو پُر فضا تھا۔ احاطہ بھی چمن اور گُل بوٹے بھی لیکن حویلی اور محل سرا الگ الگ نہ تھے۔ ڈیوڑھی بھی نہ تھی۔ بس ایک پھاٹک تھا۔ کمرے اور کوٹھڑیاں خاصی۔ کمروں کے ساتھ کولکیوں میں چینی مٹّی کے چولھے سے بھی بنے تھے۔ معلوم ہوا بیت الخلا ہیں۔ صاحبانِ انگریز ان پر چڑھ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک زنجیر کھینچتے ہی پانی کا تریڑا آتا ہے۔ سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ عجیب کارخانہ ہے۔ میں نے کرایہ پوچھا اور جھٹ کہا پانچ روپے منظور ایک روپیہ زائد کی کچھ ایسی بات نہیں لیکن مالک مکان کا کارندہ ہنسا اور بولا۔ پانچ روپے نہیں مرزا صاحب! پانچ سو روپے۔ میں نے کہا۔ خریدنا منظور نہیں۔ کرائے پر لینا ہے۔ وہ مردک سر ہلا کر کہنے لگا۔ پانچ سو روپے کرایہ ہے اور دو سال کا پیشگی چاہیے۔ یعنی بارہ ہزار دو اور آن اترو۔ یہاں چِتلی قبر کے پاس دھنا سیٹھ نے حویلی ڈھا کر اونچا اونچا ایک مکان بنایا ہے۔ دو دو تین تین کمرے کے حصّے ہیں۔ کلیان کو بھیجا تھا۔ خبر لایا کہ وہ پگڑی مانگتے ہیں۔ میں حیران ہوا۔ تمھیں معلوم ہے میں پگڑی عمامہ کچھ نہیں باندھتا۔ ٹوپی ہے ورنہ ننگے سر لوہارو والوں کے ہاں سے جو پگڑی پار سال ملی تھی وہ نکلوا کے بھجوا دی کہ دیکھ لیں اور اطمینان کر لیں کہ مکان ایک مرد

معزّز کو مطلوب ہے۔ وہ اُلٹے پاؤں آیا کہ یہ دستار نہیں چاہیے رقم مانگتے ہیں۔ دس ہزار کرایہ اس کے علاوہ ساٹھ روپے مہینہ۔ بڑے بد معاملہ لوگ ہیں۔ آخر پگڑی پھر صندوق میں رکھوادی۔ یہ مالک مکان کل آتا ہے۔ دیکھیے کیا کہتا ہے۔

میرن صاحب آئیں۔ شوق سے آئیں۔ لیکن یہ گانے بجانے والوں میں نوکری کا خیال ہمیں پسند نہیں۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ ایک کوٹھی میں مشینیں لگا کر اس کے سامنے لوگ گانے ناچتے ہیں، شعر پڑھتے ہیں۔ تقریریں کرتے ہیں۔ لوگ، اپنے گھروں میں ایک ڈبّا سامنے رکھ کر سن لیتے ہیں۔ بلکہ اب تو اور ترقّی ہوئی ہے۔ ایک نیا ڈبّہ انگریز کاریگروں نے نکالا ہے۔ اس میں ایک گھنڈی ہے۔ اسے مروڑنے پر سُننے کے علاوہ ان اربابِ نشاط کی شکلیں بھی گھر بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔ ایک خط ان میں سے ایک جگہ سے میرے پاس بھی آیا تھا۔ آدمی تو یہیں کے ہیں لیکن انگریزی میں لکھتے ہیں۔ بہت دنوں رکھا رہا۔ آخر ایک انگریزی خواں سے پڑھوایا۔ مشاعرے کا دعوت نامہ تھا۔ کچھ حق الخدمت کا بھی ذکر تھا۔ میں تو گیا نہیں۔ دوبارہ انھوں نے یاد کیا نہیں۔ چونکہ پیسے دیتے ہیں، سرکاروں درباروں کی جگہ ان لوگوں نے لے لی ہے۔ جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ میرن صاحب مجھے جان سے عزیز لیکن ان لوگوں سے سفارش کیا کہہ کر کروں کہ سیّد زادہ ہے؟ اُردو

فارسی کا ذوق رکھتا ہے؟ اسے نوکر رکھو۔ اچھا رکھ بھی لیا تو کاپی نویسوں میں رکھیں گے۔ میر مہدی یہ وہ زمانہ نہیں۔ اب تو انگریزی کی تو پوچھ ہے یا پھر سفارش چاہیے۔

خط لکھ لیا۔ اب محل سرا میں جاؤں گا۔ ایک روٹی شوربے کے ساتھ کھاؤں گا۔ شہر کا عجب حال ہے۔ باہر نکلنا محال ہے۔ ابھی ہرکارہ آیا تھا۔ خبر لایا کہ ہڑتال ہو رہی ہے۔ ہاٹ، بازار سب بند۔ لڑکے جلوس نکال رہے ہیں۔ نعرے لگا رہے ہیں۔ کبھی کبھی لڑکوں اور برقندازوں میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔ میر مہدی معلوم نہیں اس شہر میں کیا ہونے والا ہے۔ میرن کو وہیں روک لو۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدّین کو دعا۔

نجات کا طالب

غالبؔ

(۴)

منشی صاحب میاں داد خاں سیّاح یہ خط نواب میر غلام بابا خان کے توسط سے بھیج رہا ہوں کہ تمہارا تحقیق نہیں اس وقت کہاں ہو۔ اشرف الاخبار تمہارے نام بھجوایا تھا۔ وہ واپس آ گیا کہ مکتوب الیہ شہر میں موجود نہیں۔ اس اخبار کے مہتمم صاحب کل آئے تو کچھ اخبار بلادِ دیگر کے دے گئے کہ مرزا صاحب انہیں پڑھیے اور ہو سکے تو رنگ ان لوگوں کی تحریر کا اختیار کیجئے کہ آج کل اسی کی مانگ ہے۔ یہ اخبار لاہور اور کراچی بندر کے ہیں۔ کچھ سمجھ میں آئے کچھ نہیں آئے۔ آدھے آدھے صفحے تو تصویروں کے ہیں۔ دو دو رنگ کی چھپائی، موٹی موٹی سرخیاں، افرنگ کی خبریں، اگر بہت جلدی بھی آئیں تو مہینہ سوا مہینہ تو لگتا ہی ہے لیکن یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں کہ آج واردات ہوئی اور آج ہی اطّلاع مل گئی۔ گویا لوگوں کو پرچاتے ہیں۔ بے پر کی اُڑاتے ہیں۔ پھر ایک ہی اخبار میں کشیدہ کاری کے نمونے ہیں، ہنڈیا بھوننے کے نسخے ہیں، کھیل تماشوں کے اشتہار ہیں۔ ایک لمبا چوڑا مضمون دیکھا۔

''اداکارہ دیبا کے چلغوزے کس نے چُرائے'' سارا پڑھ گیا یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہوئی۔ کسی کی جیب سے کسی نے چلغوزے نکال لیے۔ تو یہ کون سی خبر ہے۔ خیر

یہ سب سہی لطیفے کی بات اب کہتا ہوں۔ کراچی کے ایک اخبار میں میرے تین خط چھپے ہیں۔ ایک منشی ہر گوپال تفتہ کے نام ہے ایک میں نواب علائی سے تخاطب اور ایک میر مہدی مجروح کے نام۔ میں حیران کہ ان لوگوں نے میرے خطوط اخبار والوں کو کیوں بھیجے۔ اب پڑھتا ہوں تو مضمون بھی اجنبی لگتا ہے۔ اب کے جو شراب انگریزی سوداگر سے گیا ہے کچھ تیز ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی کیفیّت اک گونہ بے خودی سے آگے کی ہو جاتی ہے۔ یا تو میں نے اس عالم میں لکھے اور کلیاں اُٹھا کر ڈاک میں ڈال آیا۔ یا پھر کسی نے میری طرف سے گھڑے ہیں اور اندازِ تحریر اُڑانے کی کوشش کی ہے۔ کونے میں کسی کا نام بھی لکھا ہے۔ "ابن انشا۔" کچھ عجب نہیں یہی صاحب اس شرارت کے بانی مبانی ہوں۔ نام سے عرب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کیا حرکت ہے۔ سراسر دخل در معقولات ہے۔ اخبار نویسی میں ٹھٹھول کیا معنی؟ بھئی مجھے بات پسند نہیں آئی۔

امید ہے وہ ٹوپیاں تم نے نواب صاحب کو پہنچا دی ہوں گی۔ نواب صاحب سے میرا بہت بہت سلام اور اشتیاق کہنا۔ میں سادات کا نیاز مند اور علی کا غلام ہوں۔

نجات کا طالب

ناول مینو فیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

پاکستان ناول مینو فیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ ہونہار مصنّفین اور یکّہ تاز ناشرین کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کا مسرت سے اعلان کرتی ہے۔ کارخانہ ہذا میں ناول جدید ترین آٹو میٹک مشینوں پر تیّار کیے جاتے ہیں اور تیّاری کے دوران انہیں ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔ ناول اسلامی ہو یا جاسوسی، تاریخی یا رومانی مال عمدہ اور خالص لگایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ ناول مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ پڑھنے کے علاوہ بھی یہ کئی کام آتے ہیں۔ بچّہ رو رہا ہو۔ ضد کر رہا ہو۔ دو ضربوں میں راہِ راست پر آ جائے گا۔ بلّی نے دودھ میں یا کتّے نے نعمت خانہ میں منہ ڈال دیا ہو۔ دور ہی سے تاک کے مار دیجیے پھر ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ بیٹھنے کی چوکی اور گھڑے کی گھڑونچی کے طور

پر استعمال ہونے کے علاوہ یہ چوروں ڈاکوؤں کے مقابلے میں ڈھال کا کام بھی دیتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس کے مطالعے سے دل میں شجاعت کے جذبات خواہ مخواہ موجزن ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اپنی ضخامت اور پٹھے کی نوکیلی جلد کے باعث۔۔۔ خواتین کے لیے ہمارے ہاں واش اینڈ ویئر (Wash & Wear) ناول بھی موجود ہیں تاکہ ہیروئن کا نام بدل کر پلاٹ کو بار بار استعمال کیا جا سکے۔ ایک ہی پلاٹ برسوں چلتا ہے۔ پندرہ بیس ناولوں کے لئے کافی رہتا ہے۔

واش اینڈ ویئر کوالٹی ہمارے اسلامی تاریخی ناولوں میں بھی دستیاب ہے۔ آرڈر کے ساتھ اس امر سے مطلع کرنا ضروری ہے کہ کون سی قسم مطلوب ہے۔ ۶۵٪ رومان اور ۳۵٪ تاریخ والی یا ۶۵٪ تاریخ اور ۳۵٪ رومان والی۔ اجزائے ترکیبی عام طور پر حسب ذیل ہوں گے:

۱۔ ہیروئن کافر دوشیزہ۔ تیر تفنگ، بنوٹ پٹے اور بھیس بدلنے کی ماہر۔ دل ایمان کی روشنی سے منوّر۔ چھُپ چھُپ کر نماز پڑھنے والی۔

۲۔ کافر بادشاہ۔ ہماری ہیروئن کا باپ لیکن نہایت شقی القلب۔ انجام اس کا بُرا ہو گا۔

۳۔ لشکرِ کفار جس کے سارے جرنیل لحیم شحیم اور بزدل۔

۴۔ اہلِ اسلام کا لشکر جس کا ہر سپاہی سوا لاکھ پر بھاری۔ نیکی اور خدا پرستی کا پتلا۔ پابند صَوم و صلوۃ۔ قبول صورت بلکہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے والا۔

۵۔ ہیرو۔ لشکر متذکرہ صدر کا سردار۔ اُس حُسن کی کیا تعریف کریں۔ کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔

٦۔ سبز پوش خواجہ خضر۔ جہاں پلاٹ رُک جائے اور کچھ سمجھ میں نہ آئے وہاں مشکل کُشائی کرنے والا۔

۷۔ ہیرو کا جاں نثار ساتھی۔ نوجوان اور کنوارا تاکہ اس کی شادی بعد ازاں ہیروئن کی وفادار اور محرمِ راز خادمہ یا سہیلی سے ہو سکے۔

۸۔ کافر بادشاہ کا یک چشم وزیر جو شہزادی سے اپنے بیٹے کی بلکہ ممکن ہو تو اپنی شادی رچانے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ چونکہ ادھار محبت کی قینچی ہے لہٰذا ہیروئن کے التفات سے محروم رہتا ہیں۔

پلاٹ تو ہمارے ہاں کئی طرح کے ہیں لیکن ایک اسٹینڈرڈ ماڈل جو عام طور پر مقبول ہے یہ ہے کہ ایک قبیلے کا نوجوان دوسرے قبیلے کی دوشیزہ پر فدا ہوتا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ دوشیزہ لامحالہ طور پر دوسرے قبیلے کے سردار کی چہیتی بیٹی ہوتی ہے۔ پانچ انگلیاں، پانچوں چراغ۔ خوبصورت سلیقہ مند، عالم بے بدل۔ لاکھوں اشعار زبانی یاد۔ کرنا خدا کا کیا ہوتا ہے اس بیچ میں دونوں قبیلوں میں لڑائی ٹھن جاتی ہے۔ ہمارا ہیرو محبّت کو فرض پر قربان کر کے شمشیر اُٹھالیتا ہے اور بہادری کے جوہر دکھاتا کشتوں کے پُشتے لگاتا دشمن کی قید میں چلا جاتا ہے۔ محافظوں کی آنکھ میں دھول جھونک کر طالب و مطلوب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اشعار اور مکالموں کا تبادلہ ہوتا ہے اور ہیروئن بھی پہلے ایک جان سے پھر ہزار جان سے اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ راستے میں ظالم سماج کئی بار آتا ہے لیکن ہر دفعہ منہ کی کھاتا ہے۔ دانت پیستا رہ جاتا ہے۔ آخر میں ناول حق کی فتح، محبت کی جیت، نعرۂ تکبیر، شرعی نکاح، دونوں قبیلوں کے ملاپ اور مصنّف کی طرف سے دعائے خیر کے ساتھ آیندہ ناول کی خوشخبری پر ختم ہوتا ہے۔

آرڈر دیتے وقت مصنّف یا ناشر کو بتانا ہوگا کہ ناول پانچ سو صفحے کا چاہیے؟ ہزار صفحے کا یا پندرہ سو کا؟ وزن کا حساب بھی ہے۔ دو سیری ناول، پانچ سیری ناول، سات سیری

ناول، پندرہ بیس سیری بھی خاص آرڈر پر مل سکتے ہیں۔ گاہک کو یہ بھی بتانا ہو گا کہ اسی پلاٹ کو برقرار رکھتے ہوئے ماحول کس ملک کا رکھا جائے۔ عراق کا؟ عرب کا؟ ایران کا؟ افغانستان کا؟ ہیرو اور ہیروئن کے نام بھی گاہک کی مرضی کے مطابق رکھے جاتے ہیں۔ ایک پلاٹ پر تین یا اس سے زیادہ ناول لینے پر ۳۳٪ رعایت۔

خواتین کے لیے بھی جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، گھریلو اور غیر گھریلو ہر طرح کے ناول بکفایت ہمارے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ ان میں بھی محبت اور خانہ داری کا تناسب بالعموم ۲۵٪ اور ۳۵٪ کا ہوتا ہے۔ فرمائش پر گھٹایا یا بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ خانہ داری سے مطلب ہے ناول کے کرداروں کے کپڑوں کا ذکر، خاندانی حویلی کا نقشہ، بیاہ شادی کی رسموں کا احوال، زیورات کی تفصیلات وغیرہ۔ ہیرو اور ہیروئن کے چچا زاد بھائی بہنیں سہیلیاں اور رقیب وغیرہ بھی مطلوبہ تعداد میں ناول میں ڈلوائے جا سکتے ہیں۔ ہمارے کارخانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ خواتین کے ناول مروّجہ پاکستانی فلموں کو دیکھ کر لکھے جاتے ہیں تاکہ بعد ازاں فلمساز حضرات ان پر مزید فلمیں بنا سکیں۔ معمولی سی مزید اُجرت پر ان ناولوں میں گانے اور دوگانے وغیرہ بھی ڈالے جا سکتے ہیں۔ اس سے مصنّف اور فلمساز کا کام اور آسان ہو جاتا ہے۔ گاہک کو فقط ہیروئن کا نام تجویز کر دینا چاہیے۔ باقی سارا کام ہمارے ذمّے۔

مال کی گھر پر ڈلیوری کا انتظام ہے۔

بازار کے ناول بالعموم ایسے گنجان لکھے اور چھپے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ صفحے میں کم سے کم لفظ رہیں۔ مکالمے اور مکالمہ بولنے والے، دونوں کے لئے الگ الگ سطر استعمال کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

شہزادی سبز پری نے کہا:

"پیارے گلفام"

پیارے گلفام نے کہا:

"ہاں شہزادی گلفام۔ ارشاد"

شہزادی سبز پری:

"ایک بات کہوں؟"

گلفام: "ہاں ہاں کہو۔"

شہزادی:

"مجھے تم سے پیار ہے۔"

گلفام:

"سچ؟"

شہزادی صاحبہ:

"ہاں سچ۔"

گلفام:

"تو پھر شکریہ۔"

شہزادی نے کہا:

"پیار سے گلفام۔ اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ یہ تو میرا انسانی فرض تھا۔"

ایک ضروری اعلان۔ ہمارے کارخانے نے ایک عمدہ آئی لوشن بھی تیار کیا ہے جو

رِقّت پیدا کرنے والے ناولوں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں ایسا سین آئے، رونے کے بعد دو دو قطرے ڈراپر سے آنکھوں میں ڈال لیجئے۔ آنکھیں دُھل جائیں گی۔ نظر تیز ہو جائے گی۔ مسلسل استعمال سے عینک کی عادت بھی چھوٹ جاتی ہے۔ فی شیشی دو روپے۔ تین شیشیوں پر محصول ڈاک معاف۔ آنکھیں پونچھنے کے لیے عمدہ رومال اور دوپٹے بھی ہمارے ہاں سے دستیاب ہیں۔

مکمّل باورچی خانہ جدید

(ایک ریویو)

جناب مطبخ مراد آبادی کی یہ کتاب مستطاب ہمارے پاس بغرض ریویو آتی ہے۔ جو صاحب یہ کتاب لائے وہ نمونہ طعام کے طور پر بگھارے بینگنوں کی ایک پتیلی بھی چھوڑ گئے تھے۔ کتاب بھی اچھی نکلی، بینگن بھی۔ قلّت گنجائش کی وجہ سے آج ہم فقط کتاب پر ریویو دے رہے ہیں۔ بینگنوں پر پھر کبھی سہی۔ اس سلسلے میں ہم اپنے کرم فرماؤں کو ریویو کی یہ شرط یاد دلانا چاہتے ہیں کہ کتاب کی دو جلدیں آنی ضروری ہیں۔ اور سالن کی دو پتیلیاں۔

اس کتاب میں بہت سی باتیں اور ترکیبیں ایسی ہیں کہ ہر گھر میں معلوم رہنی چاہئیں۔ مثلاً یہ کہ سالن میں نمک زیادہ ہو جائے تو کیا کِیا جائے۔ ایک ترکیب تو اس کتاب کے بموجب یہ ہے کہ اس سالن کو پھینک کر دوبارہ نئے سرے سے سالن پکایا جائے۔ دوسری یہ کہ کوئلے ڈال دیجیے۔ چولھے میں نہیں سالن میں۔ بعد ازاں نکال کر کھایئے۔ یہاں تھوڑا سا ابہام ہے۔ یہ وضاحت سے لکھنا چاہیے تھا کہ کوئلے نکال کر سالن کھایا جائے یا سالن نکال کر کوئلے نوشِ جان کیے جائیں۔ ہمارے خیال میں دونوں صورتیں آزماتی جا سکتی ہیں۔ اور پھر جو صورت پسند ہو اختیار کی جا سکتی ہے۔

کھیر پکانے کی ترکیب بھی شامل کتاب ہذا ہے۔ اس کے لئے ایک چرخے، ایک کتّے، ایک ڈھول اور ایک ماچس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نسخہ امیر خسرو کے زمانے سے آزمودہ چلا آتا ہے۔ لیکن اس میں ماچس کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ خدا جانے چرخے کو کیسے جلاتے ہوں گے۔ ٹیڑھی کھیر عام کھیر ہی کی طرح ہوتی ہے۔ فقط اس میں بگلا ڈالنا ہوتا ہے تاکہ حلق میں پھنس سکے۔ اس کتاب میں بعض ترکیبیں ہمیں آسانی کی وجہ سے پسند آئیں۔ مثلاً بادام کا حلوہ یوں بنایا جا سکتا ہے کہ حلوہ لیجیے اور اس میں بادام چھیل کر ملا دیجیے۔ بادام کا حلوہ تیار ہے۔ بینگن کا اچار ڈالنے کی ترکیب یہ لکھی ہے

کہ بینگن لیجیے۔ اور بطریقہ معروف اچار ڈال لیجیے۔

چند اور اقتباسات ملاحظہ ہوں:

آلو چھیلنے کی ترکیب

سامان: آلو۔ چھُری۔ پلیٹ، ناول۔ ڈیٹول، پٹی۔

آلو لیجیے۔ اسے چھُری سے چھیلیے۔ جن صاحبوں کو گھاس چھیلنے کا تجربہ ہے ان کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں۔ چھلے ہوئے آلو ایک الگ پلیٹ میں رکھتے جایئے۔ بعض صورتوں میں جہاں چھیلنے والا ناخواندہ ہو یہ عمل بالعموم یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہماری اکثر قارئین پڑھی لکھی ہیں لہٰذا آلو چھیلنے میں جاسوسی ناول یا فلمی پرچے ضرور پڑھتی ہوں گی۔ ڈیٹول انہی کے لیے ہے۔ جہاں چر کا لگا ڈیٹول میں انگلی ڈبوئی اور پٹّی باندھی۔ ہمارے تجربے کے مطابق ڈیٹول کی ایک چھوٹی شیشی میں آدھ سیر آلو چھیلے جا سکتے ہیں۔ بعض جزرس اور سلیقہ مند خواتین سیر بھر بھی چھیل لیتی ہیں۔ جن بہنوں کو ڈیٹول پسند نہ ہو وہ ٹنکچر یا ایسی ہی کوئی اور دوا استعمال کر سکتی ہیں۔ نتیجہ یکساں رہے گا۔

حلوہ بے دودھ

اس حلوے کی ترکیب نہایت آسان ہے۔ حلوہ پکائیے اور اس میں دودھ نہ ڈالیے۔ نہایت مزیدار حلوہ بے دودھ تیار ہے۔ ورق لگائیے اور چمچے سے کھائیے۔

نہاری

کون ہے جس کے منہ میں نہاری کا لفظ سن کر پانی نہ بھر آئے۔ اس کا راج دہلی اور لاہور میں زیادہ ہے لیکن دونوں جگہ نسخے میں تھوڑا اختلاف ہے۔ دلّی والے نلیاں، پائے، مغز اور بارہ مسالے ڈالتے ہیں۔ جس سے زبان فصیح اور با محاورہ ہو جاتی ہے۔ پنجاب والے بھوسی، بنولے اور چنے ڈالتے ہیں کہ طب میں مقوّی چیزیں مانی گئی ہیں۔ گھوڑے اوّل الذّکر نسخے کو چنداں پسند نہیں کرتے جس میں کچھ دخل صوبائی تعصب کا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس تعصب سے دلّی والے بھی یکسر خالی نہیں۔ ان کے سامنے دوسرے نسخے کی نہاری رکھی جائے تو رغبت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ بعض تو برا بھی مان جاتے ہیں۔

اس بات میں فقط ایک احتیاط لازم ہے۔ کھانے والے سے پوچھ لینا چاہیے کہ وہ

آدمی ہے یا گھوڑا۔

لائق مصنف نے سنبوسہ، بیسن، کریلوں کی کھیر اور تھالی کے بینگن وغیرہ تیار کرنے اور انڈا ابالنے وغیرہ کی ترکیبیں بھی دی ہیں لیکن ہم نے خود مکمل باورچی خانہ کی صرف ایک ترکیب آزمائی ہے۔ وہ ہے روٹی پکانے کی۔ قارئین کرام بھی اسے آزمائیں اور لطف اٹھائیں۔

سب سے پہلے آٹا لیجیے۔ آٹا آ گیا، اب اس میں پانی ڈالیے۔ اب اسے گوندھیے۔ گندھ گیا؟ شاباش۔ اب چولھے کے پاس اکڑوں بیٹھیے۔ بیٹھ گئے؟ خوب اب پیڑا بنائیے جس کی جسامت اس پر موقوف ہے کہ آپ لکھنو کے رہنے والے ہیں یا بنّوں کے۔ اب کسی ترکیب سے اسے چپٹا اور گول کر کے توے پر ڈال دیجیے۔ اسی کا نام روٹی ہے۔ اگر یہ کچّی رہ جائے تو ٹھیک ورنہ کوئلوں پر ڈال دیجیے تا آنکہ جل جائے۔ اب اسے اٹھا کر رومال سے ڈھک کر ایک طرف رکھ دیجیے اور نوکر کے ذریعے تنور سے پکی پکائی دو روٹیاں منگا کر سالن کے ساتھ کھائیے۔ بڑی مزیدار معلوم ہوں گی۔

مصنّف نے دیباچے میں اپنے خاندانی حالات بھی دیے ہیں اور شجرہ بھی منسلک کیا ہے۔ ان کا تعلق ملّا دوپیازہ کے گھرانے سے ہے۔ شاعر بھی ہیں۔ بیاہ شادیوں پر ان

کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ دیگیں پکانے کے لئے بھی، سہرا کہنے کے لیے بھی۔ ہر ترکیب کے بعد مصنّف نے اپنے اشعار بھی درج کئے ہیں جس سے دونوں خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ باورچی خانہ کا باورچی خانہ، دیوان کا دیوان۔

ہماری کمرشل سروس

خواتین و حضرات آج ہم قارئین کی پُرزور فرمائش پر اپنے کالم کی کمرشل سروس کا آغاز کر رہے ہیں۔ ایک زمانے میں اخبار اور ریڈیو بھی ہمارے کالم کی طرح خشک بلکہ گرم خشک ہوتے تھے۔ بارے اشتہاروں کا زمانہ آیا اور ان میں کچھ رنگینی پیدا ہوئی۔ ریڈیو پر شروع شروع میں تو تقریروں، ڈراموں، فیچروں گانوں اور خبروں کے درمیان کبھی کبھی اشتہار آتے تھے۔ اب اشتہاروں کے درمیان جہاں جگہ خالی رہ جائے ڈرامے، فیچر یا خبریں اس طرح دی جاتی ہیں جس طرح ہمارے اخباروں میں اداریے کے نیچے یا کہیں اور خالی جگہ رہ جاتے تو کاتب خود ہی لکھ دیتا ہے۔ ''اخبار ہذا میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے۔'' یا زیادہ باذوق ہوا تو خودی کو بلند کر دیتا

ہے یا تقدیر امم بتا دیتا ہے۔ ٹیلیویژن سلمہٗ نے تو خیر یہ رمز پہلے ہی سمجھ لی تھی کہ لوگ اشتہار سننے کے لئے ٹیلیویژن خریدتے ہیں، باقی پروگرام تو خانہ پری کے ہیں۔ واقعی ہم بھی سوچتے ہیں کہ ٹیلیویژن رہنمائی نہ کرتا تو لوگ کس سے پوچھ کر بناسپتی گھی، صابن اور بستر کی چادریں خریدتے۔ جس تِس کا مُنہ تکا کرتے یا بغیر صابن نمبر ۴۰۴ سے کپڑے دھوتے اور بغیر نارنگی وناسپتی میں پکا وٹامن سے بھرپور کھانا کھائے کھری چارپائی پر لوٹ لگایا کرتے۔

تلوار مارکہ جوتے

ہماری فیکٹری کے عمدہ اور آرام دہ جوتے شہر بھر میں مقبول۔ پہننے میں بھی اچھے، چٹخانے میں بھی خوب۔ اس وقت ہمارے شہر میں جو ہزاروں لوگ جوتے چٹخاتے پھر رہے ہیں ان میں زیادہ تر ہماری دکان کے گاہک ہیں۔ یہ جوتے بے روزگاروں کے لیے خاص طور پر موزوں ہیں۔

ہمارے تلوار مارکہ جوتوں کی سیاسی جماعتوں میں بڑی مانگ ہے۔ کراچی کی ایک سیاسی جماعت کے صدر فرماتے ہیں کہ ہم نے گزشتہ الیکشن کے دِنوں میں یہی جوتے استعمال کیے تھے۔ ہمارے تمام امیدواروں میں انہی جوتوں میں دال بٹتی

تھی۔ ایک اور سیاسی جماعت کے سیکرٹری صاحب بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ گزشتہ دِنوں اس پارٹی کے دو گروہوں کے درمیان جو جوتا چلا تھا وہ ہماری ہی فیکٹری کا بنا ہوا تھا۔

پسوؤں اور کھٹملوں کے لئے بھی تلوار مارکہ جوتوں سے بہتر کوئی شے کارگر نہیں۔ کھٹمل یا پسو کو زمین پر رکھیے اور جوتوں سے مسل دیجئے۔ ہمارے جوتے کا مسلا پانی نہیں مانگتا۔ لہٰذا یہ ان بستیوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے جن میں پانی کی کمی ہے۔

ہمارے جوتے جہیز میں دینے کے لئے خاص طور پر پسند کیے جاتے ہیں۔ جن بیبیوں کے پاس ہوں وہ میاں تو کیا شے ہے پورے سسرال کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہیں۔

چام کے دام بڑھنے کے باوجود ہماری قیمتیں بازار کے معاملے میں بہت کم ہیں۔ خاص آرڈر پر ہم پاپوش میں آفتاب کی کرن بھی لگا کر دیتے ہیں اور اس کے علیحدہ پیسے چارج نہیں کرتے۔

نوٹ۔ نیا اسٹاک آ گیا ہے اور اب ہم اپنے تمام مہربان سرپرستوں کی خدمت کرنے کے قابل ہیں۔ یقین رکھیے کہ جو گاہک بھی ہماری دکان پر آئے گا ہم اس کو جوتا دیں

گے۔

ملیریا سے نجات حاصل کیجیے

ملیریا سے نجات کے لئے کلّن قوال اینڈ پارٹی ریڈیو سنگرز لارنس روڈ کی خدمات حاصل کیجئے۔

ملیریا مچھروں سے پھیلتا ہے۔ بعض لوگ ان موذیوں سے نجات پانے کے لئے ناگوار بُو والے تیل اور کوائل وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے قدیم زمانے سے یہ مقصد قوّالی کے ذریعہ حاصل کیا جاتا رہا ہے۔ عارفانہ کلام روح کی تازگی اور بالیدگی ہی کا تیر بہدف نسخہ نہیں بلکہ ملیریا کا بھی دشمن ہے۔ ہمارے قوّال اور تالی بجانے والے دیکھتے دیکھتے مچھروں کے لاشوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ جن علاقوں میں ایک بار ہماری پارٹی کی خدمت حاصل کی گئیں وہاں کے لوگ نہ صرف نیک، خدا ترس اور صوفی ہو گئے۔ بلکہ موسمی بخار کا بھی کھٹکا نہ رہا۔

مختلف میونسپل کمیٹیوں کے ہیلتھ افسروں کے سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

نیند تو صحت کے لئے نہایت ضروری چیز ہے لیکن یاد رکھیے خواب آور گولیوں کا استعمال خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے سمجھدار لوگ، ادیب، شاعر، تاجر پیشہ، عشق پیشہ حضرات نیند لانے کے لیے ہمارے ہاں کی حسبِ ذیل مطبوعات استعمال کرتے ہیں۔

جدلیاتی لسانیات کے اساسی اصول، ۱۲۰ صفحہ، قیمت چار روپے۔

تنقید کے مابعد الطبیعاتی نظریات، ۲۱۶ صفحے، قیمت چھ روپے۔ فیملی سائز مطلوب ہو تو حضرت خرگوش لکھنوی کا تازہ ترین ناول "خواب خرگوش" استعمال کیجئے۔ ۲۵ صفحات پر محیط اس لافانی تحفے کی قیمت فقط اٹھارہ روپے ہے۔ محصول ڈاک معاف۔ خوراک بڑوں کے لیے چار سے آٹھ صفحے، بچّوں کے لئے دو صفحے۔ تین سال سے کم عمر کے بچّوں کو فقط کتاب کی شکل دکھا دینا کافی ہے۔ مقررہ خوراک سے زیادہ استعمال نہ کیجئے۔ خرّاٹے آنے کا ڈر ہے۔

چند غیر ضروری اعلانات

بس مسافروں کے لئے مژدہ

کراچی بس مالک ایسو سی ایشن بڑے فخر اور مسرّت سے اعلان کرتی ہے آج سے شہر میں ہم بسوں کے کرائے دُگنے کر دیے گئے ہیں۔ اُمید ہے محبِّ وطن حلقوں میں اس فیصلے کا عام طور پر خیر مقدم کیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے بس مالکان کی آمدنی پر ہی نہیں، مسافروں کے معیارِ زندگی پر بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔

ایسوسی ایشن ہذا، کرایوں میں اضافے کے علاوہ مسافروں کے لئے کچھ اور سہولتوں کا بھی اعلان کرتی ہے۔ مثلاً ہر بس میں جہاں فقط چالیس سواریوں کی گنجائش ہوتی تھی اب اس سے تین گنا مسافروں کو جگہ دی جایا کرے گی۔ اس مقصد سے ہر بس کی چھت میں کنڈوں اور تسموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور سیٹیں نکال دی گئی ہیں جو خواہ مخواہ کھڑے ہونے والوں کے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں۔

پبلک کی مزید آسانی کے لئے ہر بس کی چھت پر پائیدانوں پر، مڈ گارڈوں پر، انجن پر حتّٰی کہ سائلنسر تک پر مسافروں کے بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ ان خصوصی جگہوں کا کرایہ بھی کچھ زائد نہیں ہو گا۔ شرح ٹکٹ وہی رہے گی جو اندر بیٹھنے یعنی کھڑے ہونے اور لٹکنے والے مسافروں سے وصول کی جائے گی۔ آئندہ سے سب مسافروں کے حقوق بھی مساوی ہوں گے۔ یعنی ہر مسافر کو بس کو دھکّا لگانے کا کہاں حق ہو گا حتّٰی کہ آدھا ٹکٹ لینے والے بچّوں اور بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے معذوروں کو بھی۔ بسوں میں یتیم خانوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے والوں اور کھٹی میٹھی گولیاں بیچنے والوں کو بھی یہ حق دینے پر اس میٹنگ میں غور کیا

جارہا ہے۔ جو کراچی کا ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لئے کمشنر صاحب کے دفتر میں اگلے ہفتے ہو رہی ہے۔

پانی بند رہے گا

ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کے باشندوں کو مژدہ ہو کہ جمعے اور ہفتے کو ان کے گھروں کا پانی بند رہا کرے گا۔ یہ سہولت روزانہ تیئیس گھنٹے پانی بند رہنے کی سہولت کے علاوہ ہے۔ یعنی مجبوریوں کی وجہ سے فی الحال ہفتے میں دو دن سے زیادہ پانی مکمل طور پر بند رکھنا ممکن نہیں۔ ناغے کے دنوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھائی جائے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ ماہِ محرم کی آمد تک ہم ہفتے کے ساتوں دن پانی بند رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ بلدیہ کراچی اور کے ڈی اے نہایت مسرّت سے اعلان کرتی ہیں کہ اہلِ ناظم آباد کے ایک دیرینہ مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے اس علاقے کے واٹر ٹیکس میں فوری طور پر تین سو فیصدی اضافہ کیا جارہا ہے۔ آگے چل کر اس میں اور بھی اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن کے ڈی اے اور بلدیہ کے روز

افزوں رسائل اور محدود اخراجات کو دیکھتے ہوئے فی الحال اس کی قطعی طور پر ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

علامہ اقبال ٹاؤن نارتھ ناظم آباد کے پارک میں کامیاب تجربے کے بعد شہر کے دوسرے پارکوں کا پانی بھی بند کیا جارہا ہے تاکہ زمین بھر بھری ہو جائے اور کتنے آسانی سے اس میں لوٹ لگاسکیں۔

آپ کا اپنا اسکول

انٹرنیشنل انگلش آکسفورڈ اسکول آپ کا اپنا اسکول ہے جو تعلیم کے جدید ترین اصولوں پر کھولا گیا ہے۔ چند خصوصیات۔

۱۔ فیس کا معیار نہایت اعلیٰ۔ شہر کا کوئی اور اسکول فیس کے معاملے میں ہمارے اسکولوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔ انواع و اقسام کے چندے اس کے علاوہ ہیں جن کی تفصیل پرنسپل صاحب کے دفتر سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

۲۔ اساتذہ۔ نہایت محنتی، ایماندار اور قناعت پسند جن کو پیش قرار تنخواہوں پر رکھا گیا ہے۔ عام ٹیچر کی تنخواہ بھی ہمارے ہاں میونسپل کارپوریشن کے

تنخواہ سے کم نہیں اور پرنسپل کا مشاہرہ تو کسی بڑی سے بڑی غیر ملکی کمپنی کے چوکیدار کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے۔

۳۔ چھٹیاں۔ چھٹیوں کے معاملے میں بھی ہمارا اسکول دوسرے تمام اسکولوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ہر ماہ فیس جمع کرانے کے دن کے علاوہ قریب قریب پورا سال چھٹی رہتی ہے۔ جو والدین سال بھر کی فیس اکٹھی جمع کرا دیں۔ ان کے بچّوں کو فیس کے دن بھی حاضری دینے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ماحول۔ اسکول نہایت مرکزی اور پُر رونق جگہ پر واقع ہے اور شہر کا سب سے قدیمی اوپن ائیر اسکول ہے۔ یہاں طلبا کو مناظر فطرت سے محبت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ بالکل سامنے ایک سینما ہے اور ایک سرکس۔ ایک بغل میں موٹر گیراج ہے۔ اور دوسری طرف گٹر باغیچہ جس کی کھاد سارے شہر کو ہرا بھرا رکھنے کی ضامن ہے۔ پروفیسر کیوی کے اصول کے مطابق یہاں پڑھائی کتابوں سے نہیں کرائی جاتی۔ بلکہ کسی اور طرح بھی نہیں کرائی جاتی تاکہ طالب علم کے ذہن پر ناروا بوجھ نہ پڑے۔

۵۔ نتیجہ ۔ اسکول کا نتیجہ کم از کم سو فیصد رہتا ہے۔ کئی بار دو سو ڈھائی فیصد بھی ہو جاتا ہے کوئی شخص، خواہ وہ طالب علم یا غیر طالب علم، اس اسکول کے پاس سے بھی گزر جائے تو پاس ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ طالب علموں پر امتحان میں بیٹھنے کی کوئی پابندی نہیں۔ سب کو گھر بیٹھے کامیابی کی سندیں بھیج دی جاتی ہیں۔

اشتہارات 'ضرورت نہیں ہے' کے

ایک بزرگ اپنے نوکر کو فہمائش کر رہے تھے کہ تم بالکل گھامڑ ہو۔ دیکھو میر صاحب کا نوکر ہے اتنا دور اندیش کہ میر صاحب نے بازار سے بجلی کا بلب منگایا تو اس کے ساتھ ہی ایک بوتل مٹّی کے تیل کی اور دو موم بتّیاں بھی لے آیا کہ بلب فیوز ہو جائے تو لالٹین سے کام چل سکتا ہے۔ اس کی بتّی ٹوٹ جائے یا بتّی ختم ہو جائے تو موم بتّی روشن کی جا سکتی ہے۔ تم کو ٹیکسی لینے بھیجا تھا تم آدھے گھنٹے بعد ہاتھ لٹکاتے آ گئے۔ کہا کہ جی ٹیکسی تو ملتی نہیں۔ موٹر رکشہ کہئے تو لیتا آؤں۔ میر صاحب کا نوکر ہوتا تو موٹر رکشہ لے کے آیا ہوتا تاکہ دوبارہ جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

نوکر بہت شرمندہ ہوا اور آقا کی بات پلّے باندھ لی۔ چند دن بعد اتفاق سے آقا پر بخار کا حملہ ہوا تو انہوں نے اسے حکیم صاحب کو لانے کے لئے بھیجا۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب تشریف لائے تو ان کے پیچھے پیچھے تین آدمی اور تھے جو سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک کی بغل میں کپڑے کا تھان تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں لوٹا اور تیسرے کے کاندھے پر پھاوڑا۔ آقا نے نوکر سے کہا۔ یہ کون لوگ ہیں؟ نوکر نے تعارف کرایا کہ جناب ویسے تو حکیم صاحب بہت حاذق ہیں لیکن اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو میں درزی کو لے آیا ہوں اور وہ کفن کا کپڑا ساتھ لایا ہے۔ یہ دوسرے صاحب غسّال ہیں اور تیسرے گورکن۔ ایک ساتھ اس لیے لے آیا کہ بار بار بھاگنا نہ پڑے۔

ایسے ہی ایک بزرگ ہمارے حلقۂ احباب میں بھی ہیں۔ گلی سے ریڑھی والا ہانک لگاتا گزر رہا تھا کہ انگور ہیں چمن کے پپیتے ہیں پیڑ کے پکے ہوئے۔ انہوں نے لڑکا بھیج کر اُسے بلایا اور کہا "میاں جی معاف کیجئے۔ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔" پھل والا چلا گیا تو ہم نے عرض کیا کہ اس زحمت کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو جا ہی رہا تھا۔ اسے روکنا

کیا ضرور تھا۔ بولے۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ اس پر بات واضح کر دی جائے اور معذرت بھی کی جائے کیونکہ بے چارا اتنی دور سے اتنی امید لے کر پھل بیچنے آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے یہ گمان نہ گزرے کہ اس گھر میں شائد بہرے رہتے ہیں جو اس کی آواز نہیں سن پاتے ہیں۔ ہمارے دوست ایک روز کار میں ہمارے ساتھ گولی مار سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے تشریف لائیے۔ ربڑی قلفی اور لسّی تیّار ہے۔ انہوں نے فوراً کار ٹھہرائی اور دوکاندار سے کہا کہ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے پاس فرصت نہیں۔ ہم ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ دوسرے قلفی اور ربڑی ہم نہیں کھاتے اور لسّی کا بھلا یہ کون سا موسم ہے؟ بہر حال تمہاری پیشکش کا شکریہ۔ وہ تو بیٹھا سُنا کیا اور نہ جانے کیا سمجھا کیا۔ کار میں واپس بیٹھتے ہوئے ہمارے دوست نے وضاحت کی کہ یہاں کے لوگ ان آداب کو کیا جانیں۔ یہاں تو دعوت نامہ آتا ہے اور اس کے نیچے RSVP لکھا ہوتا ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیے۔ جن کو شریک نہیں ہونا ہوتا وہ بھی چُپ بیٹھے رہتے ہیں۔ میزبان کو مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھتے کہ بندہ حاضر ہونے سے معذور ہے۔ اس بے چارے کا کھانا ضائع جاتا ہے۔

ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم خود انہی آداب سے بے بہرہ لوگوں میں سے ہیں۔ لوگ اخباروں میں طرح طرح کے اشتہارات چھپواتے ہیں کہ ہم پڑھ کر ان کی طرف متوجہ ہوں لیکن ہم انہیں پڑھ کر ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔ کوئی ہمارے لیے ٹھیکے کا بندوبست کرتا ہے اور ٹینڈر نوٹس شائع کرتا ہے۔ کسی کو ہمارے ہاتھ پلاٹ یا مکان بیچنا ہوتا ہے۔ کوئی ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس نے اپنے نالائق فرزند کو جائیداد سے عاق کر دیا ہے۔ کہیں کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ ہم ان کی فرزندی قبول کر لیں اور ذات پات تعلیم اور تنخواہ کی شرطیں من و عن وہی رکھی جاتی ہیں جو ہم میں ہیں۔ کوئی ہمیں گھر بیٹھے لاکھوں روپے کمانے کا لالچ دیتا ہے۔ کوئی شارٹ ہینڈ سکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہت سے کالج مشتاق ہیں کہ ہم ان کے ہاں داخلے لیں اور بعضے اپنی کاریں اور ریفریجریٹر معقول قیمت پر ہماری نذر کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سب ضرورت مندوں سے آدمی کیسے عہدہ برآ ہو۔ بہت سوچنے کے بعد یہ ترکیب ہماری سمجھ میں آئی ہے کہ جہاں ہم ضرورت ہے کا اشتہار چھپوا دیں ہماری دانست میں ان اشتہارات کی صورت کچھ اس قسم کی ہونی چاہیئے۔

کرائے کے لیے خالی نہیں ہے

۴۰۰ گز پر تین بیڈ روم کا ایک ہوا دار بنگلہ نما مکان جس میں نلکا ہے اور عین دروازے کے آگے کارپوریشن کا کوڑا ڈالنے کا ڈرم بھی ہے، کرائے پر دینا مقصود نہیں ہے۔ نہ اس کا کرایہ تین سو روپے ماہوار ہے اور نہ چھ ماہ پیشگی کرایہ کی شرط ہے جن صاحبوں کو کرائے کے مکان کی ضرورت ہو وہ فون نمبر ۳۴۵۶۷ پر رجوع نہ کریں کیونکہ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔

اطلاعِ عام

راقم محمد دین ولد فتح دین کریانہ مرچنٹ یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہے کہ اس کا فرزند رحمت اللہ نہ نافرمان ہے نہ اوباشوں کی صحبت میں رہتا ہے لہٰذا اسے جائیداد سے عاق کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آئندہ جو صاحب اسے کوئی ادھار وغیرہ دیں گے وہ میری ذمہ داری پر دیں گے۔

ضرورت نہیں ہے

کار مارس مائنر ماڈل ۱۹۵۹ء بہترین کنڈیشن میں، ایک بے آواز ریڈیو نہایت خوبصورت کیبنٹ، ایک ویسپا موٹر سائیکل اور دیگر گھریلو سامان پنکھے پلنگ وغیرہ قسطوں پر یا بغیر قسطوں کے ہمیں درکار نہیں۔ ہمارے ہاں خدا کے فضل سے یہ سب چیزیں پہلے سے موجود ہیں۔ اوقات ملاقات ۳تا۸ بجے شام۔

عدم ضرورت رشتہ

ایک پنجابی نوجوان برسرِ روزگار آمدنی تقریباً پندرہ سو روپے ماہوار کے لیے باسلیقہ خوبصورت، شریف خاندان کی تعلیم یافتہ دوشیزہ کے رشتے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ ہے۔ خط و کتابت صیغہ راز میں نہیں رہے گی۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار لڑکے اور لڑکیوں کے لیے رشتے مطلوب نہیں ہیں۔ پوسٹ بکس کراچی۔

داخلے جاری نہ رکھیے

کراچی کے اکثر کالج آج کل انٹر اور ڈگری کلاسوں میں داخلے کے لئے اخبار میں دھڑا دھڑ اشتہار دے رہے ہیں۔ یہ سب اپنا وقت اور پیشہ ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کے ہاں داخل ہونا مقصود نہیں۔ ہم نے کئی سال پہلے ایم اے پاس کر لیا تھا۔

ہم مہمانِ خصوصی بنے

آج کل کراچی کے کالجوں اور اسکولوں میں مباحثوں اور یوموں کا موسم ہے۔ سِکّہ بند مہمانِ خصوصی کو دن میں دو دو درس گاہیں بھگتانی پڑ رہی ہیں۔ صبح کہیں ہے شام کہیں۔ ہمارے ایک بزرگ تو مدرسہ رشیدیہ حنفیہ میں ایلورا اور اجنتا کی تصویروں پر اظہارِ خیال کر آئے کیونکہ اپنے ساتھ غلطی سے شام والی تقریر لے گئے تھے۔ اس کی تلافی کے لئے اس شام انہیں ماڈرن آرٹ کالج میں حضرت ابوہریرہؓ کی زندگی اور حدیثوں میں اسمائے رجال کی اہمیت پر بولنا پڑا۔ اس شہر میں چالیس پچاس کالج ہوں گے اور سیکنڈری اسکول بھی بہت ہیں لیکن سب ہمارے دیکھتے دیکھتے لوگوں میں

تقسیم ہو گئے۔ ہم بالکل ہی مایوس ہو گئے تھے کہ ایک اسکول والوں کا فون آیا کہ کل ہمارے ہاں جلسہ ہے مہمانِ خصوصی آپ ہوں گے۔

"کس قسم کا اسکول ہے آپ کا؟" ہم نے پوچھا۔

جواب ملا کہ پرائمری اسکول ہے۔

ہم نے کہا جب اس شہر میں اتنے سارے پرائمری پاس مہمانانِ خصوصی موجود ہیں تو ہمارا صدارت کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہو گا۔ ہم یوں بھی درویش گوشۂ نشین آدمی ہیں۔ انکسار ہماری طبیعت میں داخل ہے بھی اور کسی اور کو۔۔۔۔

لیکن ہمارا یہ عذر مسموع نہ ہوا۔ ہم نے بھی اس سے زیادہ عذر اور انکار مناسب نہ جانا جتنا کہ کسی مہمانِ خصوصی پر اخلاقاً واجب ہے تاکہ کسی اور کو نہ بلالیں۔ لہٰذا ہتھیار ڈال کر کہا۔ اچھا صاحب۔ آپ لوگ مجبور کرتے ہیں تو حاضر ہو جائیں گے کیونکہ قومی خدمت اور تعلیم کے فروغ کا معاملہ ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

ہم کوئی عادی قسم کے مہمانِ خصوصی نہیں ہیں۔ ہر کوئی ممتاز حسن ہو بھی نہیں سکتا کہ بحرِ معنی کا شناور ہو۔ جدھر چاہے بے تکلّف تیر تا نکل جائے۔ ممتاز صاحب میں

مروّت اس قدر ہے کہ کسی سے انکار نہیں کرتے۔ ان کا سیکریٹری اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جاتا ہے کہ کس روز کس وقت جلسہ ہے۔ اور وقت کے وقت یاد دِلاتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ بات بھی نوٹ ہونے سے رہ جاتی ہے کہ جلسہ کس کی طرف سے ہے اور کس تقریب میں ہے۔ ممتاز حسن صاحب جب موقع پر پہنچتے ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ انہیں فارابی کے فلسفے کے بارے میں بولنا ہے یا چیمبر آف کامرس کے ممبروں سے مشرقِ وسطیٰ کو کھالوں کی بر آمد کے امکانات پر گفتگو کرنی ہے۔ خیام سوسائٹی کی سالگرہ کے سالانہ جلسے کی انہیں پیشگی اطلاع نہ تھی۔ انہیں جلسہ گاہ میں پہنچ کر معلوم ہوا تاہم وہ تین گھنٹے تک اس موضوع پر بولتے رہے کہ خیام کے جو ترجمے جاپانی اور آرمینی زبانوں میں ہوئے ہیں ان میں کیا کیا لغزشیں ہوئی ہیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے نظام الملک طوسی، بائرن، کالیداس اور بلھے شاہ کے ہم معنی اشعار بھی سنائے۔ شام کو انہیں ریڈیو پر فن پہلوانی کی تاریخ اور رموز کے موضوع پر لکچر دینا پڑا اور اسی رات کو ٹی وی پر راگ جے جے ونتی کا موازنہ بیتھوون کی چودھویں سمفنی اور پنجابی کے مقبول گیت موڑیں بابا ڈانگ والیا سے کیا۔ اگلے روز ہومیوپیتھوں کے سالانہ جلسے کا افتتاح بھی انہوں نے کیا اور صدارتی خطبہ ارشاد

فرمایا۔ بعد میں ہومیوپیتھی کالج کے پرنسپل نے ہمیں بتایا کہ ممتاز صاحب نے آرنیکا اور فارمیکا کے جو خواص بتائے ہیں اور ان دواؤں کا رشتہ جوارش جالینوس اور سدھ مکر دھوج سے ثابت کیا ہے، وہ ہمارے لیے بالکل نئی معلومات ہیں۔ یہی رائے ہم نے ڈائریکٹر محکمہ زراعت سے سنی جنہیں ممتاز صاحب نے اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ شکر قندی کی فصل کے لیے کون سی کھاد زیادہ مفید رہتی ہے اور قدیم بابل میں میکسی پاک گندم کی کاشت کس طرح کی جاتی تھی۔

ہاں ہم ایسوں کو کچھ نہ کچھ پیشگی تیاری کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا جہاں ہم نے قمیص کو کلف لگوایا، جوتا پالش کیا، سوٹ استری کرایا، وہیں ایک تقریر بھی سوچ لی کہ تعلیمی کاموں کے لئے ہم گلے گلے حاضر ہیں اور پرائمری تعلیم سے ہمیں پرانی دلچسپی ہے بلکہ ایک زمانے میں تو پرائمری کلاسوں کے طالب علم بھی رہ چکے ہیں۔ اور یہ کہ آج کل کے بچوں کو ہماری تقلید کرنی چاہیے یعنی خدمت قوم کا جذبہ اپنے میں پیدا کرنا چاہیے اور ایثار سیکھنا چاہیے اور اچھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں اور بُری بُری باتیں چھوڑ دینی چاہئیں تاکہ ہمارا پیارا پاکستان ترقی کرے وغیرہ۔ اتفاق سے ہمیں اپنی اس تقریر کا مسودہ مل گیا جو ہم نے پار سال ہاکرز کنونشن میں کی تھی اور

ذراسی ترمیم کر کے لائبریری ایسوسی ایشن کے جلسے میں بھی استعمال کر چکے تھے۔ یہ اس موقع کے لئے بھی بر محل نظر آتی کیونکہ قومی خدمت اور تہذیبِ اخلاق وغیرہ کوئی ہاکروں اور لائبریرین حضرات کا اجارہ تھوڑا ہی ہیں۔ یہ بات طالبِ علموں میں بھی پیدا ہو جائے تو ہرج کی بات نہیں۔

مطالعے کا وسعت اور علم کی گہرائی بڑی اچھی چیزیں ہیں لیکن ایک قباحت کا پہلو بھی ان میں ہے۔ ہماری ہی مثال لیجئے۔ اتنے بہت سارے خیالات اور نکات ایک ساتھ ہمارے ذہن میں ہجوم کر آتے ہیں کہ ان کے گچھے سے بن جاتے ہیں اور حلق میں اٹک جاتے ہیں۔ ادب، فلسفہ، طب، تاریخ، جغرافیہ کسی کو نظر انداز کرنے کو جی نہیں چاہتا اور پھر تمام اشعار بھی موقع بہ موقع استعمال کرنے ہوتے ہیں جو ایک سلپ پر لکھے ہماری جیب میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس فالتو وقت ہو تو ان کو چھانٹ کر قرینے سے ترتیب بھی دیں۔ لیکن جلسے کرنے والوں کو عموماً جلدی ہوتی ہے۔ دریوں اور نمبروں والے تیار کھڑے ہوتے ہیں کہ کب جلسہ ختم ہو کب سامان ریڑھے پر لاد دیں۔ ادھر چائے ٹھنڈی ہو رہی ہوتی ہے۔ اور بعض لوگ جن کو اپنے اعصاب پر قابو نہیں ہوتا اپنی جمائیوں کو بھی مزید نہیں روک پاتے۔ سو اس

آپا دھاپی کے عالم میں ہم باتیں تو ساری کہہ گزرتے ہیں اور شعر بھی قریب قریب سارے استعمال کر لیتے ہیں لیکن اتنی مین میکھ ممکن نہیں ہوتی کہ مختلف مسائل کا آپس میں جوڑ ملائیں یا اشعار اور موضوع کا ربط دیکھیں۔ سامعین میں سے سمجھنے والے خود ہی اندازہ کر لیتے ہیں کہ کون سا شعر دراصل کون سے مضمون سے متعلق سمجھنا چاہئے اور جو مسائل بیان کیے گئے ہیں ان کی اصل ترتیب کیا ہے۔ لیکن سبھی لوگ تو ایسے نکتہ شناس نہیں ہوتے۔ سطحی مذاق کے سامعین اگر ہماری تقریر کو بے ربط اور الجھی ہوئی خیال کریں تو ہمارے نزدیک قابلِ معافی ہیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

اگر معاملہ کالج یا یونیورسٹی کا ہوتا تو ہم بہت سے مباحث چھوڑ جاتے۔ یہ فرض کر لیتے کہ ان عزیز طالب علموں کو یہ باتیں پہلے سے معلوم ہیں لیکن پرائمری کے بچوں کو ہر چیز قدرے تفصیل سے سمجھانی چاہیے اور یہی ہم نے کیا۔ کون نہیں جانتا کہ آج کل ہمارا سب سے بڑا مسئلہ افراطِ زر ہے اور زرِّ مبادلہ کی کمی ہے۔ ہمیں اپنی برآمدی تجارت کو بڑھانا چاہیے۔ قدرتاً سب سے پہلے ہم نے موزوں الفاظ میں اس مسئلے کا ذکر کیا اور کسی شاعر کے اس شعر پر بات ختم کی۔

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیئے نکال

مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

امابعد جنوبی افریقہ کی سیاست اور قبرص کے قضیے اور موسیقی کے باب میں حضرت امیر خسرو کی خدمات اور ابن رشد کے فلسفے اور سیم تھور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اسی میں ہمارے سفر یورپ کے کچھ تاثرات بھی آ گئے۔ اور خلفائے راشدہ کے عہد کی تعریف بھی۔ ایسی تقریریں بالعموم خشک ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہم ساتھ ساتھ پانی بھی پیتے گئے اور یہ شعر پڑھ کر جو اس وقت یاد نہیں کِس کا ہے ان مسائل کو بھی سمیٹا۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں

ساری مستی شراب کی سی تھی

یہاں سے گریز کر کے ہم ان مسائل ضروری کی طرف آئے جن کا ذکر اوپر کیا ہے۔ خدمتِ خلق، راست بازی، ایثار کی ضرورت وغیرہ، ہم اور بھی بولتے اگر سیکرٹری صاحب چِٹ نہ بھیج دیتے کہ آج کی حد تک یہی کافی ہے۔ اب آپ تھک

گئے ہوں گے۔ آخر ہم فدائے سخن، لسان العصر، فردوسی اسلام، استاد ذوق رحمتہ اللہ علیہ کے اسی مصرع پہ بات ختم کرکے بیٹھ گئے۔

جو ہو ذوقِ یقین پیدا

تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اس تقریر پر بہت جگہ تالیاں پٹیں۔ اکثر تو ہمیں بے موقع بھی معلوم ہوئیں۔ کچھ طالب علموں نے منہ میں انگلیاں دے کر سیٹیاں بھی بجائیں جیسی سینماؤں میں معیاری اور سنجیدہ فلموں پر اظہارِ پسندیدگی کے لیے بجائی جاتی ہیں۔ بعضوں نے بنچ بجانے اور فرش پر پاؤں سے مسلسل تھاپ دی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس میں ہماری کچھ خوبی نہیں۔ کسی نے آج کہا ہے کہ قبول سخن خُداداد چیز ہے۔

ہم نے اپنی تقریر میں جو زور راست بازی کی خوبیوں پر دیا تھا اس کا اثر تو فوراً ظاہر ہوا۔ سیکرٹری صاحب نے آخر میں شکریے کی تقریر کی تو اس میں حاضرین کو بتایا کہ اس میں صدارت کے لیے ہم نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو بلایا تھا۔ چنانچہ اعلان اور دعوت ناموں میں انہی کا نام ہے لیکن ایک دن پہلے انہوں نے انکار کر دیا۔ ہم نے

کچھ اور لوگوں سے رجوع کیا۔ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ عذر کیا۔ آخر انشاء اللہ خاں انشا صاحب مل گئے۔ ان کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی غزلیں اسکولوں کے نصابوں میں داخل ہیں۔ کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں وغیرہ۔۔۔

اس موقع پر ایک صاحب لپک کر آئے اور ان کے کان میں سرگوشی کی کہ ارے انشاء اللہ خاں انشا کو مرے تو بہت دن ہوئے۔ یہ آج کل کے ادیب ہیں۔ ابھی زندہ ہیں۔ سیکرٹری صاحب سے غلطی تو ہو گئی تھی لیکن انہوں نے کھنکار کر صورتِ حال کو بڑی خوبصورتی سے سنبھال لیا۔ فرمایا ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے مہمانِ کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ آج کل کے ادیب ہیں اور ابھی زندہ ہیں۔ انہوں نے بہت سے ناول لکھے ہیں۔ ڈرامے لکھے ہیں جو گھر گھر میں پڑھے جاتے ہیں۔ بہر حال ڈپٹی کمشنر صاحب کے نہ آنے کا ہمیں افسوس ہے۔ اور آپ کا (یہاں رُک کر انہوں نے ایک صاحب سے ہمارا صحیح نام پوچھا) یعنی ابنِ انشا صاحب کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں کہ باوجود اپنی مصروفیات کے یہاں تشریف لائے۔ حاضرین سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ صدارتی تقریر کی وجہ سے جلسہ ذرا طویل ہو

گیا اور انہیں سواری حاصل کرنے میں ذرا دقّت ہو گی۔ بہر حال اب جلسہ ختم ہے۔ شکریہ خدا حافظ۔

ایک زمانہ تھا کہ معاشرے میں شاعر ادیب کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ پھرتے تھے میر خوار کوئی پوچھتا نہ تھا۔ غالب جیسے بھی ڈپٹی کمشنروں کی شان میں قصیدے لکھتے اور ان کے دربار میں کرسی پانے پر فخر کرتے مر گئے۔ بارے اب ان کے بھاگ کھلے اور یہ ڈپٹی کمشنروں کے نعم البدل قرار پائے۔ پرانا زمانہ ہوتا تو ڈپٹی کمشنر کے انکار کرنے پر تحصیلدار صاحب کو تکلیف دی جاتی۔ وہ نہ ملتے تو تھانیدار صاحب مل جاتے اور بی ڈی کے چیئرمین تو کہیں گئے نہیں۔ ان سب کو نظر انداز کر کے کسی خالی خولی ادیب کو بُلانا اور کرسیٔ صدارت پر بٹھانا ایک بڑی بات ہے۔ اب بھی کوئی کہتا پھرے کہ ہمارے ہاں علم یا اہلِ علم کی قدر نہیں تو حیف ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب ڈپٹی کمشنر کی جگہ شاعر ادیب استعمال ہو سکتا ہے تو اس بات کی راہ بھی کھل گئی ہے کہ ہم کسی مشاعرہ میں نہ جا سکیں تو جلسے والے کسی ڈپٹی کمشنر سے غزل پڑھوا لیں۔ ہمارے لیے تو غزل وزل کہنا مشکل بھی ہے۔ ان لوگوں کے لیے مشکل بھی نہیں۔ اپنے پی اے یا کسی ماتحت افسر سے کہہ دیا کہ "ڈرافٹ پیش کرو اور ہمارا تخلّص

ڈال دینا۔ ہم دستخط کر دیں گے اور ہاں الفاظ مشکل نہ ہوں اور ذرا خوشخط لکھی ہوئی ہو۔"

ہم پھر مہمانِ خصوصی بنے

مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا۔ دوسری بار ڈسے جانے کے خواہشمند کو کوئی دوسرا سوراخ ڈھونڈنا چاہیے۔ خود کو مہمانِ خصوصی بنتے ہم نے ایک بار دیکھا تھا۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس تھی۔ اب ہم ہر روز بالوں میں کنگھا کرکے اور ٹائی لگا کر بیٹھنے لگے کہ ہے کوئی اندھا محتاج جو دے سخی کو دعوت نامہ، بلائے اسے صدارت کے لیے۔ اپنے دوستوں سے بھی باتوں باتوں میں ہم نے بہت کہا کہ آج کل ہم خالی ہیں اور خدمت قوم کے لیے تن من دھن حاضر ہے۔ کوئی یونیورسٹی یا کالج یا اسکول ہماری ذات ستودہ صفات سے اپنے جلسے کی

رونق بڑھانا چاہے تو ہم بخوشی اس کے لیے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالیں گے۔ بارے ایسا جگہ سے دعوت نامہ آیا۔ اسپورٹنگ انگلش اسکول گولیمار کے پرنسپل صاحب نے ہم سے استدعا کی کہ آپ ہمارے ہاں مہمانِ خصوصی بن کر آئیں اور اسکول کو اپنی جیب خاص سے کم از کم پانچ سو روپے عطیہ دیں تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔ ہم نے کہا۔ ہم ہیں تو بہت مصروف لیکن آپ کی خاطر آجائیں گے اور پانچ سو روپے تو خیر زیادہ ہے دو سو روپے اسکول کو دیں گے تاکہ ہمارے ملک میں تعلیم کو ترقی ہو۔ ہم ایسے نیک کاموں کی سرپرستی نہ کریں گے تو اور کون کرے گا؟ ایسا لگتا ہے کہ ان صاحبوں کو اس سے زیادہ وظیفہ دینے والا کوئی اور نہ ملا لہٰذا معاملہ پٹ گیا اور ہم نے اپنی شیروانی ڈرائی کلین ہونے کے لیے بھجوادی۔

اسپورٹنگ اپنی جگہ اور انگلش اپنی جگہ، لیکن نام کے اس طمطراق کے باوجود تھا یہ بھی پرائمری اسکول اور ہم یہ سوچ کر کچھ آزردہ سے ہو گئے کہ یہی رفتار رہی یعنی ہماری زندگی کے یہ دن پرائمری اسکولوں سے خطاب کرتے گزر گئے تو یونیورسٹی کانوکیشن سے خطاب کی نوبت کس عمر میں آئے گی۔ ابھی تو بہت مرحلے درمیان میں تھے۔ لوئر سیکنڈری اسکول، ہائر سیکنڈری اسکول، انٹر کالج، ڈگری کالج اور نہ

جانے کیا کیا۔ نیز پچاس روپے اسکول والوں کو ایڈوانس دے کر ہم نے بات پکی کی اور کہا گولیمار تو بڑی پیچیدہ سی جگہ ہے۔ کوئی لینے آئے گا ہمیں؟

جواب ملا کہ لینے تو کوئی نہیں آئے گا۔ آپ دو نمبر کی بس میں پاپوش نگر سے بیٹھئے اور گولیمار ۳ پر اتریے، سامنے جس گلی کی نکّڑ پر آپ کو "اپ ٹو ڈیٹ ہیئر کٹنگ سیلون بے ضرر ختنہ کا بہترین مرکز" کا بورڈ نظر آئے اس میں سے نکل کر بائیں ہاتھ چوتھا موڑ آپ مڑیں گے تو آپ کو شامیانہ تنا ہوا ملے گا۔ لیکن ساڑھے نو بجے آپ کا پہنچ جانا ضروری ہے کیونکہ گیارہ بجے خیموں اور کرسیوں والے اپنا سامان لینے آ جائیں گے۔ ہم نے کرایہ گیارہ بجے تک کا دیا ہے۔ اس کے بعد یہ چیزیں ایک شادی والے کے گھر چلی جائیں گی۔

ہم نے کہا مضائقہ نہیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ شادی والے گھر چلے جائیں گے۔ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند۔

ملا نصر الدّین کو لوگوں نے دیکھا کہ ریگستان میں جا بجا کھدائی کرتے پریشان پھر رہے ہیں۔ ایک صاحب نے ماجرا پوچھا تو معلوم ہوا ایک جگہ انہوں نے کچھ روپے داب دیے تھے اور نشانی یہ رکھی تھی کہ اس وقت اس جگہ کے عین اوپر ابر کا ایک ٹکڑا تھا

جو اب کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شادیوں بیاہوں، قوّالیوں، مشاعروں، یوموں، جشنوں اور تقریری مقابلوں کی ریل پیل کے دنوں میں خیمے چھولداری کی نشانی سے کسی جگہ کو پانا کچھ ایسی ہی بات تھی لیکن خیر ہم اپ ٹو ڈیٹ ہیئر کٹنگ سیلون کی گلی میں مُڑ کر بائیں ہاتھ دیکھنے لگے حتیٰ کہ دور ایک شامیانہ نظر آیا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ دریوں پر کچھ بچّے کھیل رہے ہیں۔ ایک طرف کو کرسیوں پر کچھ بزرگ بیٹھے ہیں جو ان کے والدین ہوں گے لیکن ہمارے میزبان صاحبان کا کہیں پتہ نہیں۔ خیر ہم بھی ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں کچھ اور لوگ آ گئے اور اب ایک صاحب نے آ کر مؤدبانہ ہم سے پوچھا کہ آپ لڑکے والوں کی طرف سے ہیں نہ؟ باقی بارات کہاں ہے؟ ہم نے کہا مذاق بند کرو ہمیں یہاں تقریر کر کے اور بھی کئی جگہ صدارتیں کرنی ہیں۔ بس اب کاروائی شروع ہو۔ کہاں ہے کرسیٔ صدارت؟۔۔۔۔ تھوڑی سی مزید اور قدرے تکلیف دہ گفتگو کے بعد پتہ چلا کہ ہمیں اس سے اگلی گلی میں جانا چاہیئے تھا وہاں ہم خوب وقت پر پہنچے۔ اعلان ہو رہا تھا کہ آج کل اچھے اچھے لوگ بغیر ذمہ داری برتتے ہیں۔ وعدہ کر کے تشریف نہیں

لاتے۔ ہمارے آج کے مہمان بھی ایسے ہی نکلے۔ خیر اب میں بی ڈی ممبر جناب تاج الدّین تاج سے درخواست کرتا ہوں کہ ان کی جگہ۔۔۔۔۔

لیکن ہم نے نفسِ نفیس نمودار ہو کر تاج صاحب کی صدارت میں اسی طرح کھنڈت ڈال دی جس طرح ہماری فلموں میں کوئی بزرگ عین نکاح کے وقت پہنچ کر ساری کاروائی روک دیتے ہیں۔ ”ٹھہرو یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

اس کے بعد جو کاروائی ہوئی اس میں سے ہمیں فقط اتنا یاد ہے کہ عبدالعزیز جماعت اوّل نے ہمیں ہار پہنایا۔ دوسری جماعت کے بچّوں نے انگریزی میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ جماعت سوم کی ایک بچّی نے ایک فصیح و بلیغ تقریر پڑھی جو اس کے والدین کی لیاقت و وسعتِ مطالعہ اور زبان پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت تھی۔ اس کے بعد چوتھی جماعت کے ایک طالب علم نے 'ہم مرد مجاہد ہیں' کا ترانہ گاتے ہوئے جوش میں آکر اپنی تلوار سے ہم پر وار کیا۔ خیریت یہ ہوتی کہ ایسے موقع پر تلواریں گتّے کی استعمال کی جاتی ہیں۔ بعد ازاں ہم نے کھنکار کر صدارتی خطبہ شروع کیا ہی تھا۔ ”خواتین و حضرات اور پیارے بچّو۔۔۔“ کہ پیچھے سے ایک صاحب نے آ کے ہمارے نیچے سے کرسی کھینچ لی اور کہا۔ حضور گیارہ بج گئے۔ اب یہ سامان کہیں اور

لے جانا ہے۔ ظالموں نے ہمیں حاضرینِ جلسہ کا شکریہ ادا کرنے کی بھی مہلت نہ دی۔ خیر اس کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ اس وقت حاضرین تھے کہاں۔ انہوں نے شامیانے کے کھونٹے اکھڑتے دیکھ لیے تھے اور زاں پیشتر کہ شامیانہ ان پر آن گرتا غیر حاضرین بن چکے تھے۔

چند اشتہار

پچھلے دنوں کے قومی ابتلا میں جس سے جو کچھ ہو سکا، اس نے دیا۔ کسی نے پیسے دیے، کسی نے کپڑے دیے۔ کسی نے مشورے دیے کہ اپنی جگہ ان کی بھی بڑی قیمت ہے۔ جس کو لکھنا آتا ہے ان میں سے کسی نے چیک لکھا، کسی نے تعویذ لکھا، کسی نے ہماری طرح کالم لکھا یا حاجی کشمیر والا کی طرح اشتہار لکھا اور زیورِ طبع سے آراستہ کرا دیا۔ ان دنوں ہماری ڈاک میں سے طرح طرح کے کتابچے، پمفلٹ، اشتہار بر آمد ہوئے۔ جن میں جنگ جیتنے کے طریقے بتائے گئے تھے۔ کچھ نظم میں، کچھ نثر میں۔ کچھ ادبِ لطیف میں جو صورت میں نثر اور سیرت میں نظم ہوتی ہے۔ لکھنے والوں

میں عابد بھی تھے، زاہد بھی تھے، ہشیار بھی تھے، خاندانی حکیم اور ڈاکٹر بھی تھے اور مایوس العلاج بیمار بھی تھے۔

قوم کا درد رکھنے والوں میں دو طرح کے لوگ ہم نے پائے۔ ایک جو آپ کو ملّت میں بری طرح یعنی پوری طرح گم کر دیتے ہیں۔ اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں۔ موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں، کے قائل ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اپنی خودی کو اسی طرح قائم رکھتے ہیں جیسے دال میں کوکرو، کباب میں ہڈی وغیرہ۔ اس وقت ہمارے سامنے چار صفحے کا ایک ٹریکٹ ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "اے عظیم قوم آفریں۔" اس کے تین صفحات تو لکھنے والے نے جو ایک ہومیو ڈاکٹر ہے، قوم کی نذر کیے ہیں۔ چوتھے پر کچھ اپنا خیال بھی رکھا ہے کیونکہ قوم آخر افراد ہی سے بنتی ہے۔ افراد نہ ہوں گے تو قوم کہاں سے آئے گی۔ پہلے تین صفحات کا مضمون وہی ہے جس سے آپ آشنا ہیں۔ اس میں

بھنور سے لڑو تند لہروں سے الجھو

نہیں شان مومن کنارے کنارے

وغیرہ قابلِ قدر اور ولولہ انگیز اشعار بھی ہیں اور ہمارے شاندار ماضی سے مثالیں بھی۔ تیسرے صفحے تک پہنچتے پہنچتے لکھنے والا (ہومیو ڈاکٹر رجسٹریشن نمبر ۲۳۲۸۶) دشمنوں کو للکارتا اور مومنوں کو پکارتا اس قسم کے اشعار پر آگیا ہے۔

اے اہلِ ہند خوف سے تھراؤ ہمارے

ہم جوش میں آکر نہ کہیں خون بہادیں

بے شک ان اشعار میں وزن نہیں ہے اور اگر ہے تو کم ہے۔ لیکن جنگ کے دنوں میں تو ریلوے والے تک ٹریول لائٹ یعنی کم وزن والے کو سفر کرنے کی ہدایت کرنے لگتے ہیں۔ یہ تو پھر شاعری ہے۔

چوتھے صفحے کی شان البتہ الگ ہے۔ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔ قبلہ ہومیو ڈاکٹر صاحب نے چوتھا صفحہ شروع تو "عزیز ہم وطنوں" کی سرخی ہی سے کیا ہے اور آغاز میں فرمایا ہے کہ اس ہنگامی دور کا تقاضا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی جگہ دشمن کے لیے نا قابلِ تسخیر مورچہ بن جائے لیکن اس کے بعد مطلب کی طرف گریز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”ہمیں دشمن سے مقابلے کے لیے اپنی قوم میں زیادہ سے زیادہ صحتمند افراد کی ضرورت ہے۔ آپ کو کیا بیماری ہے اور کب سے ہے؟ آپ اپنی پہلی فرصت میں خاکسار کے الحمد شفا خانہ (شہر کا نام ہم نہیں لکھتے) سے علاج کرا کر تندرست ہو جایئے۔“

یعنی جو بات محمود غزنوی، غوری اور ابدالی کے حوالوں سے شروع ہوئی تھی آخر میں ڈاکٹر صاحب قبلہ کی ذات والا صفات پر آکر ختم ہوئی۔

ہمارے لیے یہ اشتہار مصرع طرح کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ خالی ڈاکٹر صاحب موصوف ہی نہیں، ہماری قوم میں دردِ دل رکھنے والے اور بھی لوگ موجود ہیں۔ دردِ دِل سے ہماری مراد اس درد سے نہیں جس کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے الحمد شفا خانے سے رجوع کرنے کی ضرورت پڑے بلکہ مراد جذبے سے ہے۔ تو بس لیجئے اب یہ پانی چلا۔

ا۔ میرے عزیز ہم وطنو۔ ہم اتنے سال سے آپ کو للکار کر اپنے کینہ ور ہمسائے کے عزائم سے آگاہ کرتے رہے ہیں اور فلاح کا راستہ دکھاتے رہے ہیں۔ لیکن آپ لہو و لعب میں پڑے رہے، کبھی ادھر توجہ نہ کی۔ اب تو

آپ کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ اگر نہ کھلی ہوں تو ہمارے ہاں سے سرمہ نورِ چشم رجسٹرڈ منگا کر استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔ دھند، ککرے، سفید موتیا، کم نظری، بد نظری، آشوبِ چشم، آشوب زمانہ وغیرہ کا شرطیہ علاج ہے۔ مسلسل استعمال سے عینک بھی چھوٹ جاتی ہے بشرطیکہ لگی ہوئی ہو۔ قیمت چھوٹی شیشی پانچ روپے، بڑی شیشی نو روپے، محصول ڈاک معاف۔۔

۲۔ شریمتی اندرا گاندھی نے پاکستان پر زیادتی کرنے کا جو الزام لگایا ہے اسے سن کر ہمیں بے اختیار ہنسی آئی۔ شریمتی جی خود آپ کا دامن جارحیت کے دھبوں سے آلودہ اور داغدار ہے۔ پہلے اس کی طرف توجہ دیجئے۔ یہاں بسبیل تذکرہ ہم عرض کر دیں کہ جارحیت کے تو خیر نہیں، باقی ہر طرح کے داغ دھبے پان کے، اچار کے، سیاہی کے، ہماری دلکشا لانڈری بڑا میدان ناظم آباد میں گارنٹی سے دور کیے جاتے ہیں۔ ڈرائی کلیننگ کے علاوہ سوتی کپڑوں کی بکفایت دھلائی کا بھی معقول انتظام ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ ۲۴ گھنٹے میں واپسی، پانچ روپے کے واؤچر پر ڈائری مفت۔

۳۔ شری سورن سنگھ جی جنگ میں پہل کرنے کا الزام پاکستان کو دیتے ہیں۔ اس کا سلسلہ تارکینِ وطن سے ملاتے ہیں۔ یہ محض موشگافی ہے اور اس موشگافی کی حقیقت ہم سے بہتر کسے معلوم ہو گی۔ ہمارا خاندانی ہیر کٹنگ سیلون قیامِ پاکستان سے پہلے سہارنپور میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر چکا تھا۔ یہاں بھی خلیفہ امام الدّین مضطرؔ کی سرپرستی میں جو ایک خوشگوار شاعر بھی ہیں اور بے ضرر ختنے کے ماہر بھی، یہ خوش اسلوبی سے اپنے سرپرستوں کی خدمت کر رہا ہے۔ شیو، ہیر کٹنگ اور شیمپو کے دام مناسب لیے جاتے ہیں اور حمام کا بھی انتظام ہے۔

۴۔ شکست و فتح تو قسمت سے ہے۔ بھارت کو اپنی کامیابی پر اتنا بھی نہ اترانا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ اسے مسلمانوں کے ہاتھوں کھیم کرن میں جوتے پڑ چکے ہیں اور چند صدیاں پہلے پانی پت کے میدان میں جوتے پڑ چکے ہیں۔ خوبصورت جوتا انسان کی شخصیت کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے اور سستے اور پائیدار جوتوں کے رسیا ہمیشہ ہماری دکان قومی شو اسٹور سے

رجوع کرتے ہیں۔ زنانہ، مردانہ، طفلانہ ہر طرح کا مال موجود ہے۔
آزمائش شرط ہے۔

شادیاں بھی سلیس

کچھ ہماری زندگی اور تہذیب کا ٹریڈ مارک ہے، سمبل ہے، ہماری کوئی بات کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ ہمیں لچھے دار زبان بولنے کا شوق ہے۔ لچھے دار عبارتیں لکھنے کا شوق ہے اور لچھے دار تقریریں کرنے کا شوق ہے۔ لچھی کو بھی لچھے ہی میں شامل سمجھئے۔ بحوالہ ایک پنجابی شاعر کے۔

اگے تیرے بھاگ لچھیئے

غالب روایت شکن آدمی تھے اور اُردُو نثر کو سلیس بلکہ پانی کر گئے ہیں۔ لیکن القاب و آداب میں کبھی بھی جمیل المناقب، عمیم الاحسان وغیرہ کے لچھے وہ بھی چھوڑ

دیتے تھے۔ اس زمانے کے حساب سے یہ کچھ بھی نہ تھا کیونکہ اس عہد کی ایک کتاب پر تو نام مصنف کا نام یوں لکھا دیکھتے ہیں:

"تاثر عدیم النظیر و ناظم، فقید المثال، بذلہ سنج، نازک خیال، جلا بخش اردو زبان، اعجاز بیان جناب مرزا رجب علی بیگ سرور"

ایک عامی کے لئے اس طومار میں سے نام کی سوئی تلاش کرنا اور اس طرۂ پر پیچ و خم نکالنا ایسا آسان کام نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اصل نام خدا بخش نہیں۔ جب مولا بخش اور خدا بخش اور پیر بخش نام ہو سکتے ہیں تو جلا بخش کیوں نہیں۔ عدیم النظیر اور فقید المثال بھی بھلے مانسوں کے نام لگتے ہیں۔ لیکن فی الحال اس لچھے کی گرہوں میں سے صرف رجب علی بر آمد ہوتا ہے۔ سرور بھی تخلص یعنی مصنّف کی اپنی ایجاد ہے۔ کیا عجب رجب علی بھی بچپن میں فقط رجبے ہی کہلاتے ہوں۔ بڑا ہو کر یہ پر سا پرس رام بنا ہو۔

اب عبارت آرائی کتابوں اور قصّوں کہانیوں میں تو متروک ہوئی۔ یہ کاروباری زمانہ ہے۔ لوگوں کے پاس دماغ سوزی اور کاو کاو کی فرصت کم ہے۔ آداب و تسلیم کا خلاصہ نکل کر "ہوا" ہو گیا ہے۔ لوگ آپ سے تم، تم سے تو ہی نہیں ابے تبے پر اتر

آئے ہیں۔ اشٹام کے کاغذوں اور شادی بیاہ کے رقعوں میں البتہ ابھی پرانی شان قائم ہے۔ شادی کے رقعوں میں بیٹی ابھی تک نور چشمی ہے۔ اگر دختر ہے تو نیک اختر ضرور ہے۔ فرزند ہے تو دلبندی کے رشتے میں بندھا ہے۔ باپ احقر اور چشم براہ ہے۔ آج کل کے نئے پڑھے لکھے تو احقر کو بھی نام سمجھتے ہیں اور نیک اختر جو ویسے دختر کا تابع مہمل یا غیر مہمل ہے صاف کسی لڑکی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اُردُو میں ابھی اس قسم کے سیدھے سید رقعوں کا رواج نہیں ہوا کہ "اے صاحب۔ فلاں تاریخ، فلاں وقت میری بیٹی کی شادی ہے۔ آیئے اور نیوتہ دیجئے، تحفہ دیجئے اور خالی ہاتھ لٹکاتے ہوئے مت آیئے۔ ہم نے تمبو شامیانے کا سخت انتظام کیا ہے۔ دیگیں پکی ہیں۔ گوشت روٹی کھا کر جایئے۔ کیونکہ آپ نے ہمیں بھی کھلائی تھی" وغیرہ۔ پنجاب والے ہمیشہ دوسروں سے نسبتاً کم سر گشتہ خمار رسوم و قیود رہے ہیں۔ ایک پرچے نے کسی صاحب کی شادی کے کارڈ کا مضمون نقل کیا ہے جو راوی اور چناب ہی نہیں بیاس کے پانی میں بھی دھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یوں کہیے ابھی پوری طرح نچوڑا بھی نہیں گیا۔ نقل مطابق اصل:

"سچے سجنوں تے مترو۔ شالا تسیں رب دیاں رحمتاں تلے پھلو تے پھُلّو۔

ساڈے لاڈلے پتر۔۔۔۔۔۔۔ داویاہ لاڈلی دھی۔۔۔۔۔۔ دے نال۔۔۔۔۔ ہونا ایں۔

تسیں وی خوشیاں وچ رَل کے تے دعاواں دی سانجھے پا کے ساڈاماں تے پت ودھاؤ۔

آیاں اگے اکھیاں وچھان والے۔"

امابعد "ویلے دی ونڈ" یعنی تقسیم الاوقات یا ٹائم ٹیبل کے عنوان تلے درج ہے۔

"سہرے دیاں لڑیاں سجان داویلا۔۔۔۔۔۔۔۔

جنج دے ٹرن داویلا (روانگی برات)

لاڑے ولوں ان پانی۔۔۔۔۔۔۔

اس آخری جملے کا مطلب ہے دولہا کی طرف سے دانا دُنکا یا آب و دانہ۔ مطلب ولیمہ۔ تھوڑی بہت پنجابی تو اپنی مادری زبان ہونے کی وجہ سے ہمیں بھی آتی ہے۔ لیکن گیانیوں والی نہیں اور ویلے دی ونڈ تو ہم نے آج ہی سنا۔ اسے ایجاد بندہ بلکہ گندہ کہتے ہیں۔ سجنوں تے مترو۔ مان نے پت (ماں تے پُت نہیں) وغیرہ پڑھ کر تو مذکورہ پرچے کے ایڈیٹر کی طرح ہمیں بھی دربار صاحب امرتسری یاد آیا۔

اردو میں بھی دعوت ناموں کو سلیس بنانے کا ایک تجربہ کیا گیا ہے جو ہمیں پسند آیا۔ آج کل نظامِ امتحان بھی بدل گیا ہے۔ ہمارے زمانے کا سا نہیں کہ لمبے لمبے جواب مضمون لکھنے پڑتے تھے۔ گزرے ہوئے بادشاہوں کی پالیسی بتانے کے علاوہ ان کی چال چلن کا سرٹیفکیٹ بھی دینا پڑتا تھا۔ یہ سوال و جواب کا زمانہ ہے۔ اس سے لیاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو مار مار کر کیا نکال دیا تھا؟ اگر آپ جواب میں فقط ''بھرُکس'' لکھ دیں تو آپ شاندار نمبروں سے پاس ہیں۔ نادر شاہ کو دیکھ کر محمد شاہ کی کیا بندھ گئی تھی؟ گھگی۔ صحیح جواب ہے شاباش۔ بیٹھ جاؤ۔ یحییٰ خاں نے قوم کو کیا بنایا؟ اُلّو۔ اس کی بجائے کبوتر یا طوطا یا کسی اور جانور کا نام لکھنا غلط ہو گا۔ آپ کے نمبر کٹ جائیں گے۔ ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔

خیر ذکر دعوت نامے کا تھا اور دعوت نامہ ہمارے ایک بہت عزیز دوست کی شادی اور لاڑے ولوں ان پانی یعنی ولیمے کا ہے۔ چونکہ یہ دن عید کے تھے اس لیے ہر کارڈ جو آتا تھا لوگ اسے عید کارڈ سمجھ کر ایک طرف ڈال دیتے تھے یا بچّوں کو دے دیتے تھے۔ اس لیے ابتدا اس اطلاع سے کی گئی ہے کہ یہ کارڈ کیا ہے۔ کس کا ہے

اور کیوں ہے اور یہ تقریب کہاں ہے۔ کس طرف کو ہے۔ کدھر ہے۔ اب مضمون ملاحظہ ہو۔

تقریب: شادی

کس کی: (نام)

کس کے ساتھ: (نام)

کہاں: آرڈیننس روڈ۔ راولپنڈی

ولیمہ: (تاریخ)۔

ولیمہ کہاں: (جگہ)

وقت: ۸ بجے شب

بظاہر اتنی عبارت کافی تھی لیکن بعض کند ذہن اور مدعوئین شاید یہ سمجھے کہ ہمیں تفریحاً اطلاع دی گئی ہے۔ لہٰذا۔۔۔۔ آخری خانہ ہے۔

توقع: خستگی کی داد پانے کی۔

لیجئے ہم غالب کی رو میں بہہ چلے۔ صحیح اندراج یوں ہے:

توقع: آپ کی شرکت۔

دولہا میاں کے والد جن کا نام اس رقعے کے نیچے الداعی یا المعلن کے طور پر درج ہے ہمارے ملک کے ایک مشہور عالمِ دین ہیں۔ دولہا البتہ بھی ایسے شوق فضول کے مالک ہیں یعنی شاعر واعر، ادیب ودیب۔ لازماً یہ رقعہ ہمارے ان دوست نے خود لکھا ہے۔ آج کل سبھی برخوردار یہی کرتے ہیں۔ بزرگوں کے علم و فضل کو بٹہ لگاتے ہیں۔ انہوں نے تو لگایا۔ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم ان بزرگ واجب الاحترام کا نام نہیں لکھتے۔ دولہا میاں کا بھی نہیں۔ تیرے پتے سے خلق کو کیوں میرا گھر ملے۔ دوسری وجہ احتیاط یہ ہے کہ رقعہ اخبار میں دیکھ کر اور تاریخ و مقام کی اطلاع پا کر لوگ جوق در جوق ولیمے میں نہ پہنچ جائیں اور ان مروّت کے ماروں پر وہ نہ گزرے جو مولوی عبد الحق مرحوم کے ہاتھوں ان کے ایک دوست پر گزری تھی۔

راوی اس کے مولوی صاحب خود ہیں۔ مذاق اور معصوم شرارت کا مادہ ان میں ہمیشہ سے تھا۔ ایک روز ان کو ایک دوست کی طرف سے جن کی جُزرسی بدرجہ بخیلی

مشہور تھی، دعوت کا رقعہ ملا۔ انہوں نے اسے پریس بھیج کر ایسے ہی دو سو رقعے اور چھپوا لیے اور اپنے جاننے والوں میں تقسیم کر دیے۔ جن کو پہنچے ان میں اکثر کی میزبان سے فقط اوپری دُعا سلام یا صورت شناسی تھی۔ اس بات پر حیرت کرتے کہ اتنی معمولی معرفت کے باوجود ہمیں یاد فرمایا بلکہ میزبان کے کریمانہ اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے ٹوپی شیروانی والے بزرگوں کا ایک جمِ غفیر رقعے جیب میں ڈال کر چھڑی ٹیکتا ان حضرت کے مشکوئے معلّٰی بلکہ کلبہ احزاں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دروازے پر کھڑے استقبال کر رہے تھے۔ ایک ایک صورت کو دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ یاالٰہی یہ کون؟ کدھر سے آگئے؟ کس نے ان کو بلایا؟ میں نے تو نہیں بلایا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور جب گنتی ناخواندہ مہمانوں کی پچاس سے گزری تو سر پیٹ لیا۔ اندر بھاگے۔ کچھ اپنی دیگوں میں پانی ڈلوایا اور سالن کا شوربہ بنایا۔ کچھ کھانا ہوٹلوں سے منگایا۔ آپ کھایا یا نہ کھایا۔ ناخواندہ مہمانوں کو پرچایا۔

ایک اور صاحب کا ذکر مولوی صاحب کی زبانی سنا۔ انہوں نے دعوت کا رقعہ بھیجا خود بھی آگئے۔ مولوی صاحب نے پوچھا کھانے میں کیا کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ

دال روٹی شوربہ خشکہ وغیرہ۔ مولوی صاحب نے کہا رقعے میں تو لکھا ہے ماحضر تناول فرمایئے۔ تو کیا ماحضر نہیں پکوا رہے۔ وہ بولے جناب دعوت کے رقعوں میں جو عبارت ہوتی ہے وہی میں نے لکھ دی۔ آگے آپ ارشاد فرمائیں۔ مولوی صاحب نے کہا ارے گھامڑ۔ ماحضر تو ایک خاص مغلئی کھانے کا نام ہے اور نسخہ اس کا بڑا پیچیدہ اور مہنگا ہے۔ اس میں بٹیر کی یخنی پڑتی ہے۔ زعفران پڑتا ہے۔ ماالّلحم کا چھینٹا دیتے ہیں۔ خمیرہ مروارید کا بگھار لگاتے ہیں۔ بہت پریشان کہ میں یہ ساراانتظام کیسے کروں گا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ اچھا اب کے تجھے معاف کیا لیکن آئندہ جو لکھو پہلے اس کے معنی معلوم کر لیا کرو۔

آپ سے ملیے

آپ سے ملیے۔ آپ کا اسم شریف ہے حکیم محمد شریف، رسالہ شرافت کے ایڈیٹر ہیں۔ پہلے امرتسر میں شریف پورہ میں رہتے تھے۔ آج کل لالو کھیت سے آگے شریف آباد میں قیام ہے۔ معجون شرافت اور شرافت منجن سے کراچی کا کون شریف آدمی واقف نہ ہو گا۔ کسی کو شرفِ ملاقات حاصل کرنا ہو تو پتہ سیدھا ہے۔ بستی میں داخل ہوتے ہی شریفے کے پیڑوں کا ایک جھنڈ نظر آئے گا۔ اسی کے ساتھ کوچہ شریفاں میں شرافت منزل سامنے نظر آئے گی۔

یہ زمانہ شرافت کا نہیں۔ چوری کہیں بھی ہو سب سے پہلے پکڑ دھکڑ ہمارے حکیم صاحب ہی کی ہوتی ہے۔ اتّفاق ایسا ہوا کہ ایک آدھ بار تلاشی ہوئی تو ان کے ٹرنکوں سے ایسا مال بر آمد ہوا جس کے متعلق حکیم صاحب کو کچھ یاد نہیں کہ کب خریدا تھا۔ کہاں سے خریدا تھا۔ انہوں نے بہت کہا کہ ان ٹرنکوں کی کنجیاں ہمیشہ میرے ازار بند سے بندھی رہتی ہیں۔ جانے کس بد معاش نے کیسے ان کو کھول کر یہ مال مجھے بدنام کرنے کے لئے ان میں رکھ دیا۔ لیکن پولیس والے کب کسی شریف آدمی کا لحاظ کرتے ہیں۔

بعض لوگ جو ہندوستان سے آئے ہیں۔ بڑی بڑ ہانکا کرتے ہیں کہ میں وہاں یہ تھا وہ تھا۔ حکیم صاحب کی طبعیت میں انکسار ہے۔ لہٰذا انہوں نے پاکستان آنے کے بعد یہاں ڈھنڈورا پیٹنا مناسب سمجھا کہ وہ بھارت میں کیا تھے۔ کس حیثیت کے مالک تھے۔ آج جب کہ بڑے بڑے سیاسی لیڈر اپنے جیل جانے کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے۔ خواہ وہ رات کی رات جیل میں رہے ہوں اور غلط فہمی رفع ہوتے ہی رہا کر دیئے گئے ہوں۔ حکیم صاحب کا اپنے لب سی رکھنا اور کسی سے ذکر نہ کرنا کہ وہ تین بار کئی کئی سال کی قید کاٹ چکے ہیں، بڑے ظرف کی بات ہے۔ حبِّ وطن کا جذبہ

ان میں ایسا تھا کہ کبھی انگریز کے قانون کی پروانہ کی۔ ایک بار نقب لگاتے پکڑے
گئے۔ انہوں نے بے خوفی سے اعلان کیا کہ انگریزوں کو زچ کرنے کے لیے ہر وطن
دوست کا فرض ہے کہ نقب لگائے یا کسی اور طرح قانون شکنی کرے۔ دوسری بار
انہوں نے انگریزوں کے بنائے ہوئے قانونِ شہادت کی خلاف ورزی کی تو غیر ملکی
حکومت نے انہیں جھوٹی گواہی دینے کے الزام میں جیل بھیج دیا۔ حالانکہ حکیم
صاحب کا کہنا تھا کہ میں نے تو ترکِ موالات کے تحت دیدہ و دانستہ سچ بولنے سے
اغماض کیا تھا۔ انگریزوں کی نظر میں یہ ہمیشہ کھٹکتے رہے۔ ایک بار گاڑی میں سفر کر
رہے تھے۔ ایک انگریز بھی اسی ڈبّے میں تھا۔ تھوڑی دیر میں اس نے شور مچا دیا کہ
میری گھڑی کہاں گئی۔ سبھی نے تلاش کرنا شروع کیا۔ حکیم صاحب نے بھی ڈبّے
کہ ایک ایک آدمی کی تلاشی لی اور ڈرایا دھمکایا لیکن کسی نے اقبالِ جرم نہ کیا۔ اس
بدتمیز انگریز نے بجائے اس کے کہ ان کا شکریہ ادا کرتا ان کی تلاشی لینے پر اصرار
کیا۔ اور سوئے اتّفاق سے وہ گھڑی ان کی جیب سے نکلی وہاں کیسے چلی گئی۔ حکیم
صاحب آج تک حیران ہیں۔ نہ یہ گھڑی کا عقدہ آج تک حل ہوا نہ یہ کہ ان کی
دوسری جیب سے ایک اور مسافر کا جو فونٹین پین نکلا وہ کیسے وہاں آگیا۔

(۲)

میر رئیس الدّین کا تعارف ہم سے ہمارے دوست میاں نیک محمد نے کرایا تھا۔ نیک محمد صاحب کا سا نیک نفس آدمی کہیں نہ ملے گا۔ نہ کسی کی برائی کر سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔ ایک بار کسی نے ان کے سامنے شیطان کو برا کہہ دیا تھا۔ اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے کہ شیطان کو بُرا کیوں کہو۔ اچھا مرے آگے اس کی خوبیوں پر بھی نگاہ کرو۔ دنیا کے اتنے آدمی اس کے ہاتھ پر بیعت ہیں۔ اس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں تو یہ بے وجہ نہیں ہو سکتا۔ ضرور اس میں کچھ خوبیاں بھی ہوں گی۔

میر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے میاں نیک محمد نے کہا کہ انہیں اپنے ہاں نوکر رکھ لیجئے۔ ضرورت مند ہیں۔ ہندوستان میں تھے تو پوتڑوں کے رئیس تھے۔ در پر ہاتھی جھولتے تھے اور ان کا دستر خوان بہت وسیع تھا۔ آج اس حال میں ہیں ورنہ ان کا قلم ہزاروں پر چلتا تھا۔

میاں نیک محمد صاحب کی ایک نیکی یہ ہے کہ جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔ لہٰذا میر صاحب کو ہم نے اپنی کمپنی میں منشی رکھ لیا۔ لیکن چند ہی روز میں ان کی خوبیاں ہم

پر کھلنے لگیں تو ہم نے میاں نیک محمد سے کہا کہ سودا آجو ترا حال ہے ایسا تو نہیں، وہ کیا جانئے تو نے اسے کِس آن میں دیکھا۔ آپ تو انہیں پوتڑوں کا رئیس بتاتے تھے۔ بولے تم ادیب آدمی ہو۔ میری بات کو محاورہ سمجھے۔ بھئی ہم نے تو ہمیشہ ان کے گھر میں پوتڑے سوکھتے دیکھے۔ اس لحاظ سے کہا تھا۔

اب ہم نے کہا وہ دروازے پر ہاتھی جھولنے والی بات؟ فرمایا۔ ہمارے میر صاحب کا دولت خانہ کانپور میں چڑیا گھر کے پاس تھا۔ وہاں سے ہاتھی مٹر گشت کرتے ہوئے نکلتے اور ان کے گھر کے سامنے آکر جھولنے لگتے۔ انہوں نے کئی بار چڑیا گھر والوں سے شکایت بھی کی کہ ان کو باندھ کر رکھا کیجئے۔ میرے گھر کے سامنے آکر گندگی پھیلاتے ہیں۔

ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کا دستر خوان بڑا وسیع تھا۔ ہم نے تو ایسا ندیدہ اور خسیس آدمی کبھی نہ دیکھا۔

فرمایا، اس بات کو بھی آپ استعارے میں لے گئے تو میرا کیا قصور۔ بے شک جز رس آدمی ہیں۔ آج تک کبھی دستر خوان نہ خریدا۔ بستر کی چادر سے دستر خوان کا کام لیتے تھے اور اس کے ایک طرف اکیلے بیٹھ کر چٹنی سے روٹی کھاتے تھے۔

آخر میں ہم نے کہا وہ جو آپ نے کہا تھا کہ ہزاروں پر ان کا قلم چلتا تھا اس کا مطلب بھی کچھ دوسرا ہی ہو گا۔

بولے۔ وہ بھی کچھ جھوٹ نہیں، ہمارے میر صاحب ڈاک خانے کے سامنے بیٹھ کر لوگوں کے منی آرڈر لکھا کرتے تھے۔ جانے کتنے ہزار روپے روز کے منی آرڈر ان کے ہاتھ سے نکلتے ہوں گے۔

(۳)

"یہ میرے دوست ہیں بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی فرم میں جگہ مل سکے تو۔"

"کس قسم کی جگہ؟"

"منشی رکھ لیجئے۔ جو شاندے کوٹنے چھاننے کا تجربہ رکھتے ہیں لہٰذا آپ کے ہاں میڈیکل افسر بھی ہو سکتے ہیں۔ علمِ نجوم میں بھی دخل ہے۔ آپ کے اسٹاف کے ہاتھ دیکھ دیا کریں گے۔"

"کیا نام ہے؟"

”سید فصاحت حسین“

”والد کا نام؟“

”جے کے جنجوعہ۔ جھنڈے خاں جنجوعہ۔“

”کیا کرتے ہیں ان کے والد؟“”جی ان کے والد زندہ ہوتے تو ان کو کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بے چارے یتیم ہیں۔ ان کے والد ان کی پیدائش سے کئی سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔“

”والدہ۔“

”جی ان کا سایہ بھی ان کی پیدائش سے دو سال قبل ان کے سر سے اُٹھ گیا تھا۔“

”اور رشتہ دار تو ہوں گے۔“

”جی نہیں۔ اور رشتہ دار بھی کوئی نہیں کیونکہ ان کے دادا لاولد مرے اور پر دادا نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ یہ تنہا ہیں اس بھری دنیا میں۔“

”کیا کرتے ہیں؟“

”حال ہی میں سات سال کی طویل اقامت کے بعد جیل سے رہا ہوئے ہیں۔ وہ تو اب آ کر ان پر وقت پڑا ہے تو نوکری تلاش کر رہے ہیں۔ ورنہ روپوں میں کھیلتے تھے۔“

”کیا کرتے تھے؟“

”بس دستکاری، اپنے ہاتھ کی محنت کا کھاتے تھے۔ اپنے فن میں وہ دستگاہ بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے ان کے آگے کان پکڑتے تھے۔ وہ تو ان کا ایک شاگرد کچّا نکل گیا۔ اوچھا ہاتھ پڑا اس کا۔ بٹوے میں سے کچھ نکلا بھی نہیں اور اس کی نشاندہی پر فصاحت صاحب مفت میں پکڑے گئے۔“

”ہمارے ہاں نوکری کے لیے چال چلن کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔“

”وہ ہم داروغہ جیل سے لے لیں گے۔ نیک چلنی کی بنا پر ان کو سال بھر کی چھوٹ بھی تو ملی تھی۔ اس کا سرٹیفکیٹ بھی موجود ہے۔“

”تعلیم کہاں تک ہے؟“

”اجی تعلیم۔ یہ آج کل کے اسکولوں کالجوں میں جو پڑھایا جاتا ہے وہ تعلیم ہوتی ہے کیا؟ ہم نے بڑے بڑے میٹرک پاسوں اور ڈگریوں والوں کو دیکھا ہے۔ گنوار کے گنوار رہتے ہیں۔“

”اچھاتو فصاحت حسین صاحب آپ عرضی لائے ہیں نوکری کے لئے؟“

”جی لایا ہوں۔ یہ لیجئے۔“

”پڑھ کے سنایئے“

”جی میں عینک گھر بھول آیا ہوں۔“

”اچھاتو دیجئے۔ اس پر دستخط تو آپ نے کیے ہی نہیں، اور یہ کیا سیاہی کا دھبّہ ڈال دیا ہے درخواست کے نیچے“

”حضور یہ دھبہ نہیں ہے۔ میرا نشانِ انگشت ہے۔ دیکھیے نا بات اصل میں یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔“

ایک سپاسنامہ۔ ایک بے لوث کارکن کی طرف سے

"جناب والا پاکستان کے بے لوث کارکنوں کی جماعت انجمن بے لوث کارکنانِ پاکستان (رجسٹرڈ) تہہ دل سے جناب والا کا خیر مقدم کرتی ہے۔ جناب والا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام محب وطن پاکستانی مل کر حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔ چنانچہ انجمن ہٰذا بھی خلوصِ دل سے موجودہ حکومت کے ہاتھ اس طرح مضبوط کرنے کو تیار ہے، جس طرح پیش ازیں صدرِ ایوب کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے۔ صدر یحییٰ کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہے بلکہ ہر حکومت کے ہاتھ مضبوط کرتی رہتی ہے۔

جناب والا۔ ہماری انجمن کی ایک خصوصیت حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے علاوہ میدان میں کود پڑنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم اپنے محبوب صدر کے ادنیٰ اشارے پر میدان میں کود پڑنے کو تیار ہیں بشرطیکہ میدان میں یہاں سے وہاں تک روئی کے گدّے، نہالچے اور غالیچے بچھا دیے جائیں۔ ان کے بغیر میدان میں کودنا گزند کا باعث ہو سکتا ہے۔ چوٹ آسکتی ہے۔ جو ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر مناسب نہیں ہے۔

جناب والا۔ انجمن ہٰذا یعنی انجمن بے لوث کارکنان پاکستان (رجسٹرڈ) کے دروازے سب پر کھلے ہیں۔ کیونکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہے۔ پہلے تھا لیکن اس کو کارکنان مذکور ہاتھوں ہاتھ اٹھا لے گئے۔ اب فقط دروازے کا سائن بورڈ باقی ہے جسے انجمن ہٰذا بخوشی قوم کی نذر کرنے کو تیار ہے۔ یہ مضبوط شیشم کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اس پر دھوبی کپڑے پٹخ سکتے ہیں۔ جو دھوبی نہیں وہ سر پٹخ سکتے ہیں۔ غسّال مردے نہلا سکتے ہیں بلکہ مردے اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت آپ نہا سکتے ہیں۔

جناب والا۔ انجمن ہٰذا کے سبھی کارکنان پرلے درجے کے بے لوث کارکن ہیں۔ ان سے کوئی ان کی خدمت کے صلے کی بات کرے تو مارنے کو دوڑتے ہیں۔ یہ خاکسار

میاں فقیر محمد سیکرٹری جنرل انجمن ہٰذا بالخصوص فقیر منش آدمی ہے۔ اسے آپ سے کوئی خواہش نہیں ہے سوائے عہدے کی خواہش کے اور کسی قسم کا لالچ نہیں سوائے روپے کے لالچ کے۔ گزشتہ حکومتوں نے خاکسار کو خریدنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں خرید سکے۔ پہلے وزارت پیش کی گئی، خاکسار نے اس پر لات مار دی۔ پھر سفارت پیش کی گئی۔ خاکسار نے اس پر بھی لات مار دی۔ خاکسار دولت پر لات مار چکا ہے۔ ثروت پر لات مار چکا ہے۔ شہرت پر لات مار چکا ہے۔ اور بھی کئی چیزوں پر لات مار چکا ہے جو اس وقت یاد نہیں۔ افسوس اب یہ لات اس قابل نہیں رہ گئی کہ مزید کسی چیز پر ماری جا سکے۔ لات مارنے کی عادت سے مجبور ہو کر اس خاکسار نے ایک کتے کے بھی لات مار دی تھی۔ وہ محاورے نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اس جذبہ ایثار کی قدر نہ کی۔ جواب میں دانت مار دیے۔ آدمیت سے بعید حرکت کی۔

جناب والا۔ جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا، خاکسار کو آپ سے یا حکومت سے کسی قسم کی غرض نہیں ہے۔ تاہم خاکسار کو شہر کی مین مارکیٹ میں جو زیرِ تعمیر ہے، کونے والی بڑی دکان الاٹ کر دی جائے تو خاکسار کا قوم کی بے لوث خدمت کا جذبہ روز

افزوں ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ انجمن ہٰذا کی عہدہ داری کے علاوہ جسے خاکسار ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا حرام سمجھتا ہے۔ خاکسار کا چھوٹا سا ذاتی کاروبار بھی فقیر اسٹون ورکس کے نام سے ہے۔ ہمارے محبوب صدر نے پچھلے دنوں فرمایا ہے کہ ہمیں محنت کرنی چاہیے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی محنت کرنی چاہیے۔ لٰہذا خاکسار کی فرم نے لوگوں کو پیٹ پر باندھنے کے لیے پتھر بارعایت نرخوں پر سپلائی کرنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ پتھر منگھو پیر کی پہاڑی کے ہیں لٰہذا مضبوط ہونے کے علاوہ روحانیت سے بھرپور اور خیر و برکت سے معمور ہیں۔ یہ پتھر پیٹ پر باندھنے کے علاوہ اور بھی کئی کام آسکتے ہیں۔ محبوب لوگ ان سے سنگ آستاں بنواتے ہیں اور اس پر عاشق لوگوں سے جبیں گھسواتے ہیں، ناک رگڑواتے ہیں۔ ناک اور جبیں کے علاوہ ان پر ہلدی اور مرچ بھی بخوبی پیس سکتے ہیں۔ خودکُشی کے لیے بھی ہمارے ہاں کے پتھر آزمودہ ہیں۔ جو کوئی ان کو اپنے ساتھ باندھ کر دریا میں کودا پھر پانی کی سطح پر نہ ابھرا۔ ظالم سماج ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ خودکُشی کرنے والوں کے بے شمار تصدیقی سرٹیفکیٹ ہمارے پاس موجود ہیں کہ ہم کو ایک ہی پتھر سے فائدہ ہوا۔ قیدِ حیات و بندِ غم سے نجات مل گئی۔ اب چند پتھر فلاں فلاں حضرات کو ہماری طرف

سے بھیج دیجئے۔ دکان سے دریا کے پل تک پتھر پہنچانے کا خرچ ہم اپنے پلے سے دیتے ہیں، گاہک سے چارج نہیں کرتے۔

جناب والا جانے کس شاعر نے کہا ہے لیکن خوب کہا ہے کہ اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔ واقعی ساری خرابیوں کی جڑ رزق یعنی غلّہ وغیرہ ہے۔ اس وقت ہماری قوم کو غلّے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ پتھروں کی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ ہمارے ایک بزرگ جن کا نام میں اس وقت بھول رہا ہوں دانہ گندم کی وجہ سے جنّت سے نکالے گئے۔ آج تک کوئی پتھروں کی وجہ سے نہیں نکالا گیا۔ شاعر مذکور نے جو رزق سے موت کو بہتر بتایا ہے تو اس کی وجہ ہے۔ مرنے والے کے مزار پر ہماری دکان کے مضبوط اور خوب صورت پتھر لگائے جا سکتے ہیں، کسی زندہ آدمی کے مزار پر نہیں۔ جس نے ایک بار اپنی قبر پر ہمارے ہاں سے پتھر کی تختی لگوائی ہمیشہ کے لیے ہمارا گرویدہ ہو گیا۔ جناب والا ایک لوح مع قطعہ تاریخ ہم آپ کی نذر بھی کرتے ہیں۔ وقت آنے پر کام آئے گی۔ گر قبول افتد۔۔۔

کچھ اور ٹکٹ کچھ اور امیدوار

ہم نے اس روز ریلوے کے ریٹائرڈ گارڈ میر دلدار علی سندیلوی کا ذکر کیا تھا جن کو صوبائی اسمبلی کے لیے کسی اور پارٹی کا ٹکٹ نہ ملا تو ریلوے کے ٹکٹ پر ہی کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ غالباً ریٹرن ٹکٹ ہو گا جس میں فائدہ یہ ہے کہ آدمی اور کچھ نہیں تو اپنے گھر تو واپس آ سکتا ہے۔ دو ٹکٹوں والوں کا تو یہ دیکھا ہے کہ بعض اوقات نہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ پروگرام میر صاحب قبلہ کا ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں۔ میر صاحب کے طویل تجربے کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی کریں گے لیکن انہیں کچھ اور چوکسی اور

مستعدی دکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ ہو کہ مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتے کرتے خود اتنے لیٹ ہو جائیں کہ

ع گاڑی نکل چکی ہو

پٹڑی چمک رہی ہے

میر صاحب مذکور کی الیکشن مہم آج کل چھکا چھک جاری ہے۔ تقریر میں ایسا فراٹا بھر رہے ہیں کہ بڑے بڑے جنکشن منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بیچ میں فقط ایک آدھ جگہ رکتے ہیں، وہ بھی پانی لینے یعنی پانی پینے کے لیے۔ ان کی ایک آدھ تقریر ہم نے بھی سنی ہے۔ فرمایا آپ نے۔

''حضرات یہ دنیا مسافر خانہ ہے۔ ہم سب یہاں پسنجر کے موافق ہیں۔ پس جتنے دن زندگی کی گاڑی چلتی ہے محبت اور اخوّت کا سگنل ڈاؤن رکھنا چاہیے اور نفرت و عناد کو ہمیشہ لال جھنڈی دکھانی چاہیے۔'' غریب اور امیر کا ذکر کرتے ہوئے میر صاحب نے کہا کہ ''اس وقت ہمارے معاشرے میں بڑی ابتری ہے۔ فرسٹ اور سیکنڈ

کلاس کے لوگ تو عیش کی سیٹیاں بجاتے ہیں، ہم انٹر کلاس اور تھرڈ کلاس لوگ جوتیاں چٹخاتے ہیں۔۔۔۔؟"

حاضرین میں سے کسی نے نعرہ لگایا کہ اسلام خطرہ میں ہے۔ میر صاحب ترنت بولے۔ "اسلام خطرے میں نہیں ہے۔ بار بار خطرے کی زنجیر مت کھینچو۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔ جرمانہ دینا پڑے گا۔"

ریلوے کا سنا تو ایک صاحب پی آئی اے کے ٹکٹ پر کھڑے ہو گئے۔ آج کل اس قسم کی تقریریں کر رہے ہیں۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین سلاما لیکم۔ کیپٹن فلک شیر آپ کو الیکشن پرواز ۱۹۷۰ء پر خوش آمدید کہتا ہے۔ اپنے حفاظتی بند باندھ لیجئے اور سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں۔ ہم بیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اور خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے انشاء اللہ مہینہ بھر میں اسمبلی چیمبر میں جا اتریں گے۔ راستے میں دہنی طرف اچھرہ موڑ آئے گا اور بائیں طرف لاڑکانہ کے پیپلوں کے جھنڈ پڑیں گے۔ ہم ان کو بے نیازانہ دیکھتے ہوئے گزریں گے۔ امید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرے گا۔ دھنیہ باد، شکریہ، تھینک یو۔"

ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل کرنا ایسا آسان نہیں۔ ریلوے کی کھڑکی پر بھی کبھی کبھی رش ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہمارے کرم فرما خان بنارس خان نے لانڈھی سے او منی بس کے ٹکٹ پر کھڑے ہونا پسند کیا ہے۔ انہوں نے الیکشن کی مہم کا آغاز کرتے ہوئے اپنے کارکنوں اشارہ کیا ہے کہ "جانے دوس" اپنی تقریر کا آغاز وہ ہمیشہ کسی نہ کسی شعر سے کرتے ہیں۔ "آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ سامان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں۔" ان کا نعرہ ہے کہ "ہارن دے کر پاس کریں۔" اور تقریر کا انداز یہ ہے۔

"بائیو۔ اوپر آجاؤ۔ پائیدانوں پر مت کھڑے ہو۔ جیب پاکٹ سے ہوشیار۔ آج کل ووٹ کترے بہت ہو گئے ہیں۔ ہاں تو بائیو تم اَم کو سیٹ پر بٹھاؤ۔ اَم تم کو سیٹ پر بٹھائے گا۔ کسی کو کھڑا نہیں رکھے گا۔ ہمارے ہاں پارٹیاں بہت ہیں لیکن سب دھواں چھوڑ رہی ہیں۔ امیدواروں میں کسی کا بریک نہیں ہے۔ بولنا شروع کرتا ہے تو رکتے رکتے بھی آدھ گھنٹہ اور لگا دیتا ہے۔ کسی کی باڑی پرانی ہے۔ بعضوں کے تو سائلنسر ہی کام نہیں کرتے جیسے ہمارے اوکاڑہ والے مولوی صاحب کے۔ پس اَم کو ووٹ دو۔۔۔ ارے اُٹھ کر کدھر جاتا ہے، ابھی ہمارا تقریر کہاں ختم ہوا ہے۔"

ہر بشر کو ہے یہ لازم صبر کرنا چاہیئے

جب کھڑی ہو جائے گاڑی تب اترنا چاہیے

اتفاق سے ایک ٹکٹ ڈاک کا بھی ہوتا ہے۔ بابو محمد دین سابق پوسٹ ماسٹر کو اس پر کھڑے ہونے میں سہولت نظر آئی۔ ان کی تقریر بھی ہم نے سنی ہے۔

"محترم حضرات! السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ آپ سب کو ہمارا درجہ بدرجہ سلام پہنچے۔ ہمارے تھیلے میں باتیں تو بہت ہیں لیکن سارٹ کر کے فقط چند ایک آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ یہ جتنے امیدوار ہیں سب کے دلوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی باتیں محض لفافہ ہیں، اندر کچھ بھی نہیں۔ کسی کا پتہ نہیں کہ کب بیرنگ ہو جائے یا پوری قوم کو ڈیڈ لیٹر آفس دھکیل دے۔ ووٹر حضرات سے التماس ہے کہ میرے خط کو تار سمجھیں یعنی میری گزارشات پر توجہ فرمائیں اور پولنگ کے روز اپنے اپنے ووٹ قریب ترین لیٹر بکس میں ڈال دیں۔ باقی سب خیریت ہے۔ والسلام" متوالا کا نام تو آپ نے سنا ہو گا۔ فلمی دنیا کی شخصیت ہیں۔ یہ بھی الیکشن میں کھڑے ہیں اور ان کے پاس سینما کا ٹکٹ ہے۔ اپنی تقریر کا مکھڑا عموماً

کسی فلمی گیت سے باندھتے ہیں۔ مثلاً ”اے دیکھنے والے دیکھ کے چل۔ ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں۔“ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

”حضرات! قوم کی خدمت کرنا آسان کام نہیں لیکن میں یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا ہوں کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ اور چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا؟ کھڑا ہونا میرا کام تھا۔ اب مجھے ممبر بنانا آپ کا کام ہے۔ یعنی اب یہ تہاڈی عزّت دا سوال اے۔

صاحبان! آپ کے پاس طرح طرح کا امیدوار آئے گا۔ طرح طرح کی ایکٹنگ کرے گا اور ڈائیلاگ بولے گا۔ ان سے ہوشیار۔ ان کے رونے گانے پر نہ جایئے گا۔ سب پلے بیک ہے۔ خاکسار کی پوری عمر قوم کی خدمت میں ریہرسل کرتے گزری ہے۔ اب تو اسے قومی ہیرو بننے کا موقع ملنا چاہیے۔ آپ اس شیر اں دے پتر شیر کو ووٹ نہ دیں گے تو اور کسے دیں گے؟“

ایک روز ان کے جلسے میں ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کوئی اعتراض کرنا چاہا۔ آپ نے فوراً آواز لگائی، ”کٹ“ وہ وہیں بیٹھ گیا۔

خان شیر خان گاندھی گارڈن کے علاقے سے کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے پاس چڑیا گھر کا ٹکٹ ہے۔ ان کی تقریر بھی سننے کی ہوتی ہے۔

”صاحبان آج کل ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ دھاڑ رہا ہے۔ چنگھاڑ رہا ہے۔ لیکن ہاتھی کی طرح ان کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور۔ قوم کے لیے قربانی دینے کا وقت آئے گا تو سب کو سانپ سونگھ جائے گا۔ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں گے۔ دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔ یاد رکھیے ان لوگوں کا آگا شیر کا اور پیچھا بھیڑ کا ہے۔ بگلا بھگتوں کو ووٹ مت دیجیے۔ خاکسار کو دیجیے کہ شاہیں را ملند است آشیانہ۔“

سب سے مختصر تقریر مرزا برکت اللہ بیگ کی ہوتی ہے۔ یہ لاٹری کے ٹکٹ پر کھڑے ہیں۔

”بھائی صاحبان۔ میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے ووٹ دیجیے اور اسمبلی میں پہنچا دیجیے۔ اس کے بعد میں آپ کی خدمت کرتا ہوں یا آپ کو دغا دیتا ہوں۔ یہ آپ کی قسمت کی بات ہے۔“

چند مطالبات

ہڑ تال کا رواج تو پرانے زمانے سے چلا آ رہا ہے لیکن اس حد تک کہ رانی اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ جاتی تھی۔ جب تک راجہ اس کے بیٹے کو راج پاٹ اور سوکن کے بیٹے کو بن باس نہ دے دیتا تھا۔ یہ انڈسٹری آج کل کے زمانے میں بنی ہے، آقا اور غلام، سیٹھ اور نوکر کا رشتہ بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ صاحب میری تنخواہ بڑھا دیجئے ورنہ۔ سیٹھ نے گرج کر کہا۔ "ورنہ کیا؟" تو اس نے سر جھکا کر کہا۔ "ورنہ اسی تنخواہ پر کام کرتا رہوں گا۔" فی زمانہ اسی تنخواہ پر کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ورنہ کے بعد تو ہڑتال ہے۔ اگر ورنہ نہ ہو تب بھی ہڑتال۔ ایک کارخانے کا مالک

زیادہ ہی اچھا تھا۔ جو مزدور کہتے تھے جھٹ مان لیتا تھا۔ مزدور بہت مایوس ہوئے۔ اس لیے کہ آس پاس کے سارے کارخانوں میں ہڑتال ہو جاتی تھی اور یہ نکّو بنتے تھے۔ آخر انہوں نے ایک روز ہڑتال کر ہی دی کہ یہ بڑا چالاک قسم کا سرمایہ دار ہے۔ مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔

ہڑتالیں بھی کئی قسم کی ہیں۔ قلم چھوڑ ہڑتال، قلم توڑ ہڑتال، قلم مروڑ ہڑتال۔ ایک دفتر میں ہڑتال ہوئی تو کلرک صرف جانگیا پہن کر دفتر آنے لگے۔ یونین کے کچھ لوگ تو جانگیا پہننے کے بھی خلاف تھے۔ اسے بورژوائی عادت قرار دیتے رہے تھے۔ لیکن اس کو ترک کرنے پر قانون کی ایک دوسری اور غیر متعلق دفعہ میں ماخوذ ہونے کا خطرہ ہے۔ دوسری طرف ایک نائٹ کلب میں ہڑتال ہوئی تو یوں کہ مہمانوں کی تالیفِ قلب کے لیے ناچنے والی بیبیوں نے کپڑے اتارنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ پورے بازوؤں کی قمیصیں اور دوپٹے پہن کر آ گئیں۔ کپڑوں کا تو خیر یہ ہے کہ جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے۔ ہماری یا بقول شخصے کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے لیکن اس شغل شریف کے اور بھی رنگارنگ پہلو ہیں۔ مثلاً یہی کہ ہر کوئی اپنی اپنی بولی الگ بولتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو!

لانڈری کے نام

ہم نیو انٹر نیشنل پنجاب لانڈری وڈرائی کلینرز کے مالکان کو خبر دار کرتے ہیں کہ وہ اپنی گندی ذہنیت ترک کر دیں۔ ان کا وجود دھوبی برادری کے دامن پر دھبّہ ہے۔ ان کی گردنیں کلف لگے کپڑے کی طرح اکڑی رہتی ہیں۔ کام کرتے کرتے ہمارے چیتھڑے اُڑ گئے لیکن ان کے مزاج کا سوڈا کاسٹک ابھی تک نہیں گیا۔ ہماری مثال اتنے برس کی نوکری کے بعد بھی وہی ہے کہ دھوبی کا کتّا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

عمارتی ٹھیکیدار کے نام

ہم اینٹ بخش گاراخاں عمارتی ٹھیکیداران لمیٹڈ کے مزدور متحد ہو کر اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے مطالبات فوری طور پر منظور نہ ہوئے تو ہم مالکان کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ بلکہ ان کا بھٹہ بٹھادیں گے۔ ہم مزدور معاشرے کا ستون ہیں۔ بلکہ وہ بنیاد ہیں جس پر معاشرے کی پوری دیوار کھڑی ہے۔ ہم نہ ہوں تو یہ اُڑا اُڑا دھم کر جائے گا۔ اب خالی لیپا پوتی سے کام نہیں چلے گا۔ ہماری پگار بڑھنی چاہیے۔

ٹیچروں کی طرف سے

عرض یہ ہے کہ محنت اور دیدہ ریزی نے ہمارا عادِ اعظم اور ذو اضعافِ اقل نکال دیا ہے۔ اگر ایک حوض کو ایک نالی دو گھنٹے میں پُر کرے اور دو نالیاں اسے ایک گھنٹہ میں خالی کر دیں تو اس حوض کی جو حالت ہو گی، وہی ہماری ہے۔ ہمارے پیٹ میں لا ہے اور ہمارے ہاتھوں میں بھی لا ہے اور ہم حالات کی مثلث میں زاویہ منفرجہ بن کر رہ گئے ہیں۔ جو کوئی آتا ہے ہم پر عمود ِگراتا ہے۔ ہم کو موقع دیا جائے کہ ہم اپنی حالت کی مثالیں دے کر واضح کریں۔ محکمے کو اپنا آموختہ سنا سکیں۔ اپنے فعل ماضی اور فعل مستقبل سے آگاہ کر سکیں۔

درزیوں کی طرف سے

ہم اپ ٹو ڈیٹ ٹیلرنگ ہاؤس برائے لیڈیز اینڈ جینٹس کے ملازمین ایک مدّت سے گریزاں چاک پھر رہے ہیں اور جب مالکان کو ان کے وعدے یاد دلاتے ہیں تو وہ کپڑوں سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ہم ان کو آخری بار نوٹس دیتے ہیں کہ وہ اپنے وعدوں کو عملی پاجامہ پہنائیں ورنہ ہم ان کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیں گے۔

میخانے کے نام

یونیورسل بار اینڈ نائٹ کلب کے بیروں کا پیمانۂ صبر اب لبریز ہو چکا ہے اور وہ مالکان جو دولت کے نشے میں مست ہیں، مطلع کرتے ہیں کہ وہ ہوش میں آ جائیں ورنہ ہم نتائج کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ یہ ان کی عزّت کا سوال ہے۔ یہاں پگڑی اچھلتی ہے۔ اسے میخانہ کہتے ہیں۔ ہمارے مطالبات کوئی شراب نہیں ہیں کہ سن کر پی گئے۔ ان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

ایک نوٹس مالکوں کی طرف سے

فٹافٹ ہیئر کٹنگ سیلون کے کاریگروں کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ وہ عقل کے ناخن لیں اور فوراً کام پر واپس آ جائیں۔ کاریگروں کا یہ الزام سراسر غلط ہے کہ ہم مالکان سیلون اپنے کاریگروں کو الٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ کاریگر خود جانتے ہیں کہ ہم نہ کسی کو الٹے استرے سے مونڈتے ہیں نہ سیدھے استرے سے مونڈتے ہیں۔ بلکہ گلے پر بیٹھے پیسے گنتے رہتے ہیں۔ کاریگروں کے ساتھ ہم نے اپریل ۱۹۵۱ء میں

اجرتوں کا جو معاہدہ کیا تھا اس پر پوری طرح قائم ہیں۔ اس سے سر مو انحراف نہیں کیا۔

ذرا فون کر لوں؟

جب تک آپ کے گھر میں ٹیلیفون نہ ہو آپ کبھی اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ عوام النّاس بالخصوص اپنے محلّے والوں میں کتنے مقبول ہیں۔ ہمیں بھی اس کا پتہ اس وقت چلا جب ہم پچھلے دنوں بیمار ہو کر صاحبِ فراش ہوئے۔

شیخ نبی بخش تاجر چرم ہمارے محلّے دار ہیں۔ ان سے علیک سلیک ہے۔ گاڑھی چھننے والی کوئی بات نہیں۔ ہمیں اُن کے حسنِ اخلاق کا بھی اندازہ نہ تھا۔ ہمارے بیمار ہونے کے بعد سب سے پہلے وہی تشریف لائے۔ بیماری پٹی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ تعزیت کرنے والوں کا منہ بنایا اور پوچھا کیا شکایت ہے۔

ہم نے کہا۔ ''آپ سے ہمیں کوئی شکایت نہیں، واللہ نہیں۔''

فرمانے لگے۔ ''میں تو آپ کی بیماری کا پوچھ رہا ہوں۔''

تب ہم نے بتایا کہ معمولی کھانسی ہے نزلہ ہے۔ بولے ''اس کو معمولی نہ جانیے گا۔ میری بیوی کے بھانجے کو بھی یہی عارضہ تھا۔ آپ ہی کی عمر کا رہا ہو گا بحق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔''

''مر گیا؟'' ہم نے بوکھلا کر پوچھا۔

فرمایا۔ ''ہمارے لیے تو مر ہی گیا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کینیڈا چلا گیا۔ وہاں سُنا ہے شادی کر لی۔ ہمیں تو اب خط بھی نہیں لکھتا۔''

ہم نے جرأت تازہ پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ رشک اُن کی بیوی کے بھتیجے کی قسمت پر بھی آیا۔ بہر حال ہم نے ان بزرگ سے کہا کہ آپ نے ناحق مزاج پُرسی کے لیے آنے کی زحمت فرمائی۔ بہت بہت شکریہ۔''

اٹھتے اٹھتے اتفاق سے ان کی نظر ہمارے فون پر پڑ گئی۔ بولے ''اپنی دکان پر فون کر لوں؟'' جو شخص اتنی محبت سے حال پوچھنے آئے۔ اس سے کیا دریغ ہو سکتا ہے۔ ہم نے کہا۔ ''شوق سے کیجئے۔''

وہ گئے ہی ہوں گے کہ ریٹائرڈ تھانیدار اور حال ٹھیکیدار میر باقر علی سندیلوی لٹھیا ٹیکتے آئے۔ بولے ''سُنا تھا آپ کے دُشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔''

''ہمارے دشمنوں کی تو نہیں ہمیں ضرور کھانسی بخار ہے۔'' ہم نے وضاحت کی۔

نہایت شفقت سے ہماری نبض ٹٹولتے ہوئے بولے ''کچھ دوادارو کرو۔ احتیاط رکھو۔ تم ایسا ادیب اور انشا پرداز کم از کم ہمارے محلّے میں تو کوئی اور نہ ہو گا۔ اگر خدانخواستہ قضاو قدر کے کان بہرے کوئی ہرج مرج ہو گیا تو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔''

انہوں نے کچھ کہا ہم اپنی وحشت میں کچھ اور سمجھے۔ چنانچہ بہ آوازِ بلند عرض کیا کہ قبلہ یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ کے کان بہرے ہو رہے ہیں۔ ان میں باقاعدہ مٹّی

کا تیل گرم کر کے ڈالا کیجئے۔ اب رہا نقصان، سو ٹھیکیداری میں نفع نقصان تو ہوتا ہی ہے۔

اس پر ہمارے ایک دوست نے جو ہمارے پاس بیٹھے تھے ہمیں جھنجوڑا اور میر صاحب سے معذرت کی کہ معاف کیجئے یہ شخص یونہی بہکی بہکی باتیں کیا کرتا ہے۔ آپ کی مزاج پرسی کا شکریہ۔

اس پر انہوں نے فرمایا کہ مزاج پرسی تو میرا بحیثیت مسلمان اور ہم محلّہ ہونے کے عین فرض تھا۔ اس میں زحمت کی کوئی بات نہیں۔ پھر اٹھتے اٹھتے بولے۔ "میرا لڑکا نالائق صبح سے بھٹے پر گیا ہوا ہے۔ میں یہاں اینٹوں کے ٹرک کا انتظار کر رہا ہوں۔ اجازت ہو تو اسے فون کر لوں۔"

"شوق سے کیجئے۔" ہم نے کہا۔ "آپ ہی کا فون ہے۔"

اس کے بعد پروفیسر کے بخش کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ان کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ سعید منزل کے سامنے بیٹھتے ہیں اور قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ مقدمہ، بیماری، روزگار ہر مسئلے پر ان کا مشورہ مفید رہتا ہے۔ لاعلاج بیماریوں کے مایوس

مریضوں کا علاج بھی کرتے ہیں۔ نام کریم بخش ہے اور پروفیسر بننے سے پہلے ہمارے ایک عزیز کے ہاں خانساماں تھے۔ ان کی راہ و رسم ہم سے انہی دنوں سے ہے۔ آئے۔ بیٹھے۔ ہمارا حال پوچھا۔ پھر ہمارے ڈاکٹر کا نام پتہ دریافت کیا۔ پھر ڈاکٹروں اور ڈاکٹری طریقہ علاج کے متعلق کچھ چار حرفی ناقابلِ طباعت کلمات ارشاد فرمائے۔ اس کے بعد تشخیص کی اور کہا۔ ”تمہارے جسم میں شکر کی کمی ہے۔ اور گلا خراب ہے۔“ اپنے مجرّبات میں سے بھی ایک چیز بھیجنے کا وعدہ کیا جو مینڈک کی چربی، گندھک اور لال ٹڈے کے انڈوں سے بنتی ہے اور اُلّو کے مغز کے ساتھ نہار منہ کھانی پڑتی ہے۔ یہ بھی اُٹھتے ہوئے ٹیلی فون پر ایک جگہ آرڈر دے گئے کہ آدھا سیر گھیکوار اور دونیولے مجھے کل میرے فٹ پاتھ پر بھجوا دیئے جائیں۔

ہم تو لوگوں کے اخلاق کریمانہ کے ممنون ہوتے رہ گئے۔ ہمارے بھائی نے ہمارے نہ نہ کرتے ہوئے بھی کمرے میں نوٹس لگا دیا کہ جو صاحبان مزاج پرسی کو آئیں وہ فون کو ہاتھ نہ لگائیں اور جو فون کرنے آئیں وہ مزاج نہ دریافت کریں۔

ہم ملازمت پیشہ آدمی ہیں۔ رات کے وقت گھر پر ہوتے ہیں۔ خدا جانے لوگوں کو کیسے گمان ہو گیا کہ ہم نے میٹرنٹی ہوم کھول رکھا ہے۔ حالانکہ ہمیں پچھلے دنوں

محکمہ فیملی پلاننگ نے سند خوشنودی عطا کی ہے کہ لوگ تو بچوں کے معاملے میں احتیاط برتتے ہیں، آپ ان سے بھی زیادہ دور اندیش ہیں۔ بہر حال دن میں چار چھ فون ضرور اس قسم کے آتے ہیں۔

"ذرا میری بیگم صاحبہ کو بلا دیجیے۔"

"میرے ہاں لڑکا ہوا یا لڑکی۔ اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟"

"ذرا ایمبولینس بھیج دیجیے۔ جلدی کیجیے میں سیٹھ بھولو بھائی مٹی کے تیل والا کھارادر سے بول رہا ہوں۔"

اگر یہ کہیں کہ ایمبولینس ہمارے پاس نہیں ہے اور نہ ہمیں آپ کی بیگم صاحبہ سے تعارف ہے، نہ ہم آپ کی اولادِ نرینہ و مادینہ میں اضافے کے مشتاق ہیں۔ تو جواب ملتا ہے "یہ کیسا میٹر نٹی ہوم کھول رکھا ہے آپ نے۔ میٹر نٹی ہوم ہے یا یتیم خانہ؟"

کئی بار جی چاہا ان سے کہیں کہ آپ کے بچوں کی رعایت سے اس کے یتیم خانہ ہونے میں آپ ہی کا نقصان ہے لیکن پھر مختصر عرض کرتے ہیں کہ جی یہ میٹر نٹی ہوم نہیں۔ ایک یکّہ و تنہا آدمی کا گھر ہے۔ اگرچہ کراچی کی شرح پیدائش دیکھنے کے بعد

جی ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ کاش یہ ہمارا گھر نہ ہوتا میٹر نٹی ہوم ہوتا۔ جس جگہ کے لیے یہ فون کئے جاتے ہیں اس کے اور ہمارے فون نمبر میں فقط ایک عدد کا فرق ہے۔

یہی نہیں۔ ایک حلوہ مرچنٹ کا نمبر بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہمیں اکثر فرمائشیں اس قسم کی آتی ہیں کہ پندرہ سیر لڈّو بھیج دیجئے اور ایک ٹوکرا بالوشاہیوں کا بھی۔ اصلی گھی کا۔ پہلے کی طرح چربی میں تل کے نہ بھیج دیجئے گا۔ ایک بار ان حلوہ مرچنٹ صاحب سے ہماری ملاقات بھی ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اکثر مشاعروں کے لیے غزلوں کی فرمائش ان سے کی جاتی ہے اور رسالے والے تو ہمیشہ سر رہتے ہیں کہ آپ کی نگارشات کا انتظار ہے۔ سالنامہ نکل رہا ہے جلدی کیجئے۔

بعض لوگ صبر والے ہوتے ہیں۔ ہمیں ساری رانگ نمبر کہنے کی مہلت مِل جاتی ہے لیکن بعضوں کو جلدی بھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب کا کل فون آیا۔

"لکھیے چار چھولداریاں۔"

ہم نے عرض کیا۔ "معاف فرمایئے۔۔۔۔۔۔۔"

بات کاٹ کر بولے۔ "باتوں کا وقت نہیں۔ لکھتے جایئے۔ بارہ ڈنر سیٹ۔ اچھے ہوں، پہلے کی طرح پھٹیچر نہ ہوں۔"

ہم نے پھر کھنکار کر کہا۔ "اجی سنئے تو۔۔۔۔"

درشتی سے بولے۔ "چار چاندنیاں بھی ڈال دیجئے، صاف ہوں۔ سالن گری نہیں چاہیں۔ ہمارا پیسہ حلال کا پیسہ ہے۔"

ہم نے بھی کچھ کہنا چاہا لیکن۔۔۔۔ لیکن ادھر سے حکم ہوا کہ پہلے ان کی فرمائش نوٹ کی جائے، پھر بات کی جایئے۔

"اٹھارہ ڈونگے۔ بہتر پلیٹیں۔ پانچ لالٹینیں۔ ڈیڑھ سو چمچے۔ دس جگ۔"

ہم سب لکھتے گئے۔ جب وہ ذرا دم لینے کو رکے تو ہم نے کہا۔ "قبلہ ہم فقیر آدمی ہیں۔ ہم اتنی ساری چیزیں یہ خس وخانہ وبرفاب کہاں سے لائیں گے؟"

ادھر سے سوال ہوا۔ "آپ حاجی چراغ دین اینڈ سنز نہیں کیا؟"

ہم نے کہا۔ "جی نہیں۔ کاش ہوتے۔"

بھڑک کر بولے۔ ”آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اچھے آدمی ہیں آپ۔“

اے مردِ مجاہد

اخبار میں جلّی حروف میں لکھا ہوا ایک مصرع نظر آیا

"اے مرد مجاہد تجھے پہچان گئے ہم"

پہلا تاثر تو یہی ہوا کہ مردِ مجاہد کہیں روپوش تھا۔ ضرور کچھ کر کے بھاگا ہو گا (مثلاً جہاد وغیرہ) اور اب اسے پہچان لیا گیا ہے۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی مگر غور سے پڑھا تو وہ ایک اشتہار کا عنوان نکلا کہ

”مجاہد بننے کے لیے مجاہد مار کہ بیڑی پیجئے۔ خوشبودار پتیوں اور تازہ تمبا کو سے تیار کی جاتی ہے۔“

چند دِن پہلے مٹّی کی تیل کے ایک چولھے کا اشتہار بھی دیکھا تھا۔ اس کے اوپر یہ مصرع تھا۔

”جہاد زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں۔“

نیچے ہدایت تھی کہ ہمیشہ مجاہد مار کہ چولھے استعمال کیجئے۔ پائدار ہوتے ہیں اور تیل کم خرچ ہوتا ہے۔ نقّالوں سے بچّو وغیرہ۔

مجاہد کا تصوّر ہمارے ذہن میں پہلے تو نہ جانے کیا تھا۔ وہی ہوتا جو آپ کے ذہن میں ہے، لیکن اب کسی مجاہد کا تذکرہ آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے یہ تصویر آتی ہے کہ تلوار بندوق وغیرہ اتار کر کھونٹی پر ٹانگ رکھے ہیں۔ مجاہد مار کہ بیڑی کان میں اُڑس رکھی ہے اور اکڑوں بیٹھا مجاہد مار کہ چولھا جلا کر مجاہد مار کہ سویّاں پکا رہا ہے۔

ہم نے ایک اخبار میں غالب مار کہ سائیکل کا اشتہار دیکھا تھا تو بھی یہی تصور بندھا تھا کہ غالبؔ سائیکل اڑائے لئے جا رہے ہیں۔ اور پیچھے اپنے لائق شاگرد میر مہدی

مجروح کو بٹھا رکھا ہے جو ان کا دیوان پڑھتے اور معنی پوچھتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ قیاس کہتا ہے کہ غالبؔ صاحب سائیکل چلانا نہیں جانتے تھے۔ سست الوجود تھے۔ فرغل پہنے تصوّرِ جاناں کیے لیٹے رہتے تھے۔ ایک وجہ ان کے سائیکل نہ چلانے کی بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک سائیکل ایجاد نہ ہوئی تھی۔ حکومت نے قائدِ اعظم کے نام کے استعمال پر پابندی لگا رکھی ہے۔ کیونکہ ایک صاحب نے قائد اعظم مارکہ نفیس اور مضبوط جوتوں کا اشتہار دیا تھا۔ اور ایک صاحب نے قائد اعظم بوٹ پالش بھی نکال لی تھی جو چمڑے کو مضبوط اور چمکدار بنانے میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ یہ پابندی نہ ہوتی تو آج کل اس قسم کے اشتہاروں کی بھرمار ہوتی کہ اپنے باغ کے لئے قائد اعظم مارکہ کھاد خریدیے۔ ہر قسم کے پودوں کے لئے مفید ہے۔ یا یہ کہ قائد اعظم مارکہ اصلی ممیرے کا سرمہ استعمال کیجئے۔ دھند، جالے، کُگرے وغیرہ کے لیے آزمودہ ہے اور بصارت کے علاوہ سیاسی بصیرت بھی بخشتا ہے۔ مولوی محمد بصیر صدر انجمن مجاہدین گولی مارکہ سرٹیفکیٹ بھی اس کے ہمراہ ہوتا کہ جب سے میں نے اس سرمے کا استعمال شروع کیا ہے دل میں حب الوطنی اور قوم کے لیے قربانی کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے۔ ملک کے تمام دقیق مسائل بلا دقت

سمجھ میں آنے لگے ہیں۔ اور نظر پر ایسا قابو ہے کہ چاہوں تو عید کا چاند رویت ہلال سے ہفتہ بھر پہلے دیکھ لوں اور نہ چاہوں تو لوگوں کو دو دو تین تین عیدیں کراؤں۔ مستقبل میں بھی جھانک سکتا ہوں مثلاً آج ہی بتا سکتا ہوں کہ کل جمعہ کا دن ہو گا۔

خیر قائداعظم نہ سہی علامہ اقبال کے نام کے استعمال پر غالباً کسی قسم کی قدغن تادمِ تحریر نہیں ہے۔ نہ ان کے اشعار اور مصرعوں کے برتنے پر پابندی ہے۔ لٰہذا ہم اس قسم کے اشتہار دیکھتے ہیں تو قطعاً تعجب نہیں ہوتا۔

"شکار مردہ سزاوار شہباز نہیں۔"

"علامہ اقبالؒ نے یہ بالکل سچ فرمایا ہے۔ ہر قسم کے زندہ تیتر، شتر مرغ وغیرہ خریدنے کے لیے دکان نمبر ۱۱۱۴ ایمپریس مارکیٹ پر تشریف لائیے۔"

"کبھی سر بسجود جو میں ہوا تو زمیں سے آنے لگی صدا۔"

کہ ہر قسم کے بانماز اور دریاں وغیرہ، حاجی عید محمد اینڈ سنز بندر روڈ کے ہاں بارعایت مل سکتی ہیں۔

"اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے سوت اچھی"

جو بھولو فلور ملز ناظم آباد کے ہاں کا پسا ہوا اور کوڑے کرکٹ سے پاک نہ ہو۔ علامہ مرحوم آج زندہ ہوتے تو ہمیشہ ہمارے ہاں کا آٹا استعمال کرتے۔

علامہ اقبال مرحوم سے تو لوگوں کی عقیدت کا یہ حال ہے کہ پچھلے دنوں جوڑیا بازار کراچی کے ایک لوہے یعنی ہارڈویر مرچنٹ نے اشتہار دیا تو اس کا عنوان بھی کلامِ اقبال میں ڈھونڈا۔ ”جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں۔“

نیچے رقم تھا کہ اپنی بھینسوں گائیوں کے باندھنے کے لیے علامہ اقبال مارکہ زنجیر میں ہمارے ہاں سے خریدیے۔ اصلی فولاد کی ہیں اور ایسی مضبوط کہ ذوقِ یقین کے باوجود نہیں ٹوٹتیں۔ غلط ثابت کرنے والے کو علامہ اقبال کی کتابوں کا ایک سیٹ جرمانے میں دیا جائے گا۔

آج کچھ فلموں کے بارے میں

ایک اخبار کے فلمی صفحے پر ایک عنوان نظر آیا۔ ”تیز رو فلمسازی کا نیا ریکارڈ۔“ معلوم ہوا کہ ایک مشہور ہدایت کار نے ایک مشہور فلمساز کی فلم دو مہینے میں بنا کر ڈال دی ہے۔ جلدی کام شیطان کا ہوتا ہے۔ لیکن اس ہدایت کار کا نام اگرچہ اسی قافیے میں ہے لیکن کچھ اور ہے۔

۱۹۵۹ء میں ہم پہلی بار ڈھاکے گئے تو ہمیں نیو مارکیٹ کے قریب پارٹی ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ ہم نے پوچھا کیا یہ کمیونسٹ پارٹی کا دفتر ہے۔ اس کا شبہ کچھ نام سے ہوا کچھ اس عمارت کی بے سرو سامانی سے۔ لوگوں نے بتایا جی نہیں۔ یہ اسمبلی کی

حکمران پارٹی کے ممبروں کے ٹھہرنے کو بنایا گیا ہے۔ اور آپ یہ سن کر حیرت کریں گے کہ یہ پوری عمارت دو ماہ میں بنی ہے۔ ہم نے میز بانوں کے حسبِ فرمائش حیرت کی اور دیدے پھاڑ کر کہا۔ "اچھا؟" تھوڑی دیر میں ایک اور صاحب خاص یہ بات بتانے کو تشریف لائے کہ یہ عمارت دو مہینے میں تیار ہوئی۔ ہم نے پھر کہا خوب ہے کمال ہو گیا۔ لیکن جب ایک تیسرے صاحب نے آ کر کہا کہ حضرات کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ یہ پارٹی ہاؤس دو ماہ میں بنا تو کہنا پڑا کہ واقعی یقین نہیں کر سکتے کہ اس میں دو مہینے لگ سکتے ہیں۔ کیا ان کام چور انجنیئروں اور مزدوروں کو کوئی سزا بھی ملی۔

اس تاریخی عمارت کے ایک کمرے میں ہم ابراہیم جلیس اور مشہور افسانہ نگار اے حمید فروکش ہوئے۔ اے حمید سے بے احتیاطی یہ ہوئی کہ بات کرتے کرتے اس پلنگ پر آ گئے جس پر ہم پہلے سے بیٹھے تھے۔ تڑاخ کی آواز آئی اور وہ زمین پر آ رہے۔ خیر وہ اُٹھ کر دوسرے پلنگ پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے کسی بات پر قہقہہ مارا تو ان کا پلنگ بھی تاب نہ لا سکا اور بیٹھ گیا۔ ابراہیم جلیس چلّائے۔ "ارے کیا ہوا؟" یہ ان کی غلطی تھی۔ ان کو آہستہ بولنا چاہیے تھا کیونکہ کمرے میں

آہستہ بولنے کی تختی بھی لگی تھی۔ خیر اب کیا ہو سکتا تھا ان کا پلنگ بھی شہید ہوا۔ ہمارے کہنے پر اور نیک چلنی کا مچلکہ داخل کرنے پر نہیں ایک دوسرا کمرہ دیا گیا جس میں نہایت آہستگی سے جا کر ہم اپنے اپنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ بیچ میں کہیں کھانسنے کی ضرورت پیش آتی تو پلنگ سے اتر کر ان حوائج کو رفع کرتے تھے۔ پھر پلنگ پر جا کر لیٹتے تھے۔

مقصود اس حکایت کا یہ ہے کہ کہیں لوگ فلم مذکور دیکھ کر بھی یہ نہ کہیں کہ ارے اس میں ایسی کون سی بات ہے جو ڈائریکٹر نے دو مہینے لگا دیے۔ شائد اسٹوڈیو خالی نہ ملا ہو گا یا کوئی اداکار بیچ میں بیمار ہو گیا ہو گا۔

اخباروں کے مراسلات اور اداریوں میں اکثر لکھا جا رہا ہے کہ ہماری فلمیں صحت مند رجحانات کی حامل ہونی چاہئیں۔ ہم خود آج کل کی فلموں کی بے راہ روی سے ناخوش ہیں۔ ممتاز حسن صاحب نے ایک بار لاہور میں فرمایا تھا کہ صحت مند ادب صحت مند ادیب ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے سامنے رائٹرز گلڈ کے احاطے میں اکھاڑا بھی کھدوا آئے تھے۔ فلموں کی اصلاح کی بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ پچھلے دنوں کسی صاحب نے رستم و سہراب نام کی ایک نئی فلم بنانے کا عزم کیا تو

ہمارے ایک مشہور افسانہ نگار دوست بھاگے گئے کہ میں کہانی لکھوں گا۔ فلم ساز کوئی بڑے ہی پکڑے دل تھے۔ بولے میاں کہانی پہلوانوں کے متعلق ہے۔ تم نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی؟ ہمارے یہ دوست واپس آگئے اور غالباً عمر میں پہلی بار آئینہ دیکھا لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ آج کل باقاعدہ یخنی بادام کی ٹھنڈائی، خالص پنجاب کے گھی اور دیگر مقوّیات کا استعمال کر رہے ہیں اور سر گھٹوا، گلے میں تعویذ پہن، صبح شام ڈنٹر بیٹھکیں بھی لگا رہے ہیں۔ گانوں کے بارے میں ایسی کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ گیت نویسوں میں کون ہے جو اپنے فن کا پہلوان نہیں اور محاورے اور معروض کو پٹخنیاں نہیں دیتا۔ ہم نے تو ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ اس دنگل میں فتح مبین ہمیشہ گیت نویس کی ہوتی ہے۔ بحور و اوزان اور شاعری کے دیگر اصول و قواعد چاروں شانے چِت نظر آئے۔

عام خیال یہ ہے کہ ہماری نئی پود میں جتنی خرابیاں پائی جاتی ہیں یہ سب فلم کے راستے آئی ہیں۔ سنسر بورڈ میں علماو صلحا کو شامل کرکے دیکھ لیا گیا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ہمارے ایک بزرگ کا کہنا ہے کہ تبدیلیاں بنیادی ہونی چاہئیں۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ ذرا وضاحت سے اور مثالیں دے کر واضح کیجئے۔ بولے۔ کہاں کے

رہنے والے ہو تم؟ ہم نے بتایا کہ لاہور کو ہمارا وطن مالوف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ فرمایا تو پھر یوں سمجھ لو کہ فلم کا ہیرو لاہور میں تمہارے علاقے کا مثالی نوجوان ہونا چاہیے۔ تہمد زیبِ تن کیے، پمپ شوز پہنے اور رومالی کاندھے پر ڈالے مونچھوں کو موم لگا کر تاؤ دیتا ہوا۔ یہ ہو تو چند دن میں دیکھ لو گے کہ تمام نوجوان یہی وضع بنا کر باہر نکلتے ہیں کہ نہیں۔ ہم نے کہا یہ تو ہیرو ہوا۔ ہیروئن کے متعلق بھی فرمایئے۔ بولے بہت ضرورت ہو تو ہیروئن کو لٹھّے کا سیدھا سفید برقع پہنا کر فلم میں لایا جا سکتا ہے لیکن میرے نزدیک ہیروئن کی چنداں ضرورت نہیں، فقط اس کے والدین کا ہونا کافی ہے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ پھر ہیرو عشق کس سے کرے گا اور کہانی آگے کیسے چلے گی۔ بولے ساری خرابی تو عشق و عاشقی کی ہے۔ یہ مخرب اخلاق باتیں فلم میں نہیں ہونی چاہئیں۔ ہیرو کا سرپرست سیدھے سیدھے ہیروئن کے والدین کے پاس جا کر کہے کہ عزیزی محمد رمضان کو اپنی فرزندی میں قبول فرمایئے اور اپنی دختر نیک اختر کنیز فاطمہ سے اس کے نکاح کی تاریخ مقرر کر دیجیے۔ یہ ضروری ہے کہ ہیرو ہیروئن کے نام ٹیڈی نہیں بلکہ شریفوں کے سے ہوں۔ لڑکی کے والدین زیادہ سے زیادہ یہ پوچھیں گے کہ برخوردار کرتا کیا ہے۔ سو ادھر سے

جواب بالصواب ملے گا کہ گوالمنڈی میں دودھ کی دکان ہے۔ خوب چلتی ہے۔ اس کے بعد نکاح ہو گا۔ چھوہارے بٹیں گے۔ اور فلم ختم۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ تو پانچ، سات منٹ کی کہانی ہو گئی۔ اس سے کیسے کام چلے گا؟ فرمایا عزیزم وقت کی قدر کرنی سیکھو۔ آج کل لوگوں کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ بیچ میں رقیب یا ظالم سماج کو لا کر شائقین کو ناحق دو ڈھائی گھنٹے تک سینما ہال میں باندھے رکھنا کہاں کا انصاف ہے؟

ہم تو چپ ہو گئے لیکن ان بزرگ نے اپنا سلسلۂ تقریر جاری رکھا اور کہا، یاد رکھو۔ ہمیں ایسے ہیرو مطلق نہیں چاہئیں جو ٹھرّا پی کر آوارہ ہوں، 'آوارہ ہوں' کی ہانک لگاتے پھریں یا بے سُری آواز میں گھگیائیں 'یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں۔' ہمارے ہیرو کو تو چھاتی ٹھونک کر الٹے ہاتھ سے بکرا بلا کر یوں للکارنا چاہیے 'اوے پرے ہٹ کے گل کر۔ اسیں لسّی پیتی ہوئی اے۔''

فلمساز حلقوں میں اس بات پر تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے کہ نوجوان ایکٹرسیں دھڑا دھڑ شادی کر رہی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ڈائریکٹر صاحب زرِ کثیر خرچ کر کے سیٹ کھڑا کرتے ہیں۔ اداکاروں کو مکالمے یاد کراتے ہیں اور اسپرو کی گولیاں کھاتے ہیں۔ امابعد ہیروئن کے گھر آدمی بھیجتے ہیں کہ شتابی سے تشریف لائیں۔ تھوڑی دیر میں

آدمی جواب لاتا ہے کہ جی وہ تو ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے بیٹی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ ان کی نانی صاحبہ نے یہ شادی کا کارڈ دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ ڈائریکٹر صاحب اور پروڈیوسر صاحب اس مبارک موقع پر ضرور تشریف لائیں۔ اور بعد نکاح مسنونہ ماحضر تناول فرمائیں۔ زیادہ بھاری تحفہ لانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں کیمرہ مین موجود ہو تو اس کو ہمراہ لاکر اس موقع کی ایک فلم ضرور کھینچ لیں۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے ان دو تین سال میں کتنے ہی فلمی ستارے شادیاں کر کے آفتاب بن گئے۔ اگر ہم پوچھیں کہ مس بدر منیر کہاں گئیں۔ آج کل فلموں میں نظر نہیں آتیں۔ تو جواب ملتا ہے کہ جناب وہ ایک ٹھیکیدار سے شادی کر کے بالکل بی بی نیک پروین بن گئی ہیں۔ پابندِ صَوم و صلوٰۃ ہیں۔ کشیدہ کاری سے شغف ہے۔ میاں کے کپڑے خود دھوتی، استری کرتی ہیں۔ حج کے لیے نام دے رکھا ہے اگر قرعہ نکل آئے تو۔

اگر یہی قحط الرّجال جاری رہا تو فلمسازوں کو لنڈے بازار اور جونا مارکیٹ کے مال پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ کوئی دن میں اسٹوڈیو میں یہ منظر نظر آیا کرے گا کہ ہیرو کو آواز پڑی ہے تو لڑکا جواب لاتا ہے کہ جی وہ تو میک اپ روم میں بیٹھے خضاب لگا

رہے ہیں۔ اور اپنی توند پر پٹی بند ھوا رہے ہیں۔ ہیر وئن کی ڈھنڈیا پڑتی ہے تو تھوڑی دیر میں وہ لاٹھی ٹیکتی بر آمد ہوتی ہیں۔ ڈائریکٹر کہتا ہے۔ کیوں بی دیر کیوں ہوئی۔ تو فرماتی ہیں، بیٹا کیا کروں بتیسی ٹھیک کرانے کے لیے دندان ساز کے پاس بھیج رکھی تھی کم بخت ٹھیک کام نہیں کرتا۔ آئے دن کوئی خرابی ہو جاتی ہے۔ چند دن میں پتہ چلتا ہے کہ ثقل سماعت کا عارضہ بھی ہو گیا ہے۔ اداکاروں کو ہدایت کرنی پڑتی ہے کہ ہیر وئن سے خطاب کریں تو مکالمے ذرا بلند آواز سے بولیں۔ گنج کی کوئی ایسی بات نہیں۔ وگ سے ڈھانپا جا سکتا ہے۔ آواز بہر صورت پلے بیک ہوتی ہے۔ اور اس میں رعشے کا اثر آنے کا اندیشہ نہیں۔ ولن کو آنے کو دیر ہوتی ہے تو دریافت ہوتا ہے کہ جوڑوں کے درد میں پڑا ہے۔ سانس کی تکلیف بھی ہے۔ کیا کرے یک پیری و صد عیب۔ ہمارے ایک فلمساز دوست نے اس صورت حال میں اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے جس میں بقول ان کے دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے۔ ہوا یہ کہ فلم کی کاغذی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد جس میں چنداں دقت پیش نہیں آتی۔ کیوں کہ کہانی اور گانے ان کے اپنے تھے۔ انہوں نے ہیرو، ہیر وئن کے بھاؤ پوچھے۔ ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی، جب معلوم ہوا کہ مس معرکہ آرا چالیس ہزار

روپے سے کم نہیں لیتیں۔ مس چراغ رُخِ زیبا نے کہا کہ میں اگلے پانچ سال تک آنے والی فلموں کے لئے بُک ہوں۔ تاہم بیس ہزار روپے ایڈوانس ملے تو غور کروں گی۔ مشہور رقاصائیں مس بی جمالو نے عذر شرعی کیا کہ اب میں پردہ نشین ہو گئی ہوں۔

فلم کی بات بیسوا جانیں

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

ذبیحہ بیگم اپنے بڑے لڑکے کی شادی کے انتظامات میں مصروف پائی گئیں۔ مس نانی کا نواسہ بیمار تھا۔ ہیروؤں میں میاں خر گوش کمار کا بھاؤ بہت تیز نکلا۔ سنا کہ فقط بونس واؤچر پر مل سکتے ہیں۔ ناچار ان دوست نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بیوی کو برقع پہنا کر فلم میں ہیروئن لائیں گے۔ اس کے لئے کہانی اور سناریو میں کچھ ترمیم کرنی پڑی جس کے لئے محلے کی مسجد کے خطیب مولوی عبد الولی عاصیؔ سے خاصی مدد ملی جو ایک شعلہ طراز ادیب ہیں اور مولوی فاضل کی سند رکھتے ہیں۔ ہم نے منظر نامہ دیکھا ہے۔ نام فلم کا حیا کی بیٹی ہے۔ اگرچہ مولوی عاصیؔ صاحب مُصِر تھے کہ اسے بنتِ مومن کہا جائے۔ ساری فلم میں ہیروئن برقع اٹھاتی ہے نہ کسی نامحرم سے کلام کرتی

ہے۔ کبھی کبھی سر ضرور ہلاتی ہے۔ ہیرو کا کام ہمارے فلم ساز دوست خود کریں گے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں کیوں کہ حسنِ صورت ایک اضافی چیز ہے۔ اس سے یہ مالا مال ہیں۔ کہانی میں عشق کے اجزا یکسر خارج کر دیے گئے ہیں۔ سارا وقت مسئلے مسائل پر گفتگو رہتی ہے۔ ہر سین کا اختتام اذان کی روح پرور آواز پر ہوتا ہے جسے سنتے ہی ہیرو لوٹا اٹھا کر کہتا ہے۔ اچھا تو محترمہ اب میں چلا نماز کو، پھر ملیں گے۔ اگر خدا لایا۔ ہیروئن کی سہیلیاں اور سکھیاں بھی برقعوں میں ملبوس ہیں اور وِلن تک کے چہرے پر داڑھی اور آنکھوں میں سرمے کی تحریر ہے۔ گانے اس فلم میں نہیں ہیں۔ ہاں دو تین جگہ قوّالی ضرور ہے۔ ہمارے دوست کو اُمّید ہے کہ یہ فلم متدیّن طبقوں میں بہت مقبول ہو گی۔ رسالہ فاران کراچی۔ رسالہ تجلّی دیو بند اور رسالہ ترجمان القرآن میں اس کا پے در پے اشتہار دیا جائے گا اور مسجدوں کی دیواروں پر پوسٹر لگائے جائیں گے۔

فلم دیکھئے اور ثوابِ دارین حال کیجئے

لاہور کے حکام پر ایک سہانی صبح یک لخت یہ انکشاف ہوا کہ سینما والے عریانی پھیلا رہے ہیں۔ توبہ توبہ اس اسلامی مملکت میں ایسا کام؟ ایسا ایتّاچار؟ فوراً پیادے دوڑائے گئے، منادی کرادی گئی کہ اب تک جو ہوا سو ہوا آئندہ کے لیے بے حیائی بند ہونی چاہیئے ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ پولیس والوں کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ جہاں کوئی عریاں، خلافِ تہذیب یا منافی اخلاق بورڈ سڑک پر نظر آئے اسے اتار لو۔ باقی کاروائی اس کے بعد کی جائے گی۔ پولیس والے چور پکڑتے پکڑتے بلکہ نہ پکڑتے پکڑتے تنگ آ گئے تھے۔ الکساہٹ میں جمائیاں لے رہے تھے۔ ان کو ایسا کام خدا

دے۔ دیکھتے دیکھتے خلاف شرع بورڈوں کا ڈھیر لگ گیا۔ میکلوڈ روڈ اور ایبٹ روڈ وغیرہ صاف ہو گئیں، معاشرہ آلودگیوں سے پاک ہو گیا۔ ہر طرف تہذیب و اخلاق کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ نیکی کا نور پھیل گیا۔

اب ان بورڈوں کا جائزہ شروع ہوا۔ ملزم یعنی فلموں والے بھی موجود تھے۔ درِ عدالتِ ناز کھلا۔ گواہِ عشق طلب ہوئے۔ صدر عدالت نے انصاف کی ترازو ہاتھ میں تھامی اور پوچھا۔

"تھانیدار جی۔ یہ بورڈ آپ نے کیوں اتارا۔ وجہ بیان کیجئے۔۔۔"

"حضور اس میں عورت کی ٹانگیں ننگی دکھائی گئی ہیں۔"

"چچ چچ چچ۔ بری بات۔ ہاں میاں فلم دین۔ تم نے ایسا محزبِ اخلاق بورڈ کیوں لگایا۔۔۔"

"حضور، عالی جاہ۔ یہ انگریزی فلم ہے۔ اس میں جیسی ٹانگیں ہوتی ہیں ویسی ہم نے بورڈ پر بنا دیں۔"

"ہاں بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ تھانیدار جی یہ تو انگریزی فلم ہے۔ اس میں ٹانگیں کیسے بدلی جاسکتی ہیں۔"

"عالی جاہ۔ جب یہ لوگ انگریزی فلم کا نام بدل لیتے ہیں Foreveramber کو "منڈیا سیالکوٹیا" کا نام دے کر دکھاتے ہیں تو ٹانگیں کیوں نہیں بدل سکتے۔ خیر ٹانگیں بدلنے کی ضرورت نہیں۔ پاجامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ شلوار پہنائی جاسکتی ہے۔ ننگی ٹانگوں سے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کے جذبات مشتعل ہوئے؟"

"جی میرے جذبات؟ میرے؟ حضور میں عوام کے جذبات کی بات کر رہا ہوں۔"

"میاں فلم دین۔ تھانیدار صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ ان ٹانگوں پر شلوار ہونی چاہیے۔ انگریزی غیر انگریزی کی بحث میں نہیں پڑتے۔"

"حضور تھانیدار جی ٹھیک کہتے ہیں اور آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ بورڈ پر تو میں شلوار پہنا دوں گا لیکن فلم کے اندر صوفیہ لورین کو کیسے پہنا دوں؟ اس نے نہ پہنی تو؟"

”صوفیہ لورین؟ اس کا مطلب ہے آپ کی فلم میں چوما چاٹی بھی ہوتی ہو گی۔ آپ کو شرم نہیں آتی چوما چاٹی کی فلمیں دکھاتے؟“

”حضور پاکستانی فلمیں دکھاتے وقت شرم آتی ہے۔ اسی لیے فی الحال پاکستان فلموں میں چوما چاٹی نہیں دکھاتے انگریزی امریکی فلموں میں البتہ۔ حضور۔ آپ اتنے پاجامے کہاں سے لائیں گے۔ ان فلموں کی درآمد کیوں نہیں روک دیتے؟“

”چپ تم کو پالیسی کے معاملوں میں دخل دینے کو کس نے کہا۔ ہاں تو تھانیدار صاحب دوسرا بورڈ دکھایئے۔ ہاں اس میں کیا ہے؟“

”حضور خود ہی دیکھ لیجئے۔ جوش ملیح آبادی کی زبان میں جیسے گدّرا ناز۔“

”بہت شرمناک بات ہے۔ دور کرو اسے میری آنکھوں سے۔ ذرا ٹھہرو، دیکھ لوں۔ تصدیق کر لوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کیوں میاں فلم دین۔“

”جناب میں کیا عرض کروں۔ آپ عورتوں سے فلموں میں کام کروائیں گے تو عورتیں تو ایسی ہوتی ہی ہیں۔ مردانہ اور زنانہ جسم میں فرق ہوتا ہے۔“

”میاں فلم دین تم یہ ہمیں بتا رہے ہو؟ ارے ہم سے زیادہ کسے معلوم ہو گا لیکن فلموں میں بس سپاٹ سپاٹ جسم دکھایا کرو تاکہ بے حیائی نہ پھیلے۔ اچھا اب آپ جایئے آپ تو ایبٹ روڈ کے ہیں نا۔ اب میکلوڈ روڈ کے تھانیدار کو بلایئے۔“

”حضور سلام۔“

”سلام۔ آپ تو حاجی معلوم ہوتے ہیں۔“

”جی میں حاجی ہی ہوں۔“”پھر تھانیدار کیسے بنے ہیں۔“

”جناب اگر تھانیدار نہ ہوتا تو حج کیسے کرتا۔ اتنے وسائل کہاں سے لاتا۔“

”آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ دکھایئے آپ نے کون سا بورڈ اتروایا ہے۔ ہاں تو بورڈ میں کیا ہے؟“

”جناب یہ رنگیلی دنیا کا بورڈ ہے۔ اس میں ہیروئن کے پاؤں ننگے دکھائے گئے ہیں۔“

”اس پر کیا اعتراض ہے؟“

”جناب والا بعض لوگوں کے دل تو ننگے پاؤں دیکھ کر بھی پامال ہو جاتے ہیں۔ یہ طبّی نقطۂ نگاہ سے بھی مضر ہے۔ ننگے پاؤں پھرنے سے زکام ہو جاتا ہے۔“

”حاجی صاحب۔ آپ اس وقت صرف اخلاقی نقطۂ نظر سے بات کریں۔ یہ دوسرا بورڈ آپ نے کیوں اُتروایا۔ اس میں تو پاؤں بھی ننگے نہیں ہیں۔ ہیروئن نے دستانے تک پہن رکھے ہیں فقط چہرہ کھلا ہے۔“

”حضور ساری خرابی تو چہرے ہی کی ہے۔ جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی۔ عورتوں کو منہ ڈھانپ کر فلم میں آنا چاہیئے۔“

”بے شک یہ اشتہار کس فلم کا ہے؟“

”یہ تبّت سنو کا ہے جی۔“

”یہ کس کی فلم ہے؟ کس سینما میں چل رہی ہے؟“

”جناب یہ تو مجھے معلوم نہیں، میں فلمیں نہیں دیکھتا۔ سڑک پر بورڈ نظر آیا اکھاڑ لیا۔“

”بہت اچھا کیا آپ نے۔ آپ کو تمغۂ شجاعت دینا چاہیے۔ عدالت برخاست۔“

بات بورڈوں سے شروع ہوتی ہے۔ ابھی فلموں تک نہیں پہنچی۔ بس پہنچنے ہی والی ہے۔ سنا ہے ریاض شاید کی فلم غرناطہ کے بارے میں سنسر بورڈ کو تاّمل ہے کہ اس میں رقص کیوں ہیں، کہانی مجاہدانہ ہے بلکہ بہت ہی مجاہدانہ جس کے لیے جناب نسیم حجازی کا نام ضمانت بلکہ ناقابلِ واپسی ضمانت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غرناطہ میں اسلامی سلطنت تھی تو لوگ سارا وقت سر پر خود رکھے شمشیر کو بے نیام کیے حق اللہ کے نعرے لگاتے پھرتے ہوں گے۔ کوئی دکانداری کا ہے کو کرتا ہو گا اور تفریح کا کیا سوال ہے۔ رقص تو بہت معیوب چیز ہے۔ یہ جو کسان لوگ فصل کٹنے کے بعد بھنگڑہ ناچتے ہیں۔ بعض متین حضرات کو ہم نے اس پر بھی اعتراض کرتے دیکھا ہے اور عورتوں کے رقص کی تو پھر بات ہی اور ہے۔ ہم کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی اصلاحیں کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اصلاح پوری ہونی چاہئے۔ اسلامی مملکت میں فلم بنے تو اس میں شراب اور شرابیوں کے سین کا کام کیا۔ لوگ لسّی پئیں کہ ہمارا قومی مشروب ہے اور اس کے بعد مونچھیں صاف کرتے ڈکار لیتے ہوئے الحمد للہ بھی کہیں تو اور مناسب ہے۔ میں آوارہ ہوں، آوارہ ہوں، قسم کے گانے اور غنڈہ گردی کے سین، ہیروئن پر حملے خواہ وہ غیر مجرمانہ ہی کیوں

نہ ہوں آخر کہاں ہماری تہذیب کا حصّہ ہیں۔ چھی۔ چھی۔ بُری بات اور ہم تو کئی بار ی یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ عشق و عاشقی کو فلموں میں سے نکال دیجئے۔ ساری قابلِ اعتراض باتیں نکل جائیں گی۔ ہیر و ہیر وئین کو مہنگے داموں محض اس لیے فلم میں ڈالنا پڑتا ہے کہ عشق کریں اور وِلن بھی تاکہ اس عشق میں کھنڈ رات ڈالیں۔ اب جبکہ ہماری فلمی صنعت کے اکثر لوگ حاجی ہو چکے ہیں ہماری اس گزارش پر سنجید گی سے غور کرنا چاہیئے۔ جو لوگ مصر میں کہ رومانی مناظر کے بغیر فلم نہیں بن سکتی ان کی تالیفِ قلب کے لیے ہمیں ایک دوست کا یہ مشورہ پسند آیا کہ سارے رومانی سین تو رکھے جائیں، فقط اس وقت کیمرہ بند رکھا جائے۔

فلم مائی کا لال سنسر ہوتی ہے

پچھلے دنوں فلم سنسر بورڈ نیا بنا ہے اور اچھا بنا ہے۔ اس میں کچھ علما بھی شامل ہیں جن کو ویسے کبھی فلم دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ پہلی بار یہ دیکھ کر حیران بھی ہوئے کہ تصویریں بھی چلتی پھرتی اور بولتی ہیں۔ آخر ہمارے ملک میں ایک بڑی آبادی ہے جو فلم نہیں دیکھتی، ان کی نمائندگی بھی ضروری تھی۔ پھر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو فلم دیکھتے ہیں لیکن اس کی سمجھ نہیں رکھتے۔ ان کی نمائندگی کے لئے ایسے لوگ بھی سنسر بورڈ میں رکھے گئے ہیں تاکہ اس کی ہیّئت زیادہ سے زیادہ جمہوری ہو جائے۔ اب بظاہر کسی کو شکایت کا موقع نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن تعجّب کی بات

ہے کہ اب بھی کچھ لوگ اس کی تشکیل پر مطمئن نہیں۔ ان میں ایک تو خیر ہم خود ہیں۔ دوسرے راولپنڈی کے ایک حکیم صاحب ہیں جنہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ایک حکیم کو بھی سنسر بورڈ میں شامل کرنا چاہیئے کیونکہ فلموں میں حکیم کا کردار بڑے قابلِ اعتراض انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ بڈھا، بیوقوف، سنکی وغیرہ۔ سنسر بورڈ میں کوئی بھی ہو گا تو اس قسم کی شرارت کا تدارک تو کر سکے گا۔

حکیم صاحب نے تدارک کا اچھا نسخہ بتایا ہے یعنی سنسر بورڈ میں ایک حکیم ضرور ہونا چاہئے لیکن ٹھہریے۔ حکیم ہے تو ایک ڈاکٹر بھی چاہئے ورنہ تو فلم والے اپنی فلموں میں ڈاکٹر موٹو قسم کے کردار بھر دیں گے۔ اب ہومیوپیتھی بھی تسلیم ہے۔ لہٰذا ایک ہومیوپیتھ کو بھی نکس وامیکہ کی شیشی لیے سنسر بورڈ میں موجود رہنا چاہیے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ایک سلوتری بھی ہو تو عین مناسب ہے۔ آخر فلموں میں انسان نہیں جانور اور مویشی بھی تو دکھائے جاتے ہیں۔ دوسرے اہلِ حرفہ بھی نمائندگی کے مستحق ہیں۔ ایک بار خاکروبوں کو شکایت پیدا ہوئی تھی کہ فلمیں صاف ستھری نہیں بنتیں۔ لانڈری والوں نے بھی مطالبہ کیا کیا تھا کہ ہماری فلمیں بے داغ ہونی چاہیں۔ نمائش سے پہلے ہمیں دی جائیں تاکہ ہم انہیں ڈرائی کلین کر دیں۔ جاٹ حضرات

بھی ایک فلم کا نام بدلوا چکے ہیں۔ وہ جو جٹی تھی آخر چٹی بن کر ریلیز ہوئی۔ آئندہ بھی غلطی کا احتمال ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ ایک جاٹ بھی سنسر کے وقت کھاٹ ڈالے سنسر بورڈ میں مستقل بیٹھا ہو۔ جہاں کوئی بات خلافِ مزاج پائی وہیں اس نے فلم پروڈیوسر کے دھول جمائی۔

باربر حضرات کی یونین چونکہ زیادہ مضبوط ہے اس لئے وہ اپنے حقوق کے بارے میں زیادہ خبردار رہتے ہیں۔ وہ کئی بار شکایت کر چکے ہیں کہ فلمساز ان کے اچھے خاصے پیشے کی محض اپنی تفریحِ طبع کے لئے حجامت کر دیتے ہیں لہٰذا آدمی کوئی ان کا بھی دم تحریر ہونا چاہئے۔ یعنی سنسر بورڈ کے اندر جہاں کسی سین میں بال برابر بات قابلِ اعتراض نظر آئی انہوں نے قینچی چلائی۔ یاد رہے کہ کسی باربر کو رکن بنانے میں سنسر بورڈ کا خرچ بھی بچے گا۔ اس کے لیے قینچی خریدنی نہیں پڑے گی۔ اس کے اپنے پاس ہوتی ہے۔ ہمارے ان بھائیوں کی چوکسی فلموں تک محدود نہیں۔ اُردو کی کسی درسی کتاب میں کسی شاعر یا قافیہ پیما نے لکھ دیا تھا۔ ”نائی آیا ہے۔ چارپائی لایا ہے۔“ اسلام سلمانی صاحب نے فوراً اعتراض کیا کہ چارپائی لانا نائی کا کام نہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ والوں کو یہ فقرہ خارج کرتے ہی بنی۔ اس کی بجائے غالباً یہ

فقرہ رکھوایا گیا۔ ”ہیئر ڈریسر آیا ہے، سیفٹی ریزر لایا ہے۔“ پس ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ایک وقت آتا ہے جب کہ سب طبقوں کی نمائندگی سنسر بورڈ میں ہو جاتی ہے تاکہ فلم پر کسی کو اعتراض نہ رہے۔ لیجیے فلم ”مائی کا لال“ عرف ”طوفانِ محبت“ سنسر ہونے کے لئے تیار ہے۔ ہال پورا بھرا ہے۔ یہ دو ڈھائی سو آدمی تماشائی نہیں سب کے سب سنسر بورڈ کے ممبر ہیں۔ ادھر ایک وکیل صاحب ہیں۔ ایک منشی جی بھی کان پر قلم رکھے تشریف فرما ہیں۔ ایک تھانیدار بھی ہتھکڑی لئیے موجود ہے۔ ایک پٹواری بھی اپنے بستے سے ٹیک لگائے منتظر ہے۔ ایک سیٹھ صاحب ہیں، ایک سود خور کابلی بھی سائیکل لیے موجود ہے۔ حتیٰ کہ ایک طرف افیمیوں کا نمائندہ بھی افیم کی طشتری لیے اور گنڈیریاں رومال میں باندھے بیٹھا ہے، کیونکہ فلم والوں کو اور کوئی نہیں ملتا تو انہی کی مذاق اڑا دیتے ہیں۔ اب کے کسی فلمساز نے ایسی حرکت کی تو دیکھیئے گا۔ ادھر کوئی ایسا ویسا سین سکرین پر آیا اُدھر اگر یہ اس وقت پینک میں نہ ہوئے۔ انہوں نے فلمساز کے قرولی بھونکی۔ گیدی کہیں کا۔ ٹھہر تو سہی۔

اچھا اب باتیں بند، کیونکہ فلم شروع ہو گئی ہے۔ ”لیجیئے لڑکی یعنی ہیروئن اٹھلاتی ہوئی پانی بھرن کو چلی۔ پانی بھرن کا تو بہانہ ہے۔ آج کل دیہات میں بھی نلکے لگے ہوئے

ہیں۔ مقصود اس کا ہیرو کو منہ دکھانا ہے۔ یک لخت آواز آتی ہے۔ ’’ٹھہرو روکو فلم۔ یہ فلم نہیں چل سکتی۔‘‘ بتّی جلا کر دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب گل مچھوں والے کھیس کی بکّل مارے گھونسا تانے کھڑے ہیں اور بنکار رہے ہیں۔ ’’کس بدذات نے بنائی ہے یہ فلم۔‘‘ یہ صاحب والدین کے نمائندے ہیں اور فرمارہے ہیں۔ ’’ارے ہماری لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں؟ اجنبیوں سے چھپ چھپ کر ملتی ہیں۔ ارے کچھ حیا شرم کرو۔ کیا تمہاری بہو بیٹیاں نہیں ہیں؟‘‘ فلمساز وعدہ کرتا ہے کہ جی اچھا یہ سین میں نکال دوں گا۔ اصلاح کر دوں گا۔ فلم آگے ملتی ہے۔ لنگڑا ولن ہیروئن پر دست درازی کرنا چاہتا ہے۔ وہ عفت کی پتلی وار خالی دیتی ہے بلکہ اس کا کتّا ولن کی ٹانگ کاٹ لیتا ہے۔ وِلن سے کچھ اور تو ہوتا نہیں۔ کھسیانا ہو کر ایک ڈنڈا کتے کے رسید کرتا ہے۔ چیاؤں چیاؤں چیاؤں۔

یک لخت ہال میں ایک کڑکا ہوتا ہے۔ بلّے بلّے بلّے بلّے بلّے، لائٹ جلا کر دیکھا۔ یہ ولنوں کے نمائندے تھے جن کو ایک زمانے سے شکایت تھی کہ فلموں میں وِلن کا کردار اچھے معنوں میں نہیں پیش کیا جاتا۔ نمائندے صاحب نے الٹا ہاتھ منہ پر رکھ کر بکرا بلایا اور للکارا۔۔۔ ’’او کڈھو فلساز نوں۔ کتھے آ۔ میں اوہدی لت بھن دیاں

گا۔ میں ایسی فلم نوں آگ لگا دیاں گا۔" بڑی مشکل سے ان کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اعتراض ان کا ٹھیک ہے۔ ہماری فلموں میں ولن کو عموماً بدمعاش یا غنڈہ دکھایا جاتا ہے۔ اکثر تو اسے ہیرو کے ہاتھوں مار کھاتے بھی دکھاتے ہیں جو دل آزار ہونے کے خلافِ حقیقت بھی ہے۔ کیونکہ اصل زندگی میں عموما ہیرو مار کھاتا ہے۔ ولنوں کے نمائندے کو یہ بھی اعتراض ہوا کہ فلم میں ہیروئن کی شادی ہمیشہ ہیرو کے ساتھ کی جاتی ہے حالانکہ ولن کے ساتھ ہوئی چاہیئے۔ جیسا کہ اصل زندگی میں ہوتا ہے پھر کسی شخص کو عین نکاح کے وقت رنگ میں بھنگ ڈالنے کی اجازت بھی دینی چاہیئے کہ ٹھہرو، یہ شادی نہیں ہو سکتی کیوں بھئی کیوں نہیں ہو سکتی؟ ہیرو میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ جب ہیرو کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے تو ولن کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھی تو انسان ہے۔ وہ بھی تو مسلمان ہے۔۔۔!

ولن نمائندے کا اعتراض بھی نوٹ کیا جاتا ہے۔ معقول بات سے کون اختلاف کر سکتا ہے۔ اب فلم آگے چلتی ہے لیکن نہیں۔ اتنے میں دوسری طرف سے ایک صاحب ہاتھ کھڑا کرتے ہیں کہ ٹھہریے۔ نام پتہ لکھایئے؟ آپ کون؟ میں محکمہ انسدادِ بے رحمی حیوانات کا نمائندہ ہوں۔ جناب آپ لوگوں نے کیا سمجھ کر اس

معصوم کتّے کے لاٹھی جمائی۔ لکھوایئے پروڈیوسر صاحب اپنا نام، پتہ، ولدیت، سکونت۔ آخر پروڈیوسر یہ وعدہ کرکے چھوٹتا ہے کہ یہ سین بھی نکال دیا جائے گا۔ سیٹھوں کا نمائندہ وہ تمام فقرے اور سین نکلوا دیتا ہے جس میں پیسے والوں پر طنز کا پہلو ہے کیونکہ ساری خرابیاں طبقاتی شعور ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیب کتروں کا نمائندہ اس سین پر اعتراض کرتا ہے جس میں ہیرو کی جیب کٹ جاتی ہے۔ اس کا اعتراض بھی بجا ہے۔ اس قسم کے مناظر سے ایک خاصے بڑے طبقے یعنی حبیب کتروں کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عداوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ فلم پروڈیوسر یہ اعتراض نوٹ کرنے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو اپنا پارکر پین غائب پاتا ہے۔ جیب کتروں کا نمائندہ پین اس کو واپس کرتے ہوئے کہتا ہے۔ اب تو ثبوت مل گیا نہ کہ جیب کُترے بھی شریف آدمی ہوتے ہیں۔

ان مراحل سے گزر کر ہم فلم کے آخری سین پر آتے ہیں اور سنسر بورڈ یہ حکم دینے کو تیار ہوتا ہے کہ یہ تو چند مناظر ندی نالوں اور چوپال کی گپ شپ اور دلہن کے سولہ سنگار وغیرہ کے بلا اعتراض ہو گئے ہیں ان کو پاس کیا جاتا ہے کہ اتنے میں ایک صاحب آنکھوں میں لپ لپ سرمہ، کاندھے پر رومال، پہلے ہاتھ کھڑا کرتے

ہیں، پھر خود اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ ”حضرات! میں ہوں انجمن اصلاحِ اخلاق کا نمائندہ۔ میں فلم بنانے کے کاروبار کو سراسر خلافِ شرع سمجھتا ہوں۔ بند کیجئے فلم اور فلمساز دونوں کو ڈبے میں۔ کیا یہ ملک اس لیے بنایا گیا تھا کہ یہاں فلمیں بنیں؟“

رباعی سے رکابی تک

کیا مرد واقعی سست اور بے سلیقہ ہوتے ہیں؟ ہمارے اس سے اختلاف یا اتفاقِ رائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ عمومی رائے یہی معلوم ہوتی ہے۔ اسی صفحے پر آپ ایک کارٹون دیکھیں گے۔ میاں نے لمبے ڈنڈے والے جھاڑو سے فرشوں کی صفائی کرنے کے بعد باورچی خانے میں بہت سی پلیٹیں دھولی ہیں لیکن ابھی کچھ باقی بھی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں میاں نے کچھ زیادہ دیر لگادی ہے کیونکہ بی بی پہلے اپنے کمرے میں بیٹھی ریڈیو سنتی رہیں پھر ڈرائنگ روم میں رسالوں میں تصویریں دیکھتی رہیں۔ آخر اس سے بھی اکتا گئیں۔ کارٹون میں وہ میاں سے کہہ رہی ہیں۔ ”ذرا

جلدی کام کیا کرو جی! میرا بھی کچھ خیال ہے؟ کتنی دیر سے اکیلی بیٹھی بور ہو رہی ہوں۔"

یہ مسئلہ بہت سے گھروں کا ہے۔ مرد لوگ گھر کی صفائی، چائے بنانے، برتن دھونے وغیرہ میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ بیویاں عاجز آ جاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے، صبح کا وقت ہے۔ بیوی بستر میں پڑی ہیں، میاں چائے دانی بھر کر ان کے بستر کے پاس کی میز پر رکھ تو گئے لیکن پھر جا کر فرش رگڑنے لگے یا ناشتہ بنانے لگے۔ اتنا خیال نہیں چائے بنا کر بھی دینی ہے۔ ادھر بیوی ایک ہاتھ سے اخبار تھامے اسے پڑھ رہی ہیں دوسرے سے سر کھجا رہی ہیں۔ ان کا کوئی ہاتھ خالی ہوتا تو شائد خود بھی بنا لیتیں۔ میاں صاحب ناشتہ بنا کر بچوں کو نہلانے اور کپڑے بدلنے میں بٹ جائیں گے۔ اور پھر اپنے اور بیوی کے جوتے پالش کرنے کے بعد ان کو دفتر جانے کی جلدی پڑ جائے گی۔ شام کو آتے ہی باورچی خانے میں جا گھسیں گے یا غسل خانے میں بیٹھ کر بچّوں کے کپڑے دھوئیں گے۔ اس سے فارغ ہوئے تو کچھ سلائی کا کام لے بیٹھیں گے۔ قمیصوں کے بٹن ٹانک رہے ہیں، جرابیں رفو کر رہے ہیں، گلدان سجا رہے ہیں۔ گویا ہر چیز کا خیال ہے۔ نہیں خیال تو بیوی کا جو اپنے کمرے میں پڑی برابر ریڈیو سن رہی

ہیں یا معمّے حل کر رہی ہیں اور بور ہو رہی ہیں۔ میاں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آ کر ان کے پاؤں ہی داب دے۔

ایک صاحبہ نے پچھلے دنوں ایک مضمون میں اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی اور اشارۃً کہا تھا کہ مردوں کو خانہ داری کی تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ شوہر صاحب علی الصبح بیوی کو بستر ہی میں چائے کی ایک گرما گرم پیالی بنا کر دے دیا کریں تو یہ معمولی سی بات باہمی محبت میں اضافے کا موجب ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اس بات کا شکوہ بھی کیا کہ بہت سے مردوں کو سویٹر بُننے نہیں آتے۔ حالانکہ یورپ میں چند صدی پیشتر یہ کام مرد ہی انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے انہوں نے کئی فائدے بھی گنواتے تھے کہ سویٹر بُننے سے سگریٹ پینے کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ وہ یوں کہ سگریٹ کا گُل جھاڑنے کے لیے ہر بار سلائیاں ہاتھ سے رکھنی پڑتی ہیں۔ اور یہ سلائیاں چلانا اتنا دلچسپ شغل ہے کہ چند دن کے بعد مرد سگریٹ پر لعنت بھیج دے گا کہ اس سے سویٹر بننے کا مزا کِرکِرا ہوتا ہے۔

ہماری رائے میں مردوں کے لئے شروع ہی میں اس قسم کی تربیت کا بندوبست ہو تو اچھا ہے۔ مثلاً ان کی تعلیم میں خانہ داری کا مضمون ضرور ہونا چاہیے۔ اور اسکولوں

میں انہیں آٹا گوندھنا، روٹی پکانا، طرح طرح کے سالن تیار کرنا، بچّوں کی نگہداشت، گھر کی صفائی وغیرہ سکھانے کا عملی انتظام ضرور ہو تاکہ شادی کے بعد گھر سنبھال سکیں۔ اس خیال میں نہیں رہنا چاہیئے کہ پڑھ لکھ کے گریجویٹ ہو گئے ہیں اور برسرِ روزگار ہیں تو لڑکیوں کے والدین ان کے گھر کے چکّر کاٹنے شروع کر دیں گے۔ اب تو ضرورتِ رشتہ کے اشتہار میں بھی یہ قید لگا دی جائے گی کہ لڑکا قبول صورت اور پابندِ صوم و صلوٰۃ ہونے کے علاوہ گھر داری کا سلیقہ رکھتا ہو۔ سینا پرونا جانتا ہو۔ آٹھوں گانٹھ کمیت ہو۔ جہیز کی کوئی قید نہیں۔ جتنا زیادہ لا سکے لے آئے۔ لڑکی کی والدہ جب لڑکے کو دیکھنے آئیں گی تو لڑکے والے اس امر کا اہتمام کریں گے کہ اس وقت لڑکا حیا کی سرخی چہرے پر لیے باورچی خانے میں بیٹھا آلو گوشت پکا رہا ہو اور آٹا گوندھ کے ایک طرف رکھ چھوڑا ہو۔ لڑکے کی والدہ بہانے بہانے اپنی ہونے والی یا نہ ہونے والی سمدھن کو بتائے گی کہ یہ ساری چادریں اور غلاف میرے بیٹے نے کاڑھ رکھے ہیں۔ اپنے کالج میں سلائی کڑھائی میں ہمیشہ اوّل آتا رہا ہے۔ کھانا پکانے کی تربیت بھی ہم نے اچھی دلائی ہے۔ کچھ مہینے تو اس نے شہر کے مشہور مسلم کالی ہوٹل میں خانساماں کا کام کیا ہے۔ اور بیاہ شادیوں میں دیگیں پکانے بھی

جاتا رہا ہے۔ اُدھر سمدھن اپنی بیٹی کے گُن گائیں گی کہ بہت خلیق اور ہنس مکھ ہیں۔ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اس لئے سہیلیوں کو لیے اکثر باغوں کی سیر کرتی رہتی ہیں۔ تصویریں بھی بناتی ہیں۔ آرٹ کونسل کی نمائش میں پہلا انعام انہی کو ملا۔ وہ یوں کہ انہوں نے طوطا بنایا تھا۔ کسی نے اسے گھوڑا بتایا، کسی نے درخت، کسی نے آٹا پیسنے کی چکی۔ صحیح کوئی نہ بتا سکا۔ فلم کوئی نہیں چھوڑی اور مطالعے کا ایسا شوق ہے کہ پاکستان کا کوئی فلمی رسالہ نہیں جو نہ منگاتی ہوں۔ گاتی بھی ہیں، ٹکٹ جمع کرنے اور قلمی دوستی کا شوق ہے۔ ہم نے اس بات کی احتیاط رکھی ہے کہ کھانے پکانے اور صفائی دھلائی سے اس کے ان اشغال میں ہرج نہ واقع ہو۔ یوں بھی ان کے ابّا پرانی وضع کے ہیں۔ ان امور میں عورتوں کا عمل دخل پسند نہیں کرتے۔ اب میں مطمئن ہوں کہ جیسا بر میں چاہتی تھی ویسا اللہ نے دے دیا۔

شاہی ممیرے کا فقیری سرمہ

ایک صاحب روتے بسورتے نقش فریادی بنے ہمارے پاس آئے۔ ہاتھ میں ٹیلیویژن والوں کا ہدایت نامہ مشتہرین تھا۔ ہم نے کہا خیریت؟ بولے۔ ''آپ عوام کے ہمدرد ہونے کے مدعی ہیں۔ اک ذرا ہماری بھی دادرسی کیجئے۔ آخر ہم بھی تو عوام ہیں اور عوام ہی کی جیبیں کاٹ کر روٹی کھاتے ہیں۔''

ہم نے اپنی جیب کو ٹٹول کر اور اطمینان کر کے انہیں عزت سے بٹھایا اور پوچھا شکایت کیا ہے؟

بولے۔ ”میں ٹیلیویژن والوں کے ہاں ایک اشتہار لے کر گیا تھا۔ انہوں نے واپس کر دیا کہ اس سے مبالغے کی بو آتی ہے۔ ہمارے ہاں نہیں چلے گا۔“

”آپ بیچتے کیا ہیں؟“ ہم نے کہا۔ ”ذرا دیکھیں تو کون سا اشتہار ہے جو ان لوگوں نے واپس کر دیا۔“

انہوں نے ایک پرچی ہمیں دکھائی جس پر لکھا تھا۔

”اندھے پٹ پٹ دیکھنے لگے۔“

”کانے دو آنکھوں والے ہو گئے۔“

”شاہی ممیرے کے فقیری سرمے کی کرامات“

ہم نے کہا۔ ”ہمیں تو اس اشتہار میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ بہر حال اگر اس میں کوئی مبالغہ ہے تو اسے نکال دیجئے نا۔“

فرمانے لگے۔ ”مبالغہ نکال کر اس میں رہے گا کیا۔ آپ نے سنا نہیں کہ سانچ کو آنچ ہے۔ اگر میں یہ انکشاف کر دوں کہ اس سرمے میں ممیرہ نہیں اور نہ مجھے معلوم ہے

کہ ممیرہ کیا ہوتا ہے تو پھر مجھے آبائی پیشے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یعنی سائیکلوں کے پنکچر لگانے پڑیں گے۔"

ہم نے ان کے ہاتھ سے ہدایت نامہ لے کر دیکھا واقعی پہلی شرط یہ تھی کہ اشتہار ایماندارانہ اور سچا ہو یعنی چھوٹتے ہی اشتہار بازی کے فلسفے کی بنیاد پر ضرب لگائی گئی تھی۔ اب ہم نے دوسری شرطوں پر نظر ڈالی۔ ایک یہ تھی کہ مردہ شوئی اور گورکنی کے اشتہارات قابلِ قبول نہیں۔ کیوں قبول نہیں اس کی کچھ وجہ بیان نہیں کی گئی۔ اکسیری گولیاں، فقیری ٹوٹکوں، طلسمی تعویذوں اور حکیمی علاجوں پر بھی قدغن ہے۔ حتیٰ کہ کوئی شخص محض مردے کو زندہ کرنے کا دعوی کرے تو ٹیلیویژن والے اس کی صحت پر شبہ کر کے اسے رد کر دیں گے۔ معمّوں اور جوئے کے اشتہار بھی نہ چاہئیں۔ ضرورتِ رشتہ بھی مطلوب نہیں۔ جسم کو دُبلا اور سڈول بنانے اور بیٹھے بیٹھے قد بڑھا دینے والی گولیوں کے اشتہار بھی ممنوع۔ سگریٹ کے اشتہار ضرور آ سکتے ہیں بشرطیکہ ان میں سگریٹ کی تعریف نہ کی گئی ہو۔ ایسے اشتہارات بھی جن میں بد ذوقی کا غُل غپاڑہ ہو، کانوں کے پردے پھٹتے ہوں، شکریے کے ساتھ واپس کر دیے جاتے ہیں۔ وغیرہ۔

یہ شرطیں اس کتابچے میں لکھی ہوتی تو ضرور ہیں لیکن ہماری دانست میں ٹیلیویژن کے شعبہ اشتہار والے جن میں بعض نامی گرامی اور اشتہاری ادیب شامل ہیں اتنے سخت دل نہیں ہو سکتے۔ رعایت بھی برتتے ہوں گے۔ ٹیلیویژن والوں نے تو مفت تحفے دینے والے ان اشتہاروں پر بھی پابندی عائد کر رکھی ہے جن میں زور بجائے اصل چیز کے تحفے پر ہوتا ہے۔ اس سے یاد آیا کہ کوئی دو سال پہلے ہمارے شہر کے ڈرائی کلینروں میں تحفوں کی دوڑ ہوئی تھی۔ اگر کوئی شخص اپنی قمیص یا رومال بھی دھلاتا تھا تو اسے اپنی چیز اس وقت تک واپس نہ ملتی تھی جب تک وہ ساتھ مفت کوئی تحفہ قبول نہ کرے۔ ایک ڈرائی کلینر نے تو یہاں تک اعلان کیا تھا کہ آیئے اور ہمارے ہاں کے تحفے لیجئے۔ کپڑے خواہ کیسی اور جگہ سے دھلوایئے۔ ایک لانڈری والے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور منادی کرائی کہ ہمارے ہاں سے تحفے لے جایئے۔ کم از کم پانچ روپے کے تحفے مفت قبول کرنے والے کو ایک سوٹ بھی مفت دھو کر دیا جائے گا۔

ہمارے نزدیک یہ پابندیاں ہماری ملکی ترقی کی راہ میں ناروا رکاوٹ ہیں۔ اگر کہیں ہمارے اخبارات بھی اس قسم کا ضابطہ سامنے رکھتے تو آج اکسیری گولیوں، جاپانی

چھلّوں اور انگوٹھیوں، حبشیوں کو ایک دم گورا کرنے والے لوشنوں اور قد بڑھانے والی معجزاتی دواؤں کو یہ فروغ نہ حاصل ہوتا۔ نہ لوگوں کی بگڑی بنانے والوں اور بنی بگاڑنے والوں کے کاروبار میں اتنی برکت ہوتی۔ ہم ٹیلیویژن والوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا واقعی سانچ کو آنچ نہیں ہے! اگر ان کے پاس واقعی سو فیصدی سچے اور ایماندارانہ اشتہار آنے شروع ہو گئے تو وہ انہیں دیں گے؟ مثلاً یہ۔

(۱)

ہماری پیشکش افلاطونی سگرٹ۔ ایک بار پیجیئے۔ ہمیشہ کے لیے آپ اس کے ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ گلے میں خراش ڈالتا ہے جو مستقل کھانسی میں بدل جاتی ہے۔ اس میں تمباکو کے علاوہ اس کا نعم البدل گھوڑوں کی لید بھی شامل ہے۔ مسلسل پینے والوں کو کینسر ہونے کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ عوام کا من پسند افلاطونی سگرٹ۔

(۲)

سلیمانی چائے۔ نہایت خوبصورت نئے ڈبے میں۔ یاد رہے کہ صرف ڈبّا نیا ہے۔ اندر اس کے وہی استعمال شدہ پتی اور چنے کے چھلکوں کا مرکب ہے۔ آپ کے نفع نقصان سے ہمیں غرض نہیں۔ سلیمانی چائے پیجئے اور ہماری تجارت کو فروغ دیجئے۔

(۳)

فٹافٹ ڈرائی کلینرز۔ آیئے اور اپنے کپڑے ہمارے ہاں سے ڈرائی کلین کرائیے۔ ہم گاہکوں سے تو کچھ بھی کہیں دراصل تمام کپڑے دھوبی گھاٹ کے تالاب میں ڈرائی کلین کرتے ہیں۔ ہمارے شوروم میں آپ کو جو مشین نظر آتی ہے وہ ڈرائی کلین کرنے کی نہیں، آئس کریم بنانے کی ہے۔ وہ بھی ناکارہ۔

اور آخر میں ہمارے ان کرم فرما کا یہ اشتہار ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔

"شاہی ممیرے کا فقیری سرمہ۔ صاحبو۔ میں نے ڈاکٹر ہوں، نہ حکیم۔ سرمے کے بہانے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوں۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اس سرمے کا جزوِ اعظم واقعی دھول ہے۔ ہاں اس میں تھوڑا پیپر منٹ ملا دیا

جاتا ہے۔ ہر شیشی پر ہمارا خرچ تو صرف پانچ پیسے آتا ہے لیکن چونکہ تھوڑا نفع لینا حرام ہے لہٰذا اپنے مہربانوں کے لئے قیمت ہے، تین روپے"

جھوٹ سچ کا ذکر بر طرف۔ اشتہار ہماری کمزوری ہیں۔ اگر اسے ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگراموں پر بالواسطہ رائے زنی سمجھا جائے تو یہ عرض کریں کہ ہم ریڈیو اور ٹیلیویژن دیکھتے اور سنتے ہی ان کے لیے ہیں اور گوش نصیحت نیوش اور دیدہ عبرت نگاہ کو کام میں لاتے ہیں۔ پہلے ہمیں اشتہاروں کے لئے کسی آئٹم یعنی تقریر یا ڈرامے کے پورا ہونے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہر آئٹم کے درمیان بھی کٹ کر کے اشتہار دیے جانے لگے ہیں۔ رمضان کے فضائل پر مولانا بلغ العلیٰ کی تقریر ہو رہی ہے اور یکلخت مسلم ریستوران کا اشتہار نمودار ہوتا ہے۔ لذیذ کھانوں کے لیے مسلم ریستوان میں تشریف لایئے۔ رمضان کے دوران پردے کا بھی معقول انتظام ہے۔ آپ ہمارا اسپیشل رمضان لنچ گھر پر بھی منگوا سکتے ہیں۔

اب تک خبروں میں یہ التزام نہ تھا۔ شروع سے آخر تک سوکھی خبریں سُننی پڑتی تھیں۔ بارے کل ہم نے یہاں بھی خبروں اور اشتہاروں کو تو من شدی من تو شدی دیکھا نیوز ریڈر کا چہرا نمودار ہوا۔

آج صدر جانسن نے اعلان کیا ہے کہ۔۔۔۔(خبر کٹ۔ اشتہار شروع)

"آپ کا محبوب ماما گھی اب دو پونڈ کے مُہر بند ڈبوں میں بھی دستیاب ہے۔ یاد رکھیے۔۔۔"

"ہوائی جہاز صرف شمالی ویتنام کے سرحدی علاقوں پر بمباری کیا کریں گے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخابات میں کھڑے ہوں گے تو انہوں نے فرمایا۔۔۔۔۔۔"

"امّی بھی کھائیں۔ ابّو بھی کھائیں۔ کھائیں دادا جان۔"

"جب صدر ڈیگال سے صدر جانسن کے اعلان پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو وہ بولے۔"

"آپ عالم جی کے دھاگے استعمال کیجئے۔ میں ہمیشہ یہی استعمال کرتا ہوں۔"

ڈرامے میں بھی آپ دیکھیں گے کہ لق و دق جنگل ہے۔ ہیروئن لاچار، بے یار و مددگار آرکسٹرا کی مغموم بیک گراونڈ دُھن پر گلیسرین کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔ یکایک سینے پر دوہتڑ مار کر گِر جاتی ہے۔ "ہائے اللہ میں کیا کروں؟" یکایک ایک صاحبہ کا چہرہ سولہ بلکہ بتیس سنگار میں نمودار ہوتا ہے۔

"بہن یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بُل ٹیکس کی چار دریں خریدیئے۔ کم خرچ۔ پائیدار اور رنگ پکّے۔"

ذکر ایک موٹر شناس کا

پچھلے دنوں اخبار میں ہمارے دوست نقش زبیری کا احوال ''آج کا شاعر'' کے سلسلے میں چھپا ہے۔ نقش زبیری تو ہم رواروی میں لکھ گئے۔ ہماری مراد شمس زبیری سے ہے۔ نقش تو ان کے پرچے کا نام ہے جس کی جمع نقوش محمد طفیل صاحب لاہور سے نکالتے ہیں۔ ان واحد اور جمع میں ایک بار ٹھن بھی گئی تھی۔ لیکن وہ ایک الگ قصّہ ہے۔لوگوں نے یہ پڑھ کر مصالحت کرادی تھی کہ

اصل نقوش و نقش و مناقوش ایک ہے

حیران ہیں یہ مناقشہ ہے کس حساب میں

شمس صاحب سے ہماری یاد اللہ بہت پرانی ہے۔ ان کی خوبیوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اظہر من الشمس ہیں۔ وہ شاعر ہیں اور ایسے ویسے نہیں بلکہ مراد آبادی۔ اسے ہماری کمزوری جانیے کہ ہمیں مراد آباد کی ہر چیز پسند ہے۔ شاعر بھی، برتن بھی اور مردے بھی جو زندہ ہو جاتے ہیں۔ وہ فقط شاعر نہیں۔ کیونکہ شاعر تو ہم بھی ہیں۔ بلکہ عروضی بھی ہیں۔ عروض وعلم ہے جو اخفش مرحوم نے اپنی بکری کی مدد سے ایجاد کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری تو کر لیکن از زحافات عمل غافل مشو۔ اس فن میں وہ مہارت ہے کہ بڑے بڑوں کے چراغ ان کے سامنے نہیں جلتے۔ جیسا کہ اس مذکورو بالا مضمون میں لکھا ہے، وہ مرغبانی کے بھی ماہر ہیں۔ مرغ کا ماہر تو ہر مسلمان طبعاً ہوتا ہے لیکن بالعموم کھانے کی حد تک۔ مرغبانی اس سے ایک الگ چیز ہے۔ لوگ دور دور سے ان سے مرغیوں کے علاج کے نسخے پوچھنے آتے ہیں۔ تاکہ بیماریوں سے انہیں بچا سکیں اور موٹی کر کے کھا سکیں۔ موٹر کی مرمت بھی ایسی کرتے ہیں کہ مکینکوں اور مستریوں کو کان پکڑواتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن توڑنا جوڑنا بھی خوب جانتے ہیں اور یونانی طب اور ہومیو پیتھی وغیرہ میں بھی دخل در معقولات کر لیتے ہیں۔ گویا یہ ایک انار سو بیماروں کا علاج ہے۔

ایسے جامع حیثیات لوگوں پر ہمیں ہمیشہ رشک آیا ہے۔ ہم صدا سے یک فنے ہیں۔ بس لکھنے پڑھنے کی شُد بُد تو رکھتے ہیں لیکن نہ چارپائی ٹھونکنی آئی نہ جانوروں کا علاج معالجہ ہمارے بس کی بات ہے۔ حتیٰ کہ بال کاٹنے کے فن شریف تک سے واقف نہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ میرؔ کی طرح خوار پھرتے ہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ اس کے مقابلے میں شمس صاحب کو دیکھئے کہ ایک نہیں دو دو تین تین رسالے نکالتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی فیض رسانی کے دریا بہاتے ہیں۔ ان کے دفتر جایئے تو یہ نقشہ نظر آئے گا کہ میمنے میسرے پر کاتبوں کے پرے جمے ہیں۔ جو می نویس و می نویس و می نویس کرتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف بینچ پر احباب مرغیاں بغل میں دابے بیٹھے ہیں۔ ایک صاحب ٹنڈو آدم کے مشاعرے کا دعوت نامہ انہیں دے رہے ہیں کہ ضرور قدم رنجہ فرمایئے گا۔ اور غزل کے علاوہ بستر اور چند ایک خوش گو شاعر بھی ہمراہ لایئے گا۔ ادھر ایک صاحب نے ایک پنشن خوار ٹرانزسٹر ان کی میز پر لا پٹکا ہے۔ حضرت یہ ریڈیو کا ساز بھی کیا ساز ہے، بج رہا ہے اور بے آواز ہے۔ ایک صاحب ٹیلیویژن چادر میں باندھ کر لائے ہیں اور شکایت کر رہے ہیں کہ نہ جانے کیا خرابی ہو گئی ہے اس میں، کوئی ڈھنگ کا پروگرام ہی نہیں آتا۔ ڈرامے پھسپھسے،

گانے بے سُرے اور جانے کون سی گھنڈی خراب ہو گئی ہے کہ آدھے پروگرام اس میں انگریزی اور بنگلہ کے آتے ہیں۔ آپ مشورہ دیں تو اسے بیچ کر دوسرا ٹی وی سیٹ خرید لوں؟ ایک صاحب کے موٹر کے کاربوریٹر میں کچھ خرابی ہے۔ وہ بھی مفت مشورے لینے کو موجود بلکہ شمس صاحب کا دامن کھینچ رہے ہیں کہ موصوفہ نیچے کھڑی ہیں۔ ٹک نظرِ کرم کی بھیک ملے۔ نقش کے تازہ شمارے کا اداریہ بھی ساتھ ساتھ لکھا جا رہا ہے۔ اور منشی کو بھی ہدایت کر رہے ہیں کہ فلاں اشتہار کے پیسے جا کر لے آئے اور پریس میں بیس ریم کاغذ بھی دیتے آیئے۔ مخاطب سے بھی بات ہو رہی ہے کہ ہاں صاحب کیا مصرع طرح ہے مشاعرے کا۔ ''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا؟'' اس میں قافیہ میسر رہے گا یا انسان؟ اور شیخ صاحب اپنی مرغی کو لے جا کر ایک خوراک ٹنکچر آڈیوین کی دے دیجئے اور اس کے سر میں روغن آملہ کی مالش کیجئے۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی اور ہاں مرزا جی آپ کے ریڈیو سیل ختم ہو گئے ہیں۔ بازار سے جا کر لیجئے اور ڈالیئے۔ اچھا تو مضطر صاحب آپ کی غزل میں نے دیکھ لی۔ اسے ہم بحر متقارب مثمن مجنث بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور بحر منسرح متدارک چار رکنی بھی۔ آپ کی غزل میں ایطائے جلی بہت رہتا ہے۔ اس

کی مقدار کم کیجئے گا۔ ہاں تو احسان صاحب آپ کو بھی نسخہ دیتا ہوں۔ اپنی بیگم کو آرنیکا دن میں چار بار دیں۔ ۱۰۰ کی پوٹینسی میں اور خود ضعفِ دماغ کے لیے جوارش جالینوس، معجون فلاسفہ او ترپھلا کا استعمال جاری رکھیں۔ احمد میاں آپ نے اپنے کاربوریٹر میں پانی ڈالا ہوتا۔ اس کو آپ خشک چلاتے ہیں تبھی تو آپ کے ٹائر اتنی جلدی گھِس جاتے ہیں اور ہارن خراب ہو جاتا ہے۔ کاتب صاحب شور مت مچایئے۔ آپ ہی کے لیے لکھ رہا ہوں اداریہ۔ ہاں تو میں کیا لکھ رہا تھا۔ ”فی زمانہ ادب اور زندگی کا رشتہ ایسا پیچیدہ ہو گیا ہے اور اس کے مہیجات۔۔۔“

کن نصیبوں پر ہوئے موٹر شناس۔ شمس صاحب کی رکاب میں ہم نے ہر بھانت کی، ہر سائز کی، ہر نسل اور ہر عمر کی موٹریں دیکھیں۔ ہم کئی بار ان کی معیّت میں سفر کر چکے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایسا اعجاز ہے کہ موٹر میں سیٹیں نہیں ہیں اور چل رہی ہے۔ نمبر پلیٹ نہیں اور چل رہی ہے۔ پٹرول نہیں اور چل رہی ہے۔ حتیٰ کہ انجن نہیں اور چل رہی ہے۔ ایک بار کوئی شخص پرانی موٹر نوچ کھسوٹ پہیے اتار کوڑے پر پھینک گیا۔ شمس صاحب کا اُدھر سے گزر ہوا۔ کہنے لگے۔ اصل نسل کی تو اچھی ہے۔ جا کے اس کی سیٹ پر بیٹھے۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو اپنے غسل خانے کی چابی مل

گئی۔ وہی اس میں لگ گئی اور موٹر اسٹارٹ۔ یہ بہت دن پہلے کی بات ہے۔ یورپ والوں نے تو بغیر پہیے والی موٹریں اب آکر بنانی اور چلانی شروع کی ہیں۔

یہ نہ خیال کیا جائے کہ ان کو موٹریں ہمیشہ مفت کوڑے میں پڑی مل جاتی ہیں۔ بے شک ان کی حالت اور شکل کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے لیکن اکثر ان میں سے زرِ کثیر خرچ کر کے خریدی جاتی ہیں۔ ایک روز ہم جہانگیر روڈ سے ان کے ساتھ بیٹھے۔ ہم نے کہا یہ البیلی کار ہم نے پہلے تو نہیں دیکھی۔ کب لی؟ کتنے میں لی؟ فرمایا۔ ابھی کل ہی تو لی ہے۔ چوالیس روپے میں پینتیس روپے دے دیے ہیں۔ نو روپے ابھی دینے ہیں۔ تین تین روپے کی تین قسطوں میں موٹر کو بلا پٹرول اور بلا انجن کے چلانے کا تجربہ رسالے میں ان کے بہت کام آیا۔ ان کے پاس روپیہ نہیں اور نقش چل رہا ہے بلکہ پیسوں والے پرچے اتنا اچھا نہیں چلتے۔ شادی نہیں کی اور زندگی اچھی خاصی گزار رہے ہیں۔ بس ایک معاملے میں آکر رہ جاتے ہیں۔ شعر بغیر وزن کے نہیں لکھ سکتے۔ ایک نہ ایک تو کمزوری تو ہر شخص میں ہوتی ہے نا۔

ذکر حضرت مریض الملّت کا

ہمارے مخدوم حضرت حفیظ جالندھری کا ایک سرٹیفکیٹ آج کل ایک چورن کے اشتہار کے ساتھ باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ یہ ایک خط ہے جو انہوں نے اس چورن کے موجد حکیم صاحب کو لکھا ہوگا کہ ”مکرمی، آپ نے جو ہاضمے کی گولیاں تیار کی ہیں۔ سبحان اللہ مجھے ان سے بہت آرام ہے۔ براہ کرم ایک ڈبّہ ان گولیوں کا اور بھیج دیجئے۔“

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ہمارے شاعر پہلے شاعری کرتے ہیں پھر نثر سے منہ میٹھا کرتے ہیں اور آخر میں تیر بہدف، اکسیری دواؤں، جاروب معدہ چورنوں، بلا درد

دانت اکھاڑنے والے منجنوں اور عینک توڑ سرموں کے سرٹیفکیٹ لکھتے ہیں۔ پہلی دو نوبتیں تو خیر ہم پر بھی آچکی ہیں۔ تیسری کا انتظار ہے۔ حفیظ صاحب سے اگر ہمیں شکایت ہے تو یہ کہ ہم ان کے بہت قریب رہے ہیں۔ نہایت نیاز مند بلکہ فیضان کے لحاظ سے شاگرد رشید۔ کئی بار ان سے درخواست کی کہ قبلہ ہماری شاعری کے متعلق کوئی سرٹیفکیٹ عنایت ہو۔ اس قسم کا کہ ''میں نے حضرت ابنِ انشا کا کلام استعمال کیا۔ اس سے مجھے بہت افاقہ ہے۔ یہ چربی سے پاک ہے۔ اور وٹامن سے بھرپور۔'' چاہتے تو ہمارے نام خط بھی لکھ سکتے تھے کہ ''مکرمی اپنے مجموعۂ کلام کی دس جدید وی پی سے بھیج دیجئے۔ تاکہ بیٹھا پڑھتا رہوں۔ اور استفادہ کرتا رہوں۔'' اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری اپنی سرکولیشن تو خاصی ہے، جگہ جگہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا سرٹیفکیٹ نہ ہونے کے باعث ہماری شاعری رہی جا رہی ہے۔ اور تو اور ریڈیو پاکستان والے تک جو ہر روز سائل جھنجھانوی اور گھائل گورداسپوری کے سے شاعروں کی غزلیں گواتے ہیں اور معیار کے بارے میں متعصّب نہیں ہیں۔ ہمیں شاعر نہیں جانتے۔ حفیظ صاحب سے مایوس ہو کر بلکہ انتقاماً کہیے۔ حال ہی میں ہم نے ایک حکیم حاذق سے سرٹیفیکیٹ حاصل کیا ہے کہ ابنِ انشا صاحب کی

شاعری نفخ کو نافع ہے۔ خونِ صالح پیدا کرتی ہے۔ اگر خالص گھی سونے کے کشتے سے بہتر ہے تو انشا صاحب کی شاعری خالص گھی سے بھی بہتر ہے۔ اس سند کے ساتھ ہم نے اپنا مجموعہ بجائے کتب فروشوں کے عطّاروں اور دوا فروشوں کے ہاں رکھوا دیا ہے۔ بسوں میں بھی فروخت ہوتا ہے۔ جس بھائی کو ضرورت ہو آواز دے کر طلب کرے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم چورن کی افادیت سے منکر ہیں یا اسے شاعری سے کم درجے کی چیز سمجھتے ہیں۔ جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ چورن تبخیر کو دور کرتا ہے۔ جب کہ شاعری معدے میں تبخیر پیدا کرتی ہے۔ شاعر کے معدے میں شعر لکھنے کے فوراً بعد ایک باؤلا گولا سا اٹھتا ہے اور وہ سامعین کی تلاش میں آدم بُو آدم بُو پکارتا بھٹکتا پھرتا ہے۔ کوئی اور سخن شناس نہ ملے تو کسی آتے جاتے پھیری والے یا ریڑھی والے ہی کو روک لیتا ہے اور کلام عطا فرما کر اپنی تبخیر کو اس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ جس علاقے میں شعر و شاعری کا زیادہ چرچا ہو وہاں فقط اسپرو ہی کی نہیں بلکہ سوڈا واٹر کی بوتلوں، کارمینا، مولی کے نمک اور تمباکو والے پانوں کی کھپت خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ ملال صرف یہ ہے کہ

محض اس وجہ سے کہ ہم شعر بناتے ہیں، چورن نہیں بناتے۔ ہم حفیظ صاحب کی نظروں میں بار نہ پا سکے۔ سنا ہے علامہ اقبال مرحوم بھی ایسی ہی غیر فیّاض طبیعت کے مالک تھے۔ ان کا ایک سرٹیفکیٹ ایک مرہم کے بارے میں تو کوئی چالیس برس سے چھپ رہا ہے کہ یہ چیز ناسور بھگندر، دادر، خارش اور مغلئ پھوڑے کا حکمی علاج ہے لیکن کسی ہم عصر شاعر کے دل پر انہوں نے تعریف کا پھاہار کھا ہو یہ ہمیں نہیں معلوم۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ہمارے حفیظ صاحب کو دواؤں سے بھی اتنا ہی شغف ہے جتنا شاعری اور قوم کی خدمت سے۔ ہم پہلی بار ملے تو یہی سمجھے کہ کوئی خاندانی طبیب ہیں۔ دیکھا کہ فرش پر دری بچھی ہے۔ دری پر قالین بچھا ہے۔ قالین پر بستر بچھا ہے۔ اور بستر پر ہمارے حفیظ صاحب بچھے ہیں بلکہ بچھے جا رہے ہیں۔ قریب ایک الماری دھری ہے کہ جب ذرا گردن اٹھاتی دیکھ لی۔ اس کے نیچے کے خانے میں شاعری کے بستے اور خام مال یعنی مضامین تازہ کے انبار اور قافیوں ردیفوں کے بقچے دھرے ہیں۔ اس سے اوپر کے خانے میں معجونیں ہیں، جوشاندے ہیں۔ عرق ہیں، شربت ہیں۔ اس سے اوپر آیئے تو قطار در قطار

ہومیوپیتھی کی گولیوں کی شیشیاں بھی ہیں۔ چوتھا خانہ انگریزی دواؤں کے لئے مخصوص ہے۔ گولیاں، پوڈر، کیپسول، انجکشن، تھرمامیٹر وغیرہ۔ سب سے اوپر کا تختہ آیورویدک اور سنیاسیوں کی عطیہ دواؤں کے حصّے میں آیا ہے۔ اس پر مختلف جڑی بوٹیاں ایک کھرل، گھیکوار کا تازہ گچھا، نیم کی نمولیاں حتیٰ کہ ایک نیولا بھی پڑا ہے۔ معلوم نہیں مردہ ہے یا جان کے خوف سے دم سادھے بیٹھا ہے۔ کچھ واجبی سی گفتگو تو شاعری کے بارے میں ہوئی۔ اس کے بعد فرمایا۔ ''تمہارے چہرے پر زردی سی کیوں ہے۔ اختلاج تو نہیں ہوتا۔ کنپٹیاں تو درد نہیں کرتیں۔ اور دن کو تارے تو نظر نہیں آتے؟'' ہم نے قبول دیا کہ یہ آخری علامت درست ہے۔ فرمایا کل اپنی غزلوں کا دیوان اور قارورہ لے کر آنا اور آج کے لئے یہ نسخہ نوٹ کرلو۔ سلفاڈائزن نیکس وامیکا اور مصطگی رومی ایک ایک تولہ لے کر گھیکوار کے رس میں کھول کرو اور پھر خمیرہ گاؤزبان میں رکھ، ورق نقرہ پیچیدہ، شربت دینار کے ادّھے کے ساتھ نوشِ جان کر جاؤ۔''

ہم نے کہا۔ ''شربتِ دیدار؟ یہ کہاں سے ملے گا؟''

بولے ''شربتِ دیدار نہیں بے وقوف۔ شربتِ دینار''

ڈاکٹر اقبال ڈاکٹر تو تھے ہی خواہ نام ہی کے تھے۔ کیونکہ انجکشن وہ نہ لگا سکیں، مکسچر وہ نہ دے سکیں اور فیس وہ نہ لے سکیں۔ اس پر عقیدت مندوں نے انھیں حکیم الامت کا لقب بھی دے دیا۔ وہ آخری عمر تک حکیموں کے زیرِ علاج ضرور رہے اور یہ سچ ہے کہ انھی کے ہاتھوں مرے۔ لیکن خود طبابت بھی کی ہو، یہ کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ اس کے مقابلے ہیں حفیظ صاحب کو یہ کہ ان کی ساری عمر بیماریوں اور دوائیں کے دشت کی سیّاحی میں گزری ہے۔ لوگوں کے فردوسی اسلام، شاعرِ پاکستان حتیٰ کہ خان بہادر تک کہا لیکن حکیم قسم کے خطاب سے محروم رکھا۔ ابو الاثر کے لقب میں بے شک ایک اشارہ سا ہے کہ ان کی دواؤں میں اثر ہو گا اور ان کے ہاتھ میں شفا ہو گی لیکن ایسے تشخص کے لیے یہ کافی نہیں جس کی جو سانس آتی ہے اور جاتی ہے۔ اپنے اور قوم کے لیے نسخے لکھنے اور دوا دارو کرنے کے لیے وقف ہے۔ آخر خود انہوں نے مریض الملک کا لقب اپنے لیے پسند کیا اور ہم نے طبیب القوم کی اعزازی ڈگری انھیں پیش کی۔

حفیظ صاحب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اتنے بڑے ماہرِ طب یعنی بیک وقت وید، حکیم، ڈاکٹر، ہومیوپیتھ، عامل کامل ہونے کے باوجود مریضوں کے محتاج ہیں۔

مشہور حکیموں کو ہم نے دیکھا ہے کہ بیٹھے لوگوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کب کوئی آئے اور وہ اس کے حلق میں کوئی جوشاندہ یا خیساندہ مع دوا کے بل کے اتاریں۔ لیکن حفیظ صاحب نے کہ ہمیشہ سے بے واہمہ، خوددار اور خود کفیل واقع ہوئے ہیں کبھی کسی کا رستہ دیکھا نہ کسی کے بیمار ہونے کی دُعا مانگی۔ انہوں نے اپنی ذات ہی میں وہ ساری بیماریاں پیدا کر رکھی ہیں یا ڈھونڈ رکھی ہیں جن کا کتابوں میں ذکر آیا ہے یا آنا باقی ہے۔ جس طرح وہ خدمت برائے خدمت اور ادب برائے ادب کے قائل ہیں اسی طرح دوا برائے دوا بھی ان کا اصول معلوم ہوتا ہے۔ خود ان دواؤں کو بھی جو وہ نوشِ جہاں کرتے ہیں بعض اوقات پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس مرض کی دوا ہیں۔ پانی کے ایک گھونٹ کے ساتھ کوئی کیپسول نیچے چلا جا رہا ہے۔ دوسرے کے ساتھ چمچہ بھر خمیرہ جواہر والا اس کا تعاقب کرتا ہے۔ تیسرے کے ساتھ کوئی فقیری ٹوٹکا یا کشتہ ہے۔ اس کے اوپر سے ہومیوپیتھی کی گولیوں کا ایک پھنکا بھی مارا ہے۔ سامنے شربت بزوری کی بوتل دھری ہے کہ آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند۔ اسپغول کی دھونی بھی لے رہے ہیں اور کمپونڈر بھی کسی انجکشن کی پچکاری لئے اشارے کا منتظر ہے۔ پھر دوا ہی پر بس نہیں۔ دُعا بھی ہو رہی ہے۔ اپنی جان

شیریں پوری طرح حکیموں ڈاکٹروں اور خود اپنے دستِ شفا کو ہبہ نہیں کر دی۔ بلکہ کچھ شافئ حقیقی کے لیے بھی چھوڑ دیا ہے۔ بہر حال ہماری دعا ہے کہ انہیں اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست۔ یہ یونہی زندہ رہیں اور تالیف نسخہ ہائے وفا کرتے رہیں کیونکہ ہم تو انہی کے مریض ہیں۔ ان کی شاعری کے مریض۔ ان کی محبت کے مریض۔ معمولی مریض نہیں بلکہ کہنہ مریض۔مایوس العلاج مرض۔

تعمیری شاعری

گزشتہ ہفتے کراچی کے ایک اونچے ہوٹل میں ایک محفل کلام و طعام برپا ہوئی جس میں شریک ہونے والوں میں قابلِ ذکر ایک تو ہم تھے۔ ہمارے علاوہ کچھ اور ادیب، جوش ملیح آبادی، سیّد محمد تقی، جمیل الدّین عالی، جی الانہ وغیرہ بھی۔ تقریب اس کی صابر تھاریانی صاحب کا کلام تھا۔ صابر تھاریانی گجراتی اور اُردُو کے ایک خوش گو شاعر ہیں اور ملک کے ممتاز آرکیٹیکٹ۔ قدرتی طور پر ان کی شاعری بھی تعمیری رنگ کی ہے۔ جوش صاحب نے ان کے گجراتی کلام کو اُردُو کے سانچے میں ڈھالا ہے اور اس خوبی سے کہ جو اینٹ جہاں لگی ہے وہیں رہے اور مطلب بخوبی

ادا ہو جائے۔ اپنی طرف سے اس پر چونا گچ بہت کم کیا ہے۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے ورنہ بعض اوقات ترجمہ کرنے والے شاعر اپنے مخصوص رنگ کا ایسا گہرا ڈسٹمپر چڑھاتے ہیں کہ اصل کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔

صابر صاحب نے اپنے کلام کا نام "صابر کے موتی" رکھا تھا۔ جوش صاحب نے اُردُو ترجمے میں بھی یہی نام رہنے دیا ہے جو کلام کی آب و تاب کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے لیکن مناسبت اور تلازمے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ صابر صاحب کا کلام رفعت اور شکوہ میں ایک عالیشان قصر یا مکان کی طرح ہے اور مضبوط ایسا جیسے آر سی سی کے ستونوں پر بنا ہو۔ نام میں اس کی رعایت دینی چاہیے تھی۔ بامِ عشق، چوبارہ ناز، گنبدِ ہجراں، محرابِ وصال، فصیلِ معرفت، اس مجموعے کا کچھ بھی نام ہو سکتا تھا۔ سیدھا سیدھا بھی نام رکھتے تو اس دیوان کو دیوانِ خانہ صابر کہہ سکتے تھے۔

مخفی نہ رہے کہ اچھی اور پائیدار شاعری کی بنیاد مطالعہ اور ریاضت فن ہوتی ہے۔ الحمد اللہ کہ صابر صاحب کے ہاں یہ بنیاد بہت مضبوط ہے۔ آج کل کے لوگوں کی طرح نہیں کہ محض موزوں طبعی کے سہارے شاعری شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا شاعر بننا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا بلا امتحان پاس کیے اور لائسنس لیے خود کو

آرکیٹیکٹ کہلانا۔ یہ لوگ خشتِ اوّل ہی کج رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی شاعری پیسا کے مینار کی طرح ثریّا تک ٹیڑھی چلی جاتی ہے۔ یا پھر ریت کی دیوار کی مثال جانیے کہ اب گری کہ اب گری۔ پچھلے دنوں ہم نے کئی مجموعے ایسے دیکھے جو کے ڈی اے کے کسی ٹھیکیدار سے بنوائے معلوم ہوتے تھے۔ کچھ دنوں واہ واہ ہوتی ہے پھر ایسی شاعری کا مسالہ نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہم نے صابر صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ مشہور گیت بھی آپ ہی کا لکھا ہوا ہے ”اک بنگلہ بنے نیارا۔“ معلوم ہوا نہیں ان کا نہیں۔ خیر کسی اور آرکیٹیکٹ کا ہو گا۔

اس جلسے کی تقریروں سے معلوم ہوا کہ جوش صاحب نے صابر صاحب کا دیوان بنایا ہے اور صابر صاحب نے جوش صاحب کا مکان بنایا ہے۔ ہم نے دیوان تو دیکھا ہے سبحان اللہ، مکان نہیں دیکھا جس سے پتہ چلے کہ شاعر کیسا مکان بناتا ہے۔ ہمارے ایک دوست عطاءاللہ خمار آرکیٹیکٹ ہیں۔ ایک روز غزل لائے جس میں جابجا وزن کا خلا تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ شاعری میں اتنے دروازے کھڑکیاں رکھنے کا رواج نہیں۔ ان سے ہم نے اپنے مکان کے نقشے کی فرمائش کی تو بولے۔ چھوٹی بحر میں چاہیے یا بڑی بحر میں۔ ہم نے کہا یہاں بحر کا کیا سوال ہے۔ بولے بعض لوگ

مکان کو لمبا لمبا پھیلا لے جاتے ہیں، بعضے اِرد گرد جگہ زیادہ چھوڑتے ہیں۔ اور زیرِ تعمیر رقبہ کم رکھ کر اوپر منزلیں اٹھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ چھوٹی بحر کا مکان ہوتا ہے۔ ہم نے کہا۔ ہمیں تو چھوٹی سی کاٹیج چاہیئے بس رباعی کی طرح۔ لیکن خدارا ایسا مت کرنا جیسا رنجور امروہوی صاحب کے مکان میں کیا ہے کہ ایک کمرے کا دوسرے کمرے سے تعلق ہی نہیں۔ فرمایا وہ تو غزل گو ہیں۔ غزل کے ایک شعر کا دوسرے سے کیا ربط ہوتا ہے؟ خیر صابر صاحب کے متعلق پتہ چلا کہ جب نقشہ بناتے ہیں تو بحیثیت آرکیٹیکٹ بناتے ہیں۔ ان کی تعمیر کردہ ڈھاکے کی مسجد بیت المکرم ہم نے دیکھی ہے۔ کیا لف و نشر مرتب ہے۔ بیت کے ہر دو معنوں کا الزام ہے۔

کھانے کی میز پر بیٹھے تو ہمارے داہنے ہاتھ بھی ایک علم دوست آرکیٹیکٹ تھے اور بائیں ہاتھ بھی۔ بالکل سامنے ہمارے جمیل الدّین عالی تھے اور ہم ان سے ذکر کر رہے تھے کہ لاڑکانہ کے میلہ مویشیاں والے مشاعرے کے لیے ہم نے ایک غزل آپ کی زمین میں نکالی ہے۔ وہی آوارہ، چمن آرا، شمیم آرا وغیرہ کے قافیوں والی زمین۔ فرمایا تم نے رسالہ تعمیرِ ادب کے سالنامے کے لیے افسانہ بھی لکھ لیا کیا؟

ایڈیٹر صاحب تقاضا کر رہے تھے۔ ہم نے کہا لکھیں تو کیسے؟ پلاٹ ہی نہیں ملتا۔ اس پر ہمارے داہنے ہاتھ والے مہربان بزرگ نے کھانے سے ہاتھ روک کر کہا کہ فیڈرل کالونی آپ کو پسند ہو تو ایک پلاٹ آپ کو وہاں میں دلا سکتا ہوں۔ ہم ابھی ان کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ بائیں ہاتھ والے صاحب نے کہنی مار کر پیشکش کی کہ زمین چاہئے تھی تو آپ مجھ سے فرماتے۔ اب خواہ مخواہ آپ کو غزل نکالنے کے لیے اتنی دور عالی صاحب کی زمین پر جانا پڑتا ہو گا۔

انٹرویو علم دریاؤ ہے

ایک اخبار میں ریڈیو پاکستان لاہور کی اناؤنسرس زاہدہ بٹ کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ انٹرویو کرنے والے نے ان سے پوچھا کہ آپ کی پسند کیا کیا چیزیں ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

"کریلے گوشت، بچّے، قلم، بال بنانے کے نت نئے نمونے اور پر اسرار ناول۔"

ہماری اُردُو اخبار نویسی جب سے صنعت بنی ہے دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ رات کو زیادہ اس لیے کہ اخبار کا زیادہ تر کام رات ہی کو ہوتا ہے اور منجھے ہوئے اور مشاق اخبار نویس کی نشانی یہ ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی بعض دوسری مخلوقات کی

طرح اس کے دیدے رات کو تو خوب پٹ پٹ کھلتے ہیں اور اندھیرے میں اسے بہت دور کی سوجھتی ہے۔ لیکن دن کو ناک کے آگے سجھائی نہیں دیتا۔ ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے۔ خیر یہ بات تو کچھ کچھ پہلے بھی تھی لیکن اخبارات ترقی کے دور سے پہلے ایسے جامع نہ ہوتے تھے کہ ہنڈیا بھوننے اور سر میں کنگھا کرنے تک کی ترکیبوں پر حاوی ہوں۔ چوتھی پانچویں کلاس کے بچّے ہمارے زمانے میں جواب مضمون لکھنے کی مشق لکیر دار کاپیوں پر کیا کرتے تھے۔ اب سیدھے سیدھے اخبار میں کرتے ہیں۔ مضمون بھی چھپتا ہے، تصویر بھی چھپتی ہے۔ کسی زمانے میں لوگ اس بات کو ترسا کرتے تھے کہ ان کی تصویر اخبار میں چھپ جائے۔ اب ہم اس بات کو ترستے ہیں کہ نہ چھپے۔ لیکن ایڈیٹر لوگ کہتے ہیں کہ مضمون چاہے دو نہ دو تصویر ضروری ہے۔ ایک صاحبہ نے ایک ہفتہ وار اخبار کو پیاز کُترنے کی ترکیب بھیجی تھی کہ پیاز لیجئے اور چاقو لیجئے۔ پھر چاقو سے پیاز کُتر لیجئے۔ یہ بہت دن تک نہ چھپی کیونکہ اس کے ساتھ ان صاحبہ نے تصویر نہ بھیجی تھی۔ آخر ایڈیٹر کے تقاضوں پر تقاضے آئے تو پورے میک اپ میں کلفٹن پر جا کر ریت پر لیٹ کر انھوں نے تصویر بنوائی۔ چونکہ

رنگین تھی لہٰذا اخبار مذکور نے سرورق پر چھاپی اور اندر تعارف کرایا، پیاز کترنے کی مشہور ماہر مس نزہت جمال۔

انٹرویو کا پرانا انداز بھی اب فیشن باہر ہوا کہ سیاسی لیڈر کے پاس گئے تو اس سے سیاست کی باتیں پوچھ رہے ہیں۔ ادیب کا انٹرویو ہے تو ادب سے متعلق باتیں پوچھی جا رہی ہیں۔ بنئے کا ہے تو آٹے دال کا بھاؤ زیرِ بحث ہے اور بزاز کا ہے تو چار گرہ کپڑے کی قسمت پر گفتگو ہے۔ اب یہ اسلوب خلافِ آداب ٹھہرا ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب نے جوش ملیح آبادی کا انٹرویو لیا اور یہ پوچھ کر چلے آئے کہ وہ آم کیسے کھاتے ہیں اور پیڑ کیسے گنتے ہیں اور جس گھڑی کو سامنے رکھ کر شام کو شراب پیتے ہیں وہ کس کارخانے کی بنی ہوئی ہے اور سر کے بال جب قائم تھے ان میں کون سا تیل لگاتے تھے۔ دفتر آ کر یاد آیا کہ کچھ گفتگو ادب اور شاعری کے متعلق بھی کرنی چاہیے تھی لیکن جب تک وقت گزر چکا تھا۔ ایک صاحب نے مولانا مودودی کا انٹرویو بھی کیا تھا۔ بڑی مشکل سے اجازت ملی۔ ان کے اِرد گرد ان کے عقیدت مند اور جماعت اسلامی کے سرکردہ لیڈر بھی ملفوظات سننے کے مشتاق بیٹھے تھے۔ آخر انٹرویو ہوا۔ رپورٹر نے پوچھا کہ حضرت قبلہ! میں آپ کی کتابیں بڑے شوق سے

پڑھتا ہوں۔ ان کی جلد سازی کون کرتا ہے؟ آپ کی شخصیت میں مجھے بڑی جاذبیت محسوس ہوتی ہے۔ آپ شیروانی کہاں سے سلواتے ہیں؟ آپ کی محبوب ٹوتھ پیسٹ کون سی ہے؟ جوتا کتنے نمبر کا ہے؟ انٹرویو خاصہ دور جا چکا تھا کہ ایک صاحب نے ٹھوکا دے کر رپورٹر کے کان میں کہا کہ مودودی صاحب دینیات کے مفسّر بھی ہیں۔ ایک آدھ سوال اس موضوع پر بھی چاہیے۔ تب ان صاحب نے سوال کیا کہ مولانا! اسلام کے پانچ ارکان کیا کیا ہیں؟ ذرا گنوایئے تو۔ اور کلمہ طیبہ کیا چیز ہوتی ہے؟

انٹرویو کے علمِ دریاؤ کا دوسرا اصول یہ ہے کہ کسی مسئلے پر جامع اور بے لاگ رائے چاہیے تو ایسے آدمی سے لینی چاہیے جو اس سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ تاکہ تعصب اور جانبداری کا شائبہ نہ آجائے۔ پچھلے دنوں ایک اخبار کے رپورٹر نے ہم سے پوچھا کہ مشرقِ وسطیٰ کو کھالوں کی برآمد کے کیا امکانات ہیں؟ ہم نے کہا بھیّا ہم سوداگر چرم نہیں، ادیب ہیں۔ یہ سوال تم حاجی رحمت اللہ برکت اللہ سے پوچھو۔ ہم سے تو میرؔ و مصحفیؔ کے متعلق کوئی سوال یا شاعری کا کوئی مسئلہ ہو تو گفتگو کرو۔ فرمانے لگے ادبی مسائل کے انٹرویو میں جوڑیا بازار میں مکمل کر چکا ہوں۔ حاجی رحمت اللہ سے بھی

مل آیا ہوں اور ان سے نئے ادب کے اسالیب پر سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے۔ آپ تو کھالوں کے متعلق بتایئے۔ اس میں عذر ہے تو یہ ارشاد ہو کہ بونس واؤچر کا بھاؤ پڑھنے کا اسٹاک مارکیٹ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ ہمیں یقین ہے کہ یہ لوگ غالبؔ کے زمانے میں ہوتے تو ان سے یہی سوال کرتے کہ اپنی کلاہ پاپاخ آپ کس دکان سے دھلواتے ہیں۔ ایسے ہی ایک رپورٹر کو ہم نے ایک کوٹھی کی باورچن سے یہ سوال کرتے سنا کہ بی بی شیکسپئر کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے اور غالبؔ کی برہان قاطع میں تیرے نزدیک کیا کیا غلطیاں ہیں؟

زاہدہ بٹ صاحبہ نے ایک سانس میں اپنی پسندیدہ اشیا کی فہرست جو گنائی ہے، یہ بھی انٹرویو نگاری کا ایک تازہ اسلوب ہے۔ ہم نے پچھلے چھ ماہ کے اخباروں سے لوگوں کی پسند کی کچھ اور مثالیں بھی جمع کی ہیں۔ تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را۔

ایک صاحب نے کہا:

مولانا راشد الخیری کی کتابیں۔ کبڈی۔ آم کا اچار۔ لارل ہارڈی۔ بیسن کے پکوڑے۔ اور ماؤزے تنگ۔

ایک بزرگ نے فرمایا:

مولانا مودودی کی تعلیمات۔ صوفیہ لارین۔ اصلی گھی کی جلیبیاں اور باٹا کے جوتے۔

ایک بھلے مانس بولے:

مرزا غالب۔ پودینے کی چٹنی۔ تمباکو والا پان۔ راگ بھاگیشری اور گوبھی کا پھول۔

اور یہ آخری فہرست ہماری فلموں کی ایک مشہور رقاصہ نے اپنے انٹرویو میں دی۔

بھولو پہلوان۔ کیوی بوٹ پالش۔ نظریہ اضافیت۔ کچی کیریاں اور بہشتی زیور۔

اخبار کل کے اور آج کے

ہمارے مہربانوں میں ایک بزرگ ہیں پرانے خیال کے۔ وقتاً فوقتاً آکر ہمیں قربِ قیامت کی بشارت دیتے رہتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو قیامت کی تاریخ بھی ڈال جاتے ہیں۔ ہمیں زندگی کا بیمہ کرانے سے بھی انہی نے باز رکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ پریمئیم کی قسطیں ڈوب جائیں گی کیونکہ پالیسی کی میعاد ختم ہونے سے پہلے قیامت کا آنا یقینی ہے اور محشر کے اتنے بڑے میدان میں آپ کمپنی والوں کو کہاں تلاش کرتے پھریں گے کہ لاؤ میرے پیسے۔ ان کی مقرر کردہ قیامت کی تاریخ ٹل جاتی ہے تو فرماتے ہیں کہ کسی نیک آدمی کے اعمال آڑے آگئے۔ لیکن یہ بات کچھ ایسے

ناگوار لہجے میں کہتے ہیں جیسے نیک سے ان کا مطلب نابکار آدمی سے ہو۔ ہمیں زبان حال سے وہ ہمیشہ یہی کہتے نظر آتے کہ قیامت کو آنا ہے تو ہمارے جیتے جی آتے۔ ہمارے بعد آئی تو کیا آئی۔ ان کا بس نہیں چلتا ورنہ خود ہی اٹھا کر صُور پھُونک دیں۔

قیامت آنے کی جتنی نشانیاں پہلوں نے مقرر کی ہیں ہمارے ان بزرگ کے نزدیک نہ صرف وہ سب کی سب پوری ہو چکی ہیں بلکہ اتنی کچھ فالتو وجوہات بھی جمع ہو گئی ہیں کہ شائد ایک قیامت میں پورا نہ پڑے۔ ان کے نمٹانے کے لئے دو تین آئیں۔ ان کی ذاتی راتے تو اس سے بھی آگے کی ہے۔ وہ یہ کہ ہر دوپٹے کے پیچھے جو سر سے سرکتا ہے۔ اور ہر چولی کے لیے جو اونچی ہوتی ہے ایک سالم قیامت کا آنا واجب ہو جاتا ہے۔ خیر دوپٹوں اور چولیوں کے قیامت ڈھانے کی بات تو ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ بلکہ کئی بار تو کسی بت کافر کو قیامت خیزی کے عالم میں دیکھ کر رحم بھی آیا اور یہ خیال بھی کہ اسے اپنے دست حق پرست پر مسلمان کیجئے اور اس کی عاقبت سنواریئے لیکن پھر دیکھا کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ اکثر تو تبلیغ شروع کرنے کے پہلے دوسرے روز ہی ہمارا اپنا ایمان منزلزل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور قشقہ لگا کر دیر میں بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔

بے حیائی اور بے مروّتی، جھوٹ بولنا اور پورا نہ تولنا وغیرہ وجہیں پرانی ہوتی دیکھ کر ہمارے ان مہربان نے قیامت کو جلد تر وقوع میں لانے کے اور بہانے ڈھونڈنے شروع کر دیئے ہیں۔ ابھی کل ہی ہمارے پاس تشریف لائے اور بولے "ہائے۔ ہائے اخبار والوں نے اُردُو کا کیا ستیاناس کیا ہے مقفیٰ اور مسجّع عمارتوں کی تو ان لوگوں کو کیا توفیق سیدھی سیدھی عمارت میں بھی املا غلط، انشا غلط، اخبار پڑھو تو یوں لگتا ہے جیسے مسلسل منڈیوں کے بھاؤ پڑھے جا رہے ہیں۔ ہمیں خدا نے زبان کا یہ حشر ہوتے دیکھنے سے پہلے کیوں نہ اٹھا لیا۔ پھر اپنے محبوب موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے۔ "یہ قیامت بھی کم بخت نہیں آپاتی۔ خیر اب تو اسے آنا ہی پڑے گا۔ بھلا یہ اُردُو ہے؟ فلاں نے فلاں کو چیلنج کر دیا۔ رٹ فائل کر دی۔ کورم ٹوٹ گیا۔ اخبار کی عبارت تو ایسی ہونی چاہیے کہ پڑھنے والا طلسم ہوشربا کی طرح پڑھتا جائے۔ ہاتھ سے رکھنے کو جی نہ چاہے۔"

ہم نے جان کی امان پا کر یوں کہا کہ جیسی عبارتیں آپ فرماتے ہیں وہ فسانۂ عجائب، قصّۂ گُل با صنوبر وغیرہ ہی میں چھپتی ہیں۔ اخبار میں تو مرنے مارنے، لپاڈگی وغیرہ کی خبریں ہوتی ہیں یا پھر اقتصادی تبصرے۔ یعنی آٹے دال کا احوال آجاتا ہے۔ اس پر

انہوں نے فوراً ہمارا قطع کلام کر کے اپنے تھیلے میں سے ایک بوسیدہ پرچہ نکالا اور فرمایا۔ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا۔ بات اس میں بھی آٹے دال کی ہے لیکن سبحان اللہ کیا سلیقہ ہے۔

ہم نے کہا۔ ''کیا چیز ہے یہ؟ یہ کوئی داستان ہے؟'' فرمایا۔ ''داستان نہیں۔ اخبار ہے۔ پچھلی صدی میں لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ 'سحر سامری' نام تھا اور ایڈیٹر تھے اس کے لالہ گھیر نرائن عیاش۔''

''پڑھیئے۔'' ہم نے بیچارگی سے کہا۔

''سنیئے۔'' وہ بولے۔ ''ان دنوں غلّہ کی گرانی ہے۔ گرانئ خاطر کی فراوانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے۔ آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ فاقہ کشوں کی برقِ آہ شرر بار سے خرمن ماہ جل گیا۔ گروہ نان خورشید غم کے پاؤں کے نیچے کچل گیا۔ بے قماشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا۔ جس نادان و دانا نے حالِ بربادی سُنا رو دیا۔ ایک تو معاش نہیں، جائے تلاش نہیں۔ دوسرے وفود غم سے گندمی رنگ ہر بشر کا نیلا ہوا۔ گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا۔۔۔ خونِ دل بجائے شراب ہے۔ لختِ جگر

کباب ہے۔ چکنی چپڑی باتوں سے تدبیر نہیں ملتی۔ بہت سر پٹکتے ہیں دال نہیں گلتی۔ حاکم اس طرف عنانِ توجہ موڑتا نہیں۔ بس کیا کریں اکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں۔"

ہم نے کہا۔ بس بس۔ آپ کا مطلب ہم سمجھ گئے۔ فرمایا آپ نے دیکھا نہیں۔ آسیائے فلک نادان و دانا، گندمی رنگت، اکیلا چنا، اس میں کتنی رعائتیں آگئی ہیں۔ انسان گڑ نہ دے، گڑ کی سی بات تو کرے۔ ہمیں معلوم نہیں یہ اخبار روزانہ تھا یا ہفتہ وار یا مرضی وار یعنی جب ایڈیٹر کی مرضی ہوئی نکال دیا۔ ہمارے تصوّر میں اس اخبار کے دفتر کا نقشہ کچھ یوں آتا ہے کہ دو تین بزرگ چوکی بچھائے کاغذ کے تاؤ سامنے رکھے بیٹھے ہیں۔ افیم کی پیالیاں پاس پڑی ہیں۔ ایک طرف برفی کا دونا۔ گنڈیریوں کا چھیبا دھرا ہے۔ اور چپراسی نے ابھی ابھی حقّے پر چلم لا کر رکھی ہے۔

ایڈیٹر صاحب پوچھتے ہیں۔ "اماں کتنا ہو گیا۔ کیا خبر دے رہے ہیں۔"

سب ایڈیٹر صاحب۔ "حضت یہ ہی آٹے دال کی گرانی والی خبر ہے۔"

ایڈیٹر۔ "کہاں سے لی تھی یہ خبر۔"

سب ایڈیٹر۔ "ابھی ابھی چنڈو خانے سے سن کے آیا ہوں۔ بہت معتبر ہے۔"

سب ایڈیٹر۔ ”اور کیا کیا مواد ہے اس پرچے میں۔“

سب ایڈیٹر۔ ”حضور غزلیں ہیں۔ فیض آباد والے مشاعرے کی ایک داستان ہے جو مسلسل چل رہی ہے۔ اپنے مرزا اغّن کی۔ طلسم حیرت کشا۔ ابھی دو سال اور چلے گی۔ انشاء اللہ۔“

ایڈیٹر۔ ”ایڈیٹوریل کس چیز پر لکھیں۔“

سب ایڈیٹر۔ ”اب کے ایطائے جلی پر لکھئے۔ آپ کے حریف ہیں۔ نہ میر مجنوں ان کے شاگردوں کے ہاں آج کل ایطائے جلی کی بھرمار ہے۔ بلکہ اب کے تو ایڈیٹوریل پورا منظوم ہونا چاہیئے۔“

ایڈیٹر۔ ”نہیں نہیں۔ یہ نیا زمانہ ہے۔ روم اور روس میں سنا ہے لڑائی ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ ایسا ایڈیٹوریل لکھتا ہوں کہ روس کے چھکے چھوٹ جائیں۔“

سب ایڈیٹر۔ ”ہاں۔ ہاں، سبحان اللہ۔ اب کے پرچہ کس تاریخ کو نکالنے کا ارادہ ہے۔“ ایڈیٹر: ”جب چاہیں گے نکالیں گے۔ ہم ایڈیٹر ہیں۔ خریداروں کے باپ کے نوکر تھوڑا ہی ہیں۔“

پچھلی صدی کے اخبار بے شک اُردُو میں نہیں اُردُوئے معلّٰی میں ہوتے تھے۔ نئے زمانے کی آپا دھاپی نے زبان کا لطف غارت کر دیا۔ اس زمانے میں سنی سنائی خبروں اور چنڈو خانے کی گفتگو اخبار بھرنے کے لیے بہت تھی۔ اب ادھر تار آرہے ہیں، ٹیلی پرنٹر کھٹا کھٹ چل رہا ہے۔ اور فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ خبروں کا پُشتارہ ہوتا ہے جو سمیٹے نہیں سمٹتا۔ پرانے دفتروں کا ماحول بھی بہت پُر سکون ہوتا تھا۔ کاتب بیٹھا لکھ رہا ہے۔ ایڈیٹر کو آواز دی۔ حضور پاؤ کالم رہ گیا ہے۔ اس کے لیے میٹر دے دیجئے۔"

ایڈیٹر پکارتا ہے۔ "لکھو آج چوک میں دو ٹانگوں کی ٹکر ہو گئی۔ تین آدمی زخمی ہو گئے۔ ایک کی حالت خراب ہے۔ آگے خود بڑھالو۔"

تھوڑی دیر بعد کاتب پھر پکارتا ہے۔ "جناب۔ دو تین سطریں پھر بھی خالی بچتی ہیں۔"

ایڈیٹر صاحب فرماتے ہیں۔ "اچھا! ان میں اس خبر کی تردید دے دو کہ ہم نے تحقیق کی۔ یہ خبر سراسر غلط ثابت ہوئی۔"

اس زمانے کے خریداروں اور پڑھنے والوں کو بھی اللہ نے بہت فرصت دی تھی۔ ایک خبر کو بار بار پڑھتے تھے۔ سارا اخبار اوپر کی سرخی سے پرنٹ لائن تک چاٹ جاتے تھے اور زبان و بیان قافیہ ردیف کی خوبیوں پر سر دھنتے تھے۔ ان کے لیے آٹے کی مہنگائی بجائے خود کوئی خبر نہ ہوئی تھی۔ یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ لکھنے والے نے اس میں تلازموں اور عبارت آرائی سے کیا رنگ پیدا کیا ہے۔ آج کل تو خبریں ہی اتنی ہوتی ہیں کہ ان کے خلاصے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ اوپر کی خبر زیادہ سے زیادہ اتنی رہ جائے گی۔ ''آٹا مہنگا ہو گیا۔ لوگ پریشان ہیں۔'' بلکہ اتنی بھی نہیں۔ ''آٹا مہنگا ہو گیا ہے'' کافی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ لوگ آٹا مہنگا ہونے سے پریشان ہوا کرتے ہیں۔ آگے چل کر مزید اختصار کرنا پڑے گا۔ محض ''آٹا مہنگا'' لکھ دینا کافی ہو گا کیونکہ مہنگائی کا سبھی کو علم ہوتا ہے۔ آپ نے اس دکاندار کا قصّہ سنا ہو گا جس نے اپنی دکان پر لکھوا رکھا تھا ''یہاں تازہ مچھلی فروخت ہوتی ہے۔'' ایک صاحب نے کہا ''یہاں'' کا لفظ زائد ہے۔ سبھی کو معلوم ہے کہ مچھلی یہاں فروخت ہوتی ہے۔ کہیں اور نہیں۔ دکاندار نے یہاں ہٹا دیا۔ ایک دوسرے منطقی آئے بولے ''فروخت ہوتی ہے'' زائد ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دکانوں پر مچھلی فروخت ہوا کرتی

ہے۔ خریدی نہیں جاتی۔ ان کے تعمیلِ ارشاد میں فقط ''تازہ مچھلی'' کے الفاظ رہ گئے۔ ایک اور ہمدرد نے کہا ''بھائی۔ لفظ تازہ بھی زائد ہے۔ تم باسی تھوڑا ہی بیچو گے۔ ایماندار آدمی ہو۔'' اب فقط مچھلی رہ گیا۔ ایک بزرجمہر نے یہ بھی کٹوا دیا کہا دو فرلانگ سے بُو بتا دیتی ہے کہ یہاں مچھلی بکتی ہے عطر نہیں۔ چنانچہ وہ بھی مٹوا دیا گیا۔ خیال کہتا ہے آئندہ خبروں کے کالم میں فقط سرخیاں ہوا کریں گی۔ ''ویت نام، لڑائی جاری ہے۔'' ''آٹا مہنگا، ڈیگال کامیاب، مشرقی پاکستان طوفان، صدر جانسن پریشان، ماؤزے تنگ خوش۔'' بلکہ شائد یہ بھی نہیں۔ کیونکہ یہ باتیں سبھی کو معلوم ہیں۔ اچھا ہی ہے۔ اخباروں میں قسمت کا حال بتانے کے لئے اور منڈیوں کے بھاؤ کے لیے اور اشتہارات کے لئے اور جگہ نکل آئے گی۔ جو آج کل خبروں میں ضائع ہو جاتی ہے۔

سورج کا ڈبّہ گول ہو گیا

اخبار میں ایک برطانوی سائنسدان کا بیان آیا ہے کہ سورج کی معیاد ختم ہونے والی ہے۔ ایک روز یک لخت اس کا چراغ گُل ہو جائے گا۔ اس کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ صبح گیا یا شام گیا۔

یہ خبر پڑھ کر ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا کیونکہ اس امر کے باوجود کہ ہمیں سورج پر بعض اعتراض ہیں، اس کی خوبیاں اظہر من الشمس ہیں۔ مثلاً یہی کہ نہ اس میں تیل پڑتا ہے نہ بجلی کا خرچ ہے پھر بھی اچھی خاصی روشنی دیتا ہے۔ ہمارا اس پر اعتراض فقط یہ ہے کہ یہ غلط وقت پر نکلتا ہے۔ یعنی صبح کچھ سات بجے جبکہ

ہماری بھرپور نیند کا وقت ہوتا ہے۔ اگر دوپہر کو یا شام کو نکلا کرے تو کتنی اچھی بات ہو۔ لیکن کوئی نہ کوئی نقص تو ہر چیز میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کہتے ہیں داغ تو سورج میں بھی ہوتا ہے۔

سورج اگر ختم ہو گیا تو اس کے عواقب بڑے سنگین اور دور رس ہوں گے۔ عام لوگ تو اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ سب سے زیادہ زد تو دھوبیوں پر پڑے گی کیونکہ ان بیچاروں کا تو روزگار ہی کپڑے دھونا ہے۔ دھو تو خیر لیں گے سکھائیں گے کیسے؟ دوسری کاری ضرب ان کارخانوں اور دکانوں پر پڑے گی جو چھتریاں بناتے بیچتے ہیں۔ ٹھنڈی بوتلوں والوں کا کاروبار بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر اس کا اثر دنیا کے علاوہ دین پر بھی پڑنے کا اندیشہ ہے۔ رمضان شریف کے دنوں میں سورج بڑے کام آتا ہے۔ روزہ رکھنے میں تو خیر کوئی ایسی مشکل نہیں کیوں کہ تڑکے رکھا جاتا ہے۔ لیکن لوگ کھولا کیسے کریں گے؟ اس کے لئے تو غروبِ آفتاب کی شرط ہے۔ ہم اپنے دوست خواجہ عبد الغنی بے دل کے بارے میں بھی فکر مند ہیں۔ ان کا اصول ہے کہ صبح صبح ستاروں کی چھاؤں میں چرند پرند کے ساتھ اٹھ بیٹھتے ہیں اور سورج نکلنے تک سیر اور ورزش کرتے ہیں۔ نہ سورج ہو نہ نکلے۔ ظاہر ہے قیامت

تک سیر کرتے رہیں گے۔ یا ڈنٹر پیل پیل کر بے حال ہو جائیں گے۔ اب تو لوگ تاریکی سے گھبرا کر سویرا ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔ آئندہ رات کے ہونے کی تمنّا کیا کریں گے۔ کیونکہ رات کو کم از کم چاند تو ہوتا ہے۔ دن میں تو تارے تک نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں تو ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ موچیوں کو بھی مال کی کمی پڑ گئی تو پاپوش میں کس چیز کی کرن لگایا کریں گے۔ اور ہم اُرڈو کے محاورہ دان آیندہ کس چیز کو چراغ دکھایا کریں گے؟ ہم ان سائنسدانوں کے ہاتھوں بہت تنگ ہیں۔ کبھی کہتے ہیں دنیا ختم ہونے والی ہے۔ سامان باندھ لو۔ تیّار رہو۔ کبھی فرماتے ہیں سورج کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اس کے سرہانے یٰسین پڑھو کہ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔ ہمیں تو یہ ساری ان برطانوی سائنسدان صاحب کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ برطانیہ کے اقبال کا آفتاب کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔ لیکن پھر غروب ہونا شروع ہوا تو ہوتا ہی چلا گیا۔ اب انگریز کہتے ہیں کہ ہم تو ڈوبے ہیں میاں تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ یہ تو خیر ہمارا نظریہ ہے۔ یقین ہے آگے چل کر اس سلسلے میں اور نظریے بھی سامنے آئیں گے۔ امریکہ کو بین الاقوامی کیمونزم کی سازش نظر آئے گی کہ اندھیرا کر کے یہ لوگ ہم پر میزائل پھینکنا چاہتے ہیں۔ روس امریکی

سامراج کی سازش کا سراغ لگائے گا کہ اب امریکہ کے تیل کے اجارہ داروں کی بن آئے گی۔ مٹّی کا تیل غریب ملکوں میں جس بھاؤ چاہیں گے بیچیں گے۔ پیکنگ ڈیلی کا وقائع نگار سیاسی یوں بھانڈا پھوڑے گا کہ یہ امریکی امپیریئلسٹوں اور روسی ترمیم پسندوں کی ملی بھگت ہے کیونکہ چین مشرق کی طرف ہے اور سورج مشرق ہی سے نکلا کرتا تھا۔ کچھ لوگ ریڈ گارڈز کی جلد بازی اور بے تمیزی کو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔ جن سنگھ والے فوراً بھانپ جائیں گے کہ اس واردات کے پیچھے ہندوستانی مسلمان ہیں اور پاکستان ہے۔ یہ لوگ گائے کو کاٹ کر تو ہم بنیوں کی چھاتی پر مونگ دلا ہی کرتے تھے، اب سورج کی بھی جڑ کاٹ رہے ہیں تاکہ ہمارے دھرم میں کھنڈت پڑے کیونکہ یہ کسے معلوم نہیں کہ ہم لوگ پراچین زمانے سے چڑھتے سورج کی پوجا کرتے آئے ہیں۔

اتنا بڑا واقعہ ہو جانے پر ہر طرف ہلچل سی مچ جائے گی۔ اخبارات سورج نمبر نکالیں گے۔ ہاکر آواز لگاتے پھریں گے۔ ”ہو گیا۔ ہو گیا سورج کا ڈبّہ گول ہو گیا۔“۔ بیانوں میں ہر چیز کا خیر مقدم کرنے والے اب کے بھی یہ بیان دیں گے کہ ”ہم سورج کے ختم ہونے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اب سب کو مل کر صدر ایّوب کے

ہاتھ مضبوط کرنے چاہیں۔" اپوزیشن والے کہیں گے۔ "بالغ حقِ رائے دہندگی کو نظر انداز کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا تھا۔" چودھری خلیق الزّماں بیان دیں گے کہ میں نے لارڈ زٹ لینڈ کو ۱۹۲۱ء ہی میں بتا دیا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی فرمائیں گے کہ علامہ اقبال نے مجھے اور ملک برکت علی مرحوم کو ہدایت کی تھی کہ سورج کا خیال رکھنا۔ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے لیکن رئیس امروہوی اپنے ہفتہ وار کالم میں بتائیں گے کہ سورج کے نہ ہونے کا خوابوں کی نفسیاتی تحلیل پر کیا اثر پڑے گا۔ جمیل الدّین عالی انسائیکلوپیڈیا اور تاریخ طبری کے حوالے دے کر بتائیں گے کہ سورج بڑی پرانی چیز ہے۔ آشوریوں اور قدیم رومنوں کے دنوں میں بھی اس کا وجود تھا۔ وہ اس کے سارے نام بھی گنا جائیں گے کہ اسے اشتر، بخشوس، مقہار، بدلوک، مشہاری، شقلون، مستقلاوہ اور قرقراف کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ ایک بیان حضرت اسلام سلمانی بی اے کا بھی آنا ضرور ہے کہ اس واقعے کے بعد حجامتوں کے ریٹ میں اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے اور میں ہیئر ڈریسر برادری سے سورج کے متبادل انتظامات پر تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے عنقریب مغربی پاکستان کا طوفانی دورہ کروں گا۔

ہم نے اس خبر کا صرف ضروری حصّہ کالم کے شروع میں دیا ہے ورنہ تو خیر لمبی ہے۔ اور اس میں بہت سی فروعی تفصیلات ہیں جن سے ہمیں یا ہمارے قارئین کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً یہی کہ یہ حادثہ آج سے تین کروڑ سال بعد پیش آئے گا۔ اگر آیا تو!

باعث تحریر آنکہ

لاہور میں عرائض نویسوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس کی صدارت جسٹس انوار الحق صاحب نے کی اور اس سے خطاب کرنے والوں میں ہمارے مکرم ڈاکٹر سیّد عبد اللہ بھی شامل تھے۔ یہ قیاس کرنا غلط ہو گا کہ ہمارے یہ دونوں واجب الاحترام بزرگ کسی کچہری کے آگے چوکی رکھ کر اور چھتری تان کر عرضیاں لکھتے ہیں لہٰذا اس تعلق سے بلائے گئے ہوں گے۔ سیّد عبد اللہ بے شک وقتاً فوقتاً حکومت اور ملّت کے دربار میں عرضیاں دیتے رہتے ہیں کہ اُردُو کو فوراً دفتروں اور کالجوں میں جگہ دی جائے۔ لیکن جسٹس انوار الحق صاحب کی تو ہائی کورٹ کے نام سے اپنی

کچہری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُردُو کا مقدمہ سرکار دربار میں پیش ہوا اور گواہ عشق طلب ہوں تو وہ بھی کاغذی پیرہن زیبِ تن کیے ہوں اور مستغیثوں کی صف میں ڈاکٹر سیّد عبد اللہ کے دوش بدوش کھڑے نظر آئیں۔ بہرحال اس جلسے میں یہ حضرات شریک ہوئے یہ کہنے کے لیے کہ جب اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے تو پھر مشاہدہ کس حساب میں ہے۔ یعنی مدعی پاکستانی، مدعا علیہ پاکستانی، مصنّف پاکستانی، وکیل پاکستانی پھر عدالت کی زبان انگریزی کیوں؟ اردو کیوں نہیں؟

اب سن رہے ہیں کہ عرائض نویس اپنی تنظیم الگ بنا رہے ہیں جس کا نام پٹیشن رائیٹرز گلڈ ہو گا۔ جب رائٹرز گلڈ بنی ہے اس وقت ہم نے سفارش کی تھی کہ اس میں عرضی نویسوں اور نسخہ نویسوں یعنی ڈاکٹروں کو بھی شامل کرنے میں مضائقہ ہیں۔ آخر یہ لوگ بھی کچھ نہ کچھ لکھتے ہیں۔ کم از کم ان لوگوں سے تو اچھے ہیں جو کہلاتے ادیب ہیں لیکن اب ایک زمانے سے کچھ نہیں لکھتے۔ کوئی ایسا ہے جس نے اپنی آخری تحریر ۱۹۲۲ء میں لکھی تھی۔ کسی کا کوئی مضمون ۱۹۳۴ء کے بیوپار گزٹ جبل پور کے سالنامے میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ کوئی ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ غزلیں کہا کرتا تھا۔ اگر کہو کہ صاحب آپ اب کیوں نہیں لکھتے تو جواب دیتے ہیں

کہ ایک تو قدر نہیں ہے۔ دوسرے فرصت نہیں ہے۔ اتنا تھوڑا ہے کہ ہم نے رائٹرز گلڈ کی ممبری کا فارم اپنے ہاتھ سے بھرا ہے کسی اور سے نہیں بھروایا اور دستخط بھی بقلم خود کیے ہیں۔ اس زمانے میں جو خواتین گلڈ کی ممبر بنیں ان میں سے کچھ تو واقعی ناول افسانہ یا غزل لکھتی تھیں لیکن ایک بی بی ایسی بھی ملیں جن سے ہم نے پوچھا کہ آپ کیا لکھتی ہیں تو بولیں۔ ''گھر میں دھوبی کا حساب لکھتی ہوں جی۔''

قصّہ مختصر یہ کہ ہم نے عرائض نویسوں کی بہت وکالت کی کہ ان کو گلڈ کا ممبر بنایا جائے لیکن ہمارے دوسرے رفیق نہ مانے۔ اس میں کچھ شائبہ حسد کا بھی ہو گا۔ کیونکہ جس طرح کی قاعدے کی عبارت عرائض نویس لکھتے ہیں اس کے لیے مشق اور ریاضت درکار ہے۔ یہ نہیں کہ قلم اٹھایا اور افسانہ گھیسٹ دیا۔ املا غلط۔ انشا غلط۔ ہم خود ایک زمانے سے لکھتے ہیں لیکن یہی آسان آسان چیزیں، نظم، غزل، مضمون وغیرہ۔ ایک بار ایک عرضی لکھنے کا اتفاق ہوا تو قدر عافیت معلوم ہوئی۔ عدالت نے اسے دیکھتے ہی واپس کر دیا کہ اس میں مَیں کی بجائے فدوی لکھ کر لائیے اور نیچے العبد لکھ کر دستخط کیجئے اور باعث تحریر آنکہ اور منکہ سے اسے شروع کیجئے۔

اور بڑی بات یہ کہ خوش خطی عدالتی کاروائیوں میں نہیں چلتی۔ اسے خط شکستہ میں لکھ کرلائیے تاکہ پڑھی نہ جاسکے۔ آپ کی عرضی تو کوئی بچّہ بھی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔

ہمارے مفید اور مفت مشورے نہ گلڈ کے قیام کے وقت چلے نہ اب ان کی کچھ قدر ہے۔ ہم نے سفارش کی تھی کہ گلڈ ایک طرف تو ان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرے جن کو لکھنا چاہیے۔ دوسری طرف ان کا کچھ تدارک کرے جو ہر مہینے ایک تر و تازہ ولولہ انگیز اسلامی تاریخی ناول اپنی زنبیل سے یوں نکالتے ہیں جیسے مداری اپنی ٹوپی میں سے خرگوش نکالتا ہے۔ ان ناولوں میں فقط نام مقام مختلف ہوتے ہیں۔ مضمون اور پلاٹ واحد ہوتا ہے۔ ہیرو شمشیر زنی میں بھی ماہر ہوتا ہے۔ معاملاتِ عشق میں بھی جدھر سے گزرتا ہے، ایک طرف کفار سے کشتوں کے پشتے لگتے جاتے ہیں، دوسری طرف شہزادیاں مشرف بہ اسلام ہوتی جاتی ہیں۔ تاکہ ہیرو اور اس کے جاں نثار ہمراہیوں کو ضرورتِ رشتہ کے سلسلے میں زیادہ تجسس نہ کرنا پڑے۔ قاری پڑھتے پڑھتے دین و دنیا دونوں کے مزے لوٹتا ہے۔ دمشق و غرناطہ کی فضاؤں پر پرواز کرتا رہتا ہے۔ لیکن جونہی ناول ختم ہوتا ہے دھڑام سے سرزمینِ حقیقت پر آگرتا ہے اور بعض اوقات تو خاصی چوٹ لگتی ہے۔ عرائض نویسوں کی

تحریروں میں کم از کم ایسا خطرہ جان و ایمان تو نہیں۔ عالی صاحب کو چاہیے کہ عرائض نویسوں کی بغاوت کو فرو کریں۔ اور ان کو رائٹر گلڈ کے سایۂ عاطفت میں جگہ دیں۔

حکیم بقل بطورا

آج صبح ہم نے اخبار کھولا تو اس میں کئی خوشی کی خبریں نظر آئیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کراچی کے ہسپتالوں کو کتّے کے کاٹے سے بچاؤ کی دوا یعنی سیرم نومبر سے ملنے لگے گی۔ دوسری یہ کہ کراچی کارپوریشن نے پبلک کے پر زور اصرار پر وسط ستمبر سے شہر کی صفائی کی مہم شروع کرنے کا منظم ارادہ کر لیا ہے۔ کیونکہ اکتوبر میں دس سال ترقیات کے جشن منائے جاتے ہیں۔ ایک اخبار میں کے ڈی اے کی سرگرمیوں کے متعلق چار صفحے کا ضمیمہ بھی دیکھا جس میں کے ڈی اے کے محکمہ پانی کے انجینئر کا

ایک مضمون بھی شامل ہے۔ اس میں پہلی بار یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ شہر کی شادابی کے لیے پانی از بس ضروری چیز ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ خود کو کتوں سے کٹوانا چاہتے ہیں، وہ نومبر تک انتظار کر لیں۔ اس کے بعد اپنا شوق جتنا جی چاہے پورا کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس اعلان کی نقلیں کتوں میں بھی تقسیم کر دی گئی ہوں گی تاکہ اپنا منہ بند رکھیں دہن سگ بہ اعلان دوختہ بہ۔ کورنگی سے ایک صاحب کتوں کے لیے ''کتا گزٹ'' نکالنا چاہتے تھے اور اس کی کثیر الاشاعتی کے بارے میں بڑی امیدیں رکھتے تھے۔ اگر وہ نکل آیا ہو تو یہ اعلان جلّی حروف میں اس میں چھاپ دینا چاہیے ورنہ ہم اہلِ شہر کو مشورہ دیں گے کہ آج کا اخبار ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کریں۔ جونہی کوئی کتا ان کی طرف لپکے اسے ڈانٹ دیں کہ دُر دُر موئے۔ یہ دیکھ اعلان آ گیا ہے کہ نومبر تک کاٹنا منع ہے۔ کیونکہ ابھی دوا نہیں بنی ہے۔ ٹیلیویژن پر بھی اس کی تشہیر ضروری ہے کیونکہ بڑے گھروں کے تو کتے بھی باقاعدگی سے ٹیلیویژن دیکھتے ہیں۔

اب رہی کراچی کارپوریشن کی صفائی کی مہم، کارپوریشن والے سیدھی انگلی سے اعتراف کیوں نہیں کر لیتے کہ انہیں اس کا خیال ہمارا کالم پڑھ کر آیا ہے اور عشرہ

ترقیات محض بہانہ ہے۔ ہم نے لاہور کا ذکر کیا تھا کہ وہاں جا بجا کوڑے کے ڈھیروں میں بانس کھڑے کر کے بینر پھیلا دیے گئے ہیں کہ صفائی نصف ایمان ہے۔

تفصیلات پڑھنے پر معلوم ہوا کہ اس مبارک اور ضروری مہم کے لیے کارپوریشن کے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ، انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ اور باغبانی ڈپارٹمنٹ کو کچی نیند سے جگا کر کہا جائے گا کہ ہاں تو صاحبو دکھاؤ ذرا اپنے جوہر۔ ہیلتھ ڈپارٹمنٹ اس سلسلے میں کیا کرے گا۔ اس کا کچھ اشارہ بھی اس اعلان میں ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کو نوٹس دے گا کہ اپنے اپنے گھروں پر سفیدیاں کراؤ۔ جو نہیں کرائے گا اس کے۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ دوسرے محکمے بھی نوٹس دیں گے لیکن کس بات کے، اس بارے میں ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہمیں ڈر ہو گیا ہے کہ ہم نے سواری نیچے کے لیے مانگی تھی کہیں اوپر کے لیے نہ مل جائے۔ ہم نماز بخشوانے کی فکر میں ہیں، کارپوریشن روزے ہمارے گلے میں ڈالنے کی سوچ رہی ہے۔ ہم نے پوری خبر کو دوبارہ پڑھا۔ اس میں کہیں اس بات کا اشارہ نہیں کہ لوگ بھی چاہیں تو کارپوریشن کو نوٹس دے سکتے ہیں کہ اٹھواؤ کوڑے کے ڈھیر۔ کرو صاف نالیاں شہر

کی۔ ایک صاحب نے تو ابھی سے یہ فال بد زبان سے نکال دی ہے کہ دیکھنا یہ کارپوریشن شہر والوں کو بھنگی بنا کے چھوڑے گی۔

پچھلے دنوں اخبار میں اس قسم کی خبر بھی دیکھی کہ آئندہ ڈاکٹروں اور انجینئروں کو بلدیہ کے چیئرمین مقرر کیا جایا کرے گا۔ ہر چند اس خبر میں یہ ذکر نہیں کہ موجودہ چیئرمین اور وائس چیئرمین وغیرہ کسی اسپتال میں ڈاکٹر لگا دیے جائیں گے۔ تاہم اس تجویز کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ آخر اتنے سارے ڈاکٹر کس مرض کی دوا ہیں۔ ان سے کچھ کام تو لینا ہی چاہیے۔ ہمارے ذہن میں کچھ اس قسم کا منظر آتا ہے کہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر ایم بی بی ایس خان (محمد باقر بن سلطان خاں) بلدیہ کے دفتر میں چیئرمین بنے بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سننے کے لئے سٹیتھوسکوپ ہے اور دوسرے میں تھرمامیٹر جس سے اپنا کان کھجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک اہلکار فائل بغل میں دابے داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوش خلقی سے چپڑاسی کو آرڈر دیتے ہیں کہ دو کپ کونین مکسچر کے بنا کے لاؤ۔

وہ صاحب عذر کرتے ہیں کہ میں ابھی پی کے آیا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ایک اور میں کیا ہرج ہے۔ مکسچر تو ہے، چائے تو نہیں کہ نقصان کرے۔ آپ کو نین مکسچر پسند نہیں تو فلو مکسچر بھی ہے۔ اچھا تو کیا بات ہے؟"

"جناب پرائمری اسکول چاہیے رنچھوڑ لائن میں۔"

"کیا علامات ہیں؟"

"جناب بچّے نا تعلیم یافتہ ہیں۔"

"ایکسرے کرایا؟"

"جی کس چیز کا؟"

"کس چیز کا؟ اسکول کے بچوں کا۔" "جی وہ تو نہیں کرایا۔ کرائیں گے۔"

" دیکھئے صاحب۔" ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ "اسکول کے لیے تو ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ فی الحال سارے بچّوں کو جمع کر کے ایک ایک ٹیکہ ہیضے کا لگا دیجئے۔ بہت دوا ہے ہمارے پاس اور اسکول جہاں بنانا مقصود ہے، وہاں فی الحال ڈی ڈی ٹی چھڑک دیجئے۔"

وہ صاحب دوسری فائل آگے بڑھاتے ہیں کہ ابدالی روڈ کی حالت بہت خراب ہے۔ لوگ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ بعضوں کی تو ٹانگ بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ ”ہاں ہاں ابدالی روڈ کی حالت واقعی خراب ہے۔ جا بجا سے فریکچر ہے۔ اس کا بھی ایکس رے کرانا ضروری ہے۔ فی الحال تو پولٹس کی تہہ جما کر پٹی باندھ دی جائے۔“

”جی سڑک کے؟“

”ارے نہیں۔ زخمی ہونے والوں کے۔“

اس مسند پر ڈاکٹروں کا حق ثابت ہے تو حکیموں کا کیوں نہیں۔ ہمارے مہربان فاضل طب حکیم بقل بطورا صاحب بھی اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ دفتر میں مسند بچھی ہے۔ آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ جو شخص فائل لے کر اندر آتا ہے، پہلے اس کی نبض دیکھتے ہیں۔ اسے جوشاندے کا پیالہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد احوال سنتے ہیں۔ اہلکار یہاں بھی وہی بات دہراتا ہے کہ پرائمری اسکول چاہیے اور سڑک مرمّت طلب ہے۔ حکیم صاحب فکر مند ہو کر فرماتے ہیں۔ ”جی ہاں۔ میں نے

بلدیہ کے مسائل کا قارورہ دیکھا ہے۔ واقعی بڑی خراب حالت ہے۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ سارے عملے کو جلاب دینا پڑے گا۔"

اب رہا پانی۔ تو گویا ریسرچ اور تحقیقات کے بعد کے ڈی اے کے انجینئروں نے بھی یہ راز پالیا ہے کہ شہر کی شادابی سے پانی کا قریبی تعلق ہے۔ یہ بات ہم نے بھی کہی تھی لیکن ہم ٹیکنیکل آدمی نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اس دعوے کے لیے ثبوت نہیں، شواہد اور دلیلیں نہیں تھیں۔ بہر حال اس اہم انکشاف کے بعد کیا ہم توقع کریں کہ ہماری ٹنکی میں پانی آیا کرے گا اور علامہ اقبال ٹاؤن کے پارک کی طرف توجہ کی جائے گی۔ جس میں کتّے لوٹتے ہیں بلکہ اب تو وہ بھی لوٹتے لوٹتے تنگ آ گئے ہیں۔

سرکاری یومِ اقبال

ہمارے عزیز دوست جمیل الدّین عالیؔ دوہوں والے 'تماشا مرے آگے والے' نے اپنے ناطقہ کو سر بہ گریباں کرتے ہوئے اخبار میں ایسا رقّت انگیز مضمون لکھا ہے کہ جدھر جائے خلقت زار و قطار رو رہی ہے۔ سارا شہر دیوارِ گریہ بنا ہوا ہے۔ لیاری کی جھگیاں بہ گئی ہیں اور محرم کی مجلسیں ماند پڑ گئی ہیں۔ ہم دوسروں کو کیا کہیں ہمارا اپنا یہ حال ہے کہ مضمون ہم لکھ نہیں رہے ایک کرم فرما کو لکھوا رہے ہیں کیونکہ ہمارے ہاتھ خالی نہیں۔ ایک تولیہ اس ہاتھ میں ہے۔ ایک اُس میں۔ بولتے جاتے ہیں اور اپنی اشک شوئی کرتے جاتے ہیں۔

اس میں کچھ تاثیر موضوع کی بھی ہے۔ ان کا یہ مضمون علامہ اقبال مرحوم کے بارے میں ہے اور خود علامہ مرحوم کے متعلق بھی وقائع نگار متفق ہیں کہ بات بات پر رو دیا کرتے تھے۔ جہاں قوم کا نام آیا ان کی آنکھوں سے اشک کا چشمہ رواں ہوا۔ عالیؔ صاحب کا کالم جو اب کے ذرا دھندلا دھندلا چھپا ہے اس کی وجہ بھی مشین کی خرابی نہیں۔ لکھنے والا کاتب بھی صاحبِ دل تھا۔ اس کے آنسو لکھتے میں کاغذ پر ٹپکتے گئے اور سیاہی پھیلتی گئی۔ مشین مین نے اسے درست کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی پڑھا لکھا تھا۔ قوم کا درد دل میں رکھتا تھا۔ سیاہی کو مزید پھیکا کرنے میں کچھ حصّہ اس کا بھی سمجھئے۔

عالیؔ صاحب پہلے سیدھا سیدھا مضمون لکھا کرتے تھے۔ مطلب اخذ کرنے کا کام قارئین پر چھوڑ دیتے تھے لیکن پڑھنے والوں نے کہا کہ جناب آج کل اتنی فرصت کسے کہ پڑھے بھی اور اس کا مطلب بھی سوچے۔ آج کل کالجوں یونیورسیٹوں تک میں تعلیم خلاصوں کے ذریعے اور امتحان گیس پیپروں کی مدد سے دیے جاتے ہیں۔ آپ بھی اپنی بات کا خلاصہ آخر میں ایک دو تین نمبر ڈال کر لکھ دیا کیجئے۔ آخر حکایات لقمان والے لقمان اور گلستان سعدی والے سعدی بھی تو یہی کیا کرتے

تھے۔ آج تک کسی نے اعتراض نہ کیا کہ قارئین پر کند ذہنی کا گمان کیا جارہا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ اب کے عالیؔ صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں ضروری نکات
مفید مشوروں کی صورت میں رقم کر دیے اور یہ کام ایسا ہے کہ اس میں ان کا حریف
کوئی نہیں۔ ان کی جو سانس آتی ہے اور جاتی ہے مفت مشوروں سے خالی نہیں ہوتی۔
"مولوی صاحب کا گھوڑا کے" مولوی صاحب کی طرح مشور دیا اور آگے چل دیے۔
ہم نے کئی بار عرض بھی کیا کہ رک کر دیکھ لیا کیجئے۔ آپ کے مشورے کا نتیجہ کیا
ہوا۔ کیا گل کھلا۔ لیکن دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام

کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

کراچی کے یوم اقبالؒ کی عدیم المثال کامیابی سے خوش ہو کر جو سرکاری سرپرستی میں
ہوا، عالی صاحب نے فرمایا ہے کہ آیندہ وہ یوم اقبالؒ ہر ڈویژن، ہر ضلع، ہر تحصیل، ہر
تھانے اور ہر گاؤں میں منایا جائے، اس سے قطع نظر کہ وہاں اقبالؒ کو جاننے اور
سمجھنے والا کوئی ہے کہ نہیں۔ یوم وغیرہ رضاکارانہ طور پر منانے کی عملی دقتوں سے
واقف ہونے کی وجہ سے انہوں نے فرمایا ہے کہ یوم اقبالؒ منانا ہر مقامی حاکم کا ایک
غیر سرکاری فرض قرار دے دیا جائے کہ بس اتنا سا سرکاری مراسلہ جاری کر دیا

جائے کہ مقامی حکام تقریباتِ اقبالؒ کی ہمّت افزائی کریں۔ پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔

یہ بات ہمارے بھی تجربے میں آئی ہے۔ جہاں کوئی کمشنر یا ڈپٹی کمشنر ادب سے دلچسپی رکھنے والا آیا سارا ضلع اشعار اور استعاروں میں باتیں کرنے لگا۔ بنیادی جمہورتیوں والے بھی غزلیں کہنا اور رسالے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر روز کسی نہ کسی کا یوم ہے۔ چونکہ سال میں صرف تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں لہٰذا بعض شاعروں اور ادیبوں کے نام قلمزد بھی کرنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ ایک دن میں ایک سے زیادہ آدمیوں کا یوم منانا کچھ بھلا نہیں لگتا۔ ایک ضلع میں ہم ایک کام سے گئے۔ دیکھا کہ ایک گاؤں میں جھنڈیاں لگی ہیں اور لوگ دیگیں پکارہے ہیں۔ ہم نے کہا کسی کی شادی یا عرس ہے کیا؟ معلوم ہوا نہیں۔ حضرت ملنگ گڑ گانوی کا یوم ہے۔ ایک صاحب کو جو پیش پیش تھے، ہم نے روک کر پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے۔ کیونکہ ہم گڑ گاؤں میں رہے ہیں، ان کا نام نہیں سنا۔ کہنے لگے سنا تو ہم نے بھی نہیں، لیکن اوپر سے حکم آیا ہے۔ سنا ہے ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیگم کے ماموں تھے۔ کلام ان کا چھپا نہیں۔ رسالوں والے متعصب تھے۔ چھاپتے ہی نہ تھے ورنہ شاعر سنا ہے

اچھے تھے۔ آج ہم ان کی یاد تازہ کریں گے۔ قوّالوں سے ان کی غزلیں گوائی جائیں گی اور جو چندہ گاؤں والوں نے تھانیدار صاحب کو رضاکارانہ طور پر دیا ہے، اس سے ملنگ مرحوم کا دیوان چھاپا جائے گا۔

اندریں حالات ہماری سفارش یہ ہے کہ اگر ادب کی ترقی مطلوب ہے تو آیندہ کسی کو حاکم ضلع مقرر کرتے ہوئے دیکھ لیا جائے کہ آیا شاعر ہے۔ کہیں نرا سی ایس پی تو نہیں۔ یہ ہو جائے تو دیکھئے ادب میں کیسی بہار آتی ہے۔ سب لوگ کھیتی باڑی آبپاشی وغیرہ چھوڑ کر یوم منانے میں لگ جائیں گے۔ کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ جونہی کسی ضلع میں نیا ڈی سی چارج لیتا ہے فوراً اہلِ معاملہ سراغ لگاتے ہیں کہ آیندہ لائحہ عمل کیا ہو۔ اگر موصوف گھوڑوں کے شوقین ہیں تو گھوڑوں اور مویشیوں کا میلہ کیا جائے اور میونسپلٹی سے ریس کورس قائم کرنے کے لیے جگہ الاٹ کرائی جائے۔ اگر مزاج میں تصوّف ہے تو عرس کیے جائیں اور مقامی درگاہ پر سفیدی کرائی جائے گی۔ اگر نمازی ہیں تو نماز سیکھی جائے۔ کیا عجب کبھی پڑھنی پڑ جائے۔ اگر پتہ چلتا ہے کہ شاعر ہے حضرت آفتاب اکبر آبادی کا شاگرد ہے تو سبھی اپنا قبلہ راست کر لیتے ہیں۔ فوراً ایک دھوم دھامی ملک گیر مشاعرے کا اعلان ہوتا ہے۔ بلکہ ایک آدھ

رسالہ بھی ڈپٹی کمشنر صاحب کی زیرِ سرپرستی آب و تاب سے نکلنا شروع ہو جاتا ہے لیکن یہ نوبت چند روزہ ہوتی ہے۔ جونہی حضرت کا تبادلہ ہوا ہم نے یہ دیکھا کہ بزمِ ادب کے دفتر میں کھلی بنولوں کی دکان کھل گئی اور ماہنامہ انتخاب عالمتاب کے دفتر میں کورے لٹھے کا ڈپو قائم ہو گیا۔

خیر اقبالؒ تو قومی شاعر ہے۔ تصورِ پاکستان کا خالق ہے تاہم یہ بعید از امکان نہیں کہ گاؤں کی یونین کونسل میں سرکلر پہنچے کہ اب کے یوم اقبالؒ منایا جائے تو اس قسم کی گفتگو ہو۔

"ایہہ کہیڑا اقبال بھئی"

"ڈاکٹر اقبال"

"کون ڈاکٹر اقبال"

"ڈاکٹر اقبال نہیں جانتے۔ حکیم الامت ڈاکٹر اقبال۔"

"یہ ڈی سی صاحب ہیں یا سول سرجن جو ڈاکٹروں حکیموں کے دن منائے جانے لگے۔ یہ کیا لگتے ہیں ڈی سی صاحب کے۔"

"کچھ بھی نہیں لگتے۔ شاعر تھے بہت بڑے ۱۹۳۸ء میں مر گئے۔"

"مر گئے تو پھر یوم منانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں اتنا خرچہ کیا جائے۔ جب کہ وہ ڈی سی صاحب کے رشتہ دار بھی نہ تھے۔ کہاں کے رہنے والے تھے۔"

"سیالکوٹ کے"

"سیالکوٹ کے؟ پھر تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ہماری بیگم کے گرائیں تھے۔ ضرور کوئی تگڑے آدمی ہوں گے۔"

بعد ازاں رپورٹیں طلب کی جائیں گی۔ کس کس گاؤں میں یوم اقبالؒ منایا گیا کہاں نہیں۔ کوئی ہزار عذر کرے کہ جناب کوئی قوّال ہی خالی نہیں ملا ہم یوم اقبالؒ کیسے مناتے۔ کوئی عذر مسموع نہ ہو گا۔ تھانے دار باندھ کے لے جائے گا کہ بد معاش یوم اقبالؒ نہیں مناتے؟ ڈی سی صاحب کے حکم کی سر تابی کرتے ہو؟ دو جی اسے حوالات میں۔ پڑھواؤ اسے بانگِ درا۔ صبح خود ہی بانگ دیتا ملے گا کہ حضور غلطی ہوئی۔ بال بچّوں والا ہوں۔ آج ہی جا کے مناتا ہوں یوم اقبالؒ۔

اک ذرا چاند تک

یہ امریکہ والے چاند پر کیا پہنچے، ان کا دماغ ہی آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھئی یہ کون سا کمال کیا تم نے جو اتنا اِترا رہے ہو۔ اتنی دور کی کوڑی لا رہے ہو۔ یہ راکٹ اور قمری گاڑی وغیرہ کا کیا کھڑاگ ہے۔ ان میں بیٹھ کے تو کوئی بھی چاند پر پہنچ سکتا ہے۔ بات تب تھی کہ پیدل پاؤں جاتے۔ پیدل نہ سہی بیل گاڑی، تانگے یا رُتھ میں پہنچتے، جیسے کہ پرانے زمانے کے بھارتی پہنچے ہوں گے۔ بھارتیوں کے آسمان میں تھگلی لگانے اور چاند پر جانے کا انکشاف بھارتی پروفیسر گوندانی نے کیا ہے۔ کچھ ایسا ہی بھلا سا نام ہے ان کا۔ ثبوت انہوں نے یہ پیش کیا ہے کہ پرانوں اور

شاستروں میں چندر لوک کا نام آیا ہے۔ یہ امریکی نالائق کہتے ہیں وہاں آبادی نہیں ہے۔ حالانکہ وہاں کے باشندوں کا بھارت کے ہاں آنا جانا تھا۔ بنج بیوپار بھی ہوتا تھا۔ بنج بیوپار کی تفصیل پروفیسر گوندانی نے تو نہیں دی لیکن قیاس کہتا ہے کہ بھارت سے گائے کے گوبر کے اپلے وہاں بھیجے جاتے ہوں گے۔ کیونکہ اور کوئی قابلِ ذکر چیز بھارت میں اُن دِنوں پیدا نہ ہوتی تھی۔ وہاں سے اس کے بدلے کیا آتا ہو گا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اب وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔ ریت ہیں اور پتھر ہیں۔ تجارتی تعلقات کچھ دن اور رہتے تو یہ بھی نہ باقی ہوتے، بھارت کی سڑکوں پر بچھے نظر آتے۔

موجودہ زمانے میں چاند کے سلسلہ میں ریسرچ کی اولیت کا سہرا ابھی امریکہ یا روس کے سر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان نہایت فخر سے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ سب سے پہلا ریسرچ کا ادارہ ''رویت ہلال کمیٹی'' یہاں بنی اور چاند کی طرف اُڑان کا آغاز یہاں سے ہوا۔ اس کمیٹی کے اراکین ضروری سمجھتے تو چاند پر اُتر بھی سکتے تھے کیونکہ کوئی بیس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ ہی گئے تھے۔ آگے فقط دو ڈھائی لاکھ میل کی مسافت رہ جاتی ہے۔ لیکن بیچ یہ آن پڑا کہ یہ لوگ افطاری کا سامان ساتھ لے کر نہ

گئے تھے۔ واپس آکر روزہ بھی کھولنا تھا۔ ہم لوگ اس قسم کی ریسرچ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جس میں جان جوکھوں میں پڑتی ہو۔ اس لیے جیسا کہ ایٹمی کمیشن والے ڈاکٹر عثمانی صاحب نے حوالہ دیا ہے کوکا کولا پر ریسرچ کرنا یا مصنوعی سنگِ مرمر بنانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ یہاں ہم عثمانی صاحب سے اختلاف کریں گے۔ ہمارے لوگ سائنس اور ایجاد کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ ابھی کل ہی ہم مفید عالم جنتری کا مطالعہ کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ بیسویں صدی کی سب سے حیرت انگیز ایجاد کا سہرا ابھی پاکستانی مرد درویش کے سر ہے۔ یہ ایک طلسمی انگوٹھی ہے جسے آپ ساڑھے تین روپے (مع محصول ڈاک) میں میاں عامل شاہ جلالی نزد ڈینسو ہال کراچی سے طلب فرما سکتے ہیں۔ اس کی خوبیاں کیا رقم کریں۔ اشتہار میں لکھا ہے کہ اس کے پہنتے ہی آپ کی غریبی دور ہو جائے گی۔ دولت آپ کے قدم چومے گی۔ محبوبہ آپ کے قدموں میں آن گرے گی۔ آپ کے ہاں (آپ چاہیں نہ چاہیں) اولادِ نرینہ ہو گی۔ دنیا آپ کی عزّت کرے گی۔ طالب علموں کو امتحان میں کامیابی ہو گی۔ آپ مقدمہ جیت جائیں گے۔ چوری کی ہوئی چیز واپس مل جائے گی۔ وغیرہ۔ اب ہمیں دکھا دیجئے

روس اور امریکہ کی کوئی ایسی ایجاد جو ان سب کرامتوں پر حاوی ہو۔ اور لطف یہ ہے کہ اس پر قوم کو ہزاروں ملین ڈالر خرچ نہیں کرنے پڑے۔ میاں عامل شاہ جلالی نے خود ہی تیار کر لی ہے۔ ساڑھے تین روپے (مع محصول ڈاک) میں منگا کر اپنی انگلی میں پہنے اور چاند کو اشارہ کیجئے۔ وہ خود دوڑا آئے گا۔ آپ کو اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ پھر جی بھر کے ریسرچ کر لیجئے اس پر۔

بہت دنوں سے لوگوں نے چاند پر جانے کے لیے ابھی سے سیٹیں بک کرائی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ وہاں ابھی تک ہوٹل نہیں ہیں۔ جانے والوں کو قیام و طعام کا انتظام خود کرنا ہو گا اور بستر ہمراہ لے جانا ہو گا۔ آل چاند ٹورسٹ بیورو رفتہ رفتہ سارے انتظام کر دے گا۔ فی الحال تو اس نے یہ اشتہار دیا ہے کہ "چاند" پر آئے اور اس کے گڑھوں میں لوٹ لگایئے۔ عوام کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے کئی سال ہوئے اٹلی کے شہر پادیا کی میونسپلٹی کو وہاں کے ایک کنجڑے نے درخواست دی تھی کہ مجھے چاند پر سبزی کی دکان کھولنے کا لائسنس دیا جائے۔ اس شخص نے ایک مقامی اخبار میں اشتہار بھی دے دیا تھا "خوشخبری خوشخبری خوشخبری۔۔۔ چاند کے رہنے والوں کو مژدہ ہو کہ ہم نے چاند پر تازہ سبزیوں کا انتظام کر دیا ہے۔ بھنڈی،

کریلہ، شلجم، ٹنڈے، شکر قندی، جس چیز کی ضرورت ہو یاد فرمائیں۔ دام مناسب۔ دھنیا مفت۔ ادھا قطعی بند ہے۔"

اس اشتہار سے بڑی غلط فہمی پھیلی تھی۔ لوگ سمجھے کہ چاند پادیا شہر کی میونسپٹی کی حدود میں واقع ہے۔ یہ تک سنا تھا کہ جب روس کا پہلا راکٹ چاند کی حدود میں داخل ہوا تو پادیا کے محرر چنگی نے روک کر پہلے اس کی تلاشی لی کہ اس میں بھی کاٹین یا شکر کا بورا تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس کے بعد آگے جانے دیا۔ یہی وجہ اس راکٹ کے نشانہ خطا ہونے کی بھی بتائی گئی تھی۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ خبر مبالغہ سے خالی نہیں۔ آمدورفت کھلی تو دیکھئے گا دوسرے اہلِ حرفہ بھی ادھر توجہ کریں گے۔ کراچی کے کنجڑے، کباب مرچنٹ، مرغ چھولے والے، عامل کامل، ناگفتہ بہ بیماریوں کے معالج خالص، پنجاب کے گھی فروش، شادی دفتروں والے، ہومیوپیتھ، انجن ساز وغیرہ ادھر کا رُخ کریں گے۔ اسلام سلمانی صاحب وہاں بھی پہلی باربر شاپ کا افتتاح کریں گے۔ رفتہ رفتہ باٹا کی دکان منشی فاضل کی تعلیمات کا اسکول، چھ مہینے میں گارنٹی سے پاس کرنے والے کالج، خوجہ جماعت خانہ اور بانٹوا مسلم ایسوی ایشن کی طرف سے ایک یتیم خانہ کھلنے کی خبر میں بھی آئیں گی۔ ایمپریس مارکیٹ سے

بسیں چلا کریں گی۔ چلو بھائی چاند کی سواریاں۔ کراچی ٹرام وے نے ٹرام بند کرنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا ہے۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ سولجر بازار سے آگے پٹڑی ڈال کر چاند تک سلسلہ ملا دیا جائے۔ ٹکٹ وہی آٹھ پیسے رہے گا۔ چاند پر آدمی جائیں گے تو کتے بھی جائیں گے۔ ان کی آسانی کے لیے جابجا کھمبے بھی کھڑے کرنے پڑیں گے تاکہ انہیں اپنے حوائج میں تکلیف نہ ہو۔ کھمبے گاڑنے کے بہانے کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن بھی پہنچ جائے گی۔ وہ گئے تو کے ڈی اے اور سوئی گیس والوں کو بھی بلائیں گے کہ یارو چاند عجب سپاٹ ہموار میدان ہے۔ خط کو تار سمجھو اور اپنے بیلداروں کو لے کر پہنچو۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ جب ہم چاند پر جانے کا ارادہ کریں گے، وہاں پہلے ہی بورڈ لگا ہو گا کہ "واپس جایئے سڑک برائے مرمّت بند ہے۔"

یونیورسٹی میں شعبہ حماقت کھل گیا

پچھلے دنوں اخبار پڑھتے ہوئے ایک خبر پر ہماری نظر رُک گئی۔ لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ حماقت نے فلاں ادیب شہیر کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ یہ سچ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی سے بھی اور یونیورسٹیوں کی طرح وقتاً فوقتاً حماقتیں سرزد ہوتی رہی ہیں (ہمیں ڈگری دنیا بھی انہیں میں سمجھ لیجئے) اور جیسا کاٹھیاواڑ بیوپار منڈل کے صدارتی خطبے میں سیٹھ کھلی بھائی بنولہ بھائی باردانہ والے نے فرمایا ہے۔ دستخط اور گنتی پہاڑے وغیرہ سیکھنے سے آگے پڑھنا بھی بجائے خود حماقت۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی نے ایک مستقل شعبہ حماقت قائم کر دیا ہے

تاکہ جو لوگ اس مضمون میں خصوصیت حاصل کرنا چاہیں وہ اس میں باقاعدہ فارغ التحصیل ہوں۔ ڈگری لیں اور آگے طلبہ کو فیض پہنچائیں۔ ع

میرا پیغام حماقت ہے جہاں تک پہنچے

پھر خیال آیا کہ کہیں یہ کتابت کی غلطی نہ ہو۔ کیونکہ حماقت کوئی قانون یا جغرافیہ تو ہے نہیں کہ پڑھنے سے آجائے۔ یہ تو ایک خداداد بات ہے۔ اللہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور اس وقت بھی اس فن شریف میں درک رکھنے والے اتنے لوگ موجود ہیں کہ بھارت میں مورکھ منڈل اور پاکستان میں انجمن حمقا کی شاخیں جابجا کھلی ہیں۔ بھارت کے مورکھ منڈلی میں تو بعض وزیر بھی شامل ہیں یا پھر یہ ہوگا کہ وزارت میں وہ مورکھ منڈل کی نمائندگی کرتے ہوں لیکن ان میں سے کوئی حماقت کو بطور مضمون کے شائد ہی پڑھا ہوگا۔

ہو نہ ہو یہ شعبہ حجامت ہے۔ ہمارے کرم فرما حضرت اسلام سلمانی بی اے اور ان کی جماعت ایک مدت سے کوشاں تھی کہ اس فن کو فنون لطیفہ میں داخل کر کے یونیورسٹی میں اس کی تدریس کا انتظام کیا جائے۔ اب جا کر یہ کوشش بار آور ہوئی ہے۔ اب یہ ہوگا کہ ایک کمرے میں فلسفے کا استاد تقریر کر رہا ہے کہ دیکارت اور

شوپنہار کے فلسفوں میں کیا فرق ہے۔ پاس کے کمرے میں پروفیسر خلیفہ امام دین طلبہ کو بتا رہے ہیں کہ داڑھی میں کتنا صابن لگانا چاہیے جس سے بال نرم ہو جائیں اور گاہک کی الٹے استرے سے حجامت کرنے میں آسانی رہے۔ مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ نہ حماقت نہ حجامت خبر کا تعلق شعبہ صحافت سے ہے۔ کاتب صاحب نے صحافت کو حماقت کیوں لکھا؟ ممکن ہے انہیں وقت پر تنخواہ نہ ملی ہو۔ لیکن اتنی سی بات پر گھر کے بھیدی کا پوری لنکا ڈھا دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ صحافت سے وابستگی اگر حماقت ہے تو اس راز کو فری میسنوں کی طرح اپنے سینے میں رکھنا چاہیے۔ اپنی برادری سے باہر فاش نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت۔

یہ بات ہم بھی بیس برس سے جانتے تھے لیکن ایسے اوچھے نہیں تھے کہ ہر ایک سے کہتے پھرتے۔ یہی حال ہمارے دوسرے سینکڑوں صحافی بھائیوں کا ہے کہ ایک بات جو ان سے سرزد ہو گئی اسے نبھائے جا رہے ہیں بلکہ بعض تو یہ تک ظاہر کرتے ہیں جیسے بڑی عقل کی بات کر رہے ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ حماقت ہے تو اس کا احساس کچھ دن بعد جا کر ہوتا ہے۔ ہمیں آج کل ہو رہا ہے کہ سیدھی سادی دل کی بات لکھتے ہیں، وہ بھی خوش طبعی کے ساتھ جو

کچھ ہے ججمان کے بالوں کی طرح آپ کے سامنے آجاتا ہے۔ اس پر بھی ادھر کچھ چھپا اور کسی گروہ کی طبع نازک پر گراں گزرا۔ ادھر لوگ وفد اور ڈنڈے لے کر پہنچ گئے کہ نکالو اس شخص کو باہر۔

لاہور میں ہمارے ایک دوست نے جو اخبار کا فلمی صفحہ مرتب کرتے تھے کہیں لکھ دیا کہ فلم ''چڑیا کی دُکی'' کے مکالمے کمزور ہیں اور کہانی میں بھی جان نہیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ فلم ایک مشہور پہلوان نے بنائی ہے۔ وہ اگلے ہی روز اپنے پٹھوں کے ساتھ اخبار کے دفتر پہنچ گئے۔ اس صحافی کو گریبان سے پکڑ لیا اور کہا۔ اگر مکالمے کمزور ہیں تو ہم تو کمزور نہیں اور اگر کہانی میں جان نہیں ہے تو تم میں کوئی جان ہے۔ ڈیڑھ پسلی کے آدمی ہو، باہر کو دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ لوگ جمع ہو گئے۔ بڑی مشکل سے تتو تھمبو کیا۔ جاتے ہوئے دھمکی دے گئے کہ آئندہ میری کسی فلم کے متعلق کچھ ایسا ویسا لکھا تو اچھا نہ ہو گا۔ وہ دھوبی پٹڑا دوں گا کہ عمر بھر چونا لگاتے رہو گے۔

اب تو خیر حالات بہت بہتر ہیں۔ صحافیوں کو تنخواہ بھی مل جاتی ہے اور پریس کلب میں بیٹھ کر تمبولا بھی کھیل سکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو بس یہی عشرت تھی کہ کمرہ

بند کر کے قلم ہاتھ میں اٹھایا اور ساری دنیا ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہٹلر کو ڈانٹ دیا کہ خبر دار اگر تو نے اور قدم آگے بڑھایا تو ایسا ایڈیٹوریل لکھوں گا کہ ناک رگڑنے کو دوڑا دوڑا آئے گا۔ اور ہماری حکومت بھی سمجھ لے کہ ہم اس سے نہیں ڈرتے۔ ہم آزادئ تحریر کی خاطر اپنا مکان بیچ سکتے ہیں اور بیچ دیا ہے، کپڑے بیچ سکتے ہیں اور بیچ دیے ہیں۔ گھڑی بیچ سکتے ہیں اور سچ مچ بیچ دی ہے۔ لیکن اپنا قلم نہیں بیچ سکتے۔ اپنا ضمیر نہیں بیچ سکتے۔ یہودیوں کو پھٹکار رہے ہیں کہ دیکھو بہت ظلم ہو لیا۔ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے، اب کے مار کے دیکھو۔ ہمارے بزرگ مولانا اختر علی خان مرحوم کا وہ قصّہ تو بہت مشہور ہے کہ ولایت گئے اور وزیر اعظم اٹیلی سے ملے اور کہا۔ "دیکھیے جناب کشمیر کا مسئلہ فوراً حل کر دیجئے۔ ایک مہینے کی مہلت دیتا ہوں ورنہ۔۔۔" اٹیلی صاحب کی سٹی گم ہو گئی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے منخنی آواز میں بولے۔ "ورنہ کیا؟"

مولانا نے فرمایا "ورنہ میں آپ کے خلاف زمیندار میں اداریہ لکھوں گا۔"

یہی چسکا تھا کہ لوگ کھانا کھا کر فقیر ہو جاتے تھے لیکن اخبار ضرور نکالتے تھے۔ ہمارے ایک دوست کا ایک ہفتہ وار پرچہ تھا۔ اسے خود ہی مرتب کرتے، چھپواتے،

دکانوں پر دے کر آتے، اشتہار کے بل کے لیے سیٹھ کو فون کرتے کہ جناب بہت دیر ہو گئی پیسے دلوائیے۔ میں اپنے چپراسی کو بھیج رہا ہوں۔ اس کے بعد خود ہی تھیلا لے کر سائیکل پر بیٹھ سیٹھ کے دفتر پہنچ جاتے کہ مجھے ایڈیٹر صاحب نے بھیجا ہے۔ وہ بہت خفا ہیں۔ پیسے آج ہی دے دیجئے۔ ہاں اداریے اور مکالموں میں ان کا طنطنہ دیکھنے کا ہوتا تھا۔

افسوس اس چسکے کے دن بھی انگریزوں کے ساتھ گئے۔ کوئی دو سال ہوئے ہمارے ایک دوست کو ایک اخبار میں بڑی سفارشوں کے بعد کالم لکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے پہلے ہی کالم میں اعلائے کلمتہ الحق کر دیا کہ "میرا قلم مقدس ہے۔ میں اپنے ضمیر کے علاوہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہوں گا۔ صدر ایوب کوئی غلط کام کریں گے تو ان کے گریبان میں بھی ہاتھ ڈالنے سے نہیں ہچکچاؤں گا۔" دوسرے روز ہم ان کے کالم کے منتظر رہے۔ تیسرے دن بھی اور پھر منتظر ہی رہ گئے۔ ان کا کالم پھر نہ چھپا۔ معلوم ہوا لات مار کر نکال دیے گئے۔ گھر میں بیٹھے چنے چاب رہے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا

آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

یہ پاگل پاگل پاگل فلمی دنیا

ہم نے پچھلے دنوں انگریزی کی ایک فلم دیکھی۔ نام ہے اس کا THE MAD MAD MAD WORLD یعنی پاگل پاگل پاگل دنیا۔ فلم دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ جو بار بار پاگل لکھا ہے اسے بیس بار لکھنا چاہئے تھا۔ غالباً جگہ کی گنجائش مانع رہی ہو گی۔ آغاز میں ہوتا ہے کہ ایک شاہراہ پر کچھ موٹریں ٹرک آگے پیچھے جا رہے ہیں۔ ایک کار لڑھک کر گہرے کھڈ میں گر جاتی ہے۔ لوگ نیچے پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ گاڑی کا سوار قریب المرگ ہے۔ اس نے بتایا کہ یارو میں تو دنیا سے سفر کر رہا

ہوں لیکن فلاں سطح مرتفع پر ایک خزانہ دبا ہے۔ لاکھوں کے نوٹ ہیں۔ نشانی اس کی دو کھجوریں ہیں۔ امابعد

اک طرف منہ پھیر کر رونے لگے تیمار دار

اک طرف بیمارِ غم کچھ کہہ کے رخصت ہو گیا

بے شک بیمارِ غم کچھ کہہ کے رخصت ہو گیا لیکن تیمار داروں کے رونے کی بات صحیح نہیں۔ سب نے فی الفور دوڑ لگا دی۔ سب کو پہلے پہنچنے کی فکر تھی۔ باقی فلم دولت کے لیے اسی دوڑ کی ہے۔ آخر میں۔۔۔۔۔ لیکن باقی آپ پردۂ سیمیں پر دیکھئے۔ یہ فلم پُر لطف تھی، بہت پُر لطف چلتی رہی۔ اس میں سب کچھ تھا جو انشراح قلب کے لئے ضروری ہے لیکن اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو نہ تھی۔ لہٰذا ہمارے دوست ہمیں پا بدستِ دگرے ایک مقامی سراسر مقامی فلم میں لے گئے کہ فلم دیکھنی ہے تو یہ دیکھو۔ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا ع کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں۔ عشق و محبت اس میں پند و نصیحت اس میں۔ مار کٹائی سے معمور۔ مزاح کے لڈّوؤں سے بھر پور۔ ظالم سماج کا تانا بانا بھی ہے اور زندہ ناچ گانا بھی ہے۔ جا بجا بے لوث محبت کے پھول کھلتے ہیں اور آخر عاشق معشوق گلے ملتے ہیں۔

فلم کا نام ہم نہیں لکھتے۔ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ بلکہ نہ لکھنے میں ایک حکمت ہے۔ اس شخص کا ذکر آپ نے سنا ہو گا جو غصّے میں بھرا کف اڑاتا سینما کے منیجر کے پاس پہنچا اور کہا میری بیوی اس وقت ایک غیر مرد کے ساتھ بیٹھی سینما دیکھ رہی ہے۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔ منیجر نے اسے تو بٹھایا۔ اندر ہال میں سکرین پر اعلان کرا دیا کہ باہر کسی بی بی کا میاں پستول لیے بیٹھا ہے۔ یہ دو منٹ کے لیے لائٹ بند کرتے ہیں وہ بی بی اور اس کا ساتھی چپ چاپ اندھیرے میں نکل جائیں۔ دو منٹ کے بعد لائٹ کھولی گئی تو ہال قریب قریب خالی تھا۔ پس جو فلم والا چاہے اسے اپنے سے متعلق کرے۔ ہمارے دو دوستوں نے تو سوالات کر کے کسوٹی کے قاعدے سے بھی اس فلم کا نام بوجھنے کی کوشش کی۔

"یہ فلم پنجابی کی ہے؟" ہمارے عبید اللہ بیگ نے پوچھا۔

"جی۔" ہم نے جواب دیا۔

"مار کٹائی کے سین سے شروع ہوتی ہے؟" ہمارے افتخار عارف نے سوال کیا۔

"جی۔"

”اس میں وجہ بے وجہ مری اور سوات کے مناظر ہیں۔“

”جی۔“”ولن بڑھکیں مارتا ہے؟“

”جی۔“

”مسخرا الٹی چھلانگیں لگاتا ہے؟“

”جی۔“

”طوائف کا کوٹھا اس میں ہے؟“

”جی۔“

”جیل کی سلاخیں بھی؟“

”جی۔جی۔“

سب ایک دوسرے کے لئے ایثار کرتے ہیں؟ بلکہ ایثار کرنے کے لئے ایک دوسرے پر ِگرے پڑتے ہیں؟“

”جی۔“

”من کی آنکھیں پٹ پٹ کھلتی ہیں؟“

”جی ہاں۔ جی ہاں۔“

”اسے بنے ہوئے پچاس سال سے زیادہ ہو گئے۔“

”آپ پروڈکشن کے معیار کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں۔“

”اس میں ’لال موری پت‘ گایا گیا ہے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟“

”اس میں فردوس ہے۔ اعجاز ہے۔ غالباً نغمہ بھی۔“

”جی ہاں۔ لیکن آپ کے سوالوں کا کوٹہ ختم ہو گیا۔ اس فلم کا نام بتایئے۔“

روکھے ہو کر بولے۔ ”جناب آپ ہی بتا دیجئے۔ ہم ہار گئے۔“

ہم نے کہا۔ ”آپ نے تو ساری نشانیاں بتا دیں۔“ تب انہوں نے بتایا کہ ہیرو کی مار کٹائی۔ طالب و مطلوب کا بچھڑنا، ملنا۔ مری اور سوات کے سین، بے گناہ قیدی، طوائف کا کوٹھا، الٹی چھلانگ لگانے والا مسخرہ اور بڑھکیں مارنے والا وِلن سب

فلموں میں مشترک ہوتے ہیں۔ لال موری پت کا بھی ہر فلم میں ہونا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ کاسٹ بھی قریب قریب ساری پنجابی فلموں کی ایک ہی ہوئی ہے لہٰذا ابتائیں تو کیا بتائیں۔

یہ بیان ان صاحب کا تھا۔ ہم پر اس کی ذمہ داری نہیں کیونکہ ہم تو عید بقر عید پر فلمیں دیکھنے والے ہیں۔ ہم تو اپنے مختصر تجربے کی روشنی میں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ فلمیں خصوصاً پنجابی فلمیں تنہا دیکھنے کی نہیں۔ جاتے ہوئے غالب کی طرح اپنے ساتھ نوحہ گر لے کے جانا چاہیے جو رلانے والا سین ہو تو آپ کی آنکھیں تولیے سے پونچھے۔ کولہے مٹکانے کا سین ہو تو آپ کی آنکھیں ہاتھ رکھ کر بند کر دے۔ ہنسانے والا سین ہو تو آپ کی بغل میں گدگدی کرے۔ آپ نڈھال ہونے لگیں تو آپ کو اسپرو کھلائے۔ لخلخہ سنگھائے۔ آپ کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر ساری فلم کے دوران میں آپ کے کانوں میں انگلیاں دیئے رکھے۔ ہم اپنے ساتھ کسی فالتو آدمی کو نہ لے گئے تھے لہٰذا اپنی ہی انگلیاں کانوں میں دیتے رہے۔ پنجابی فلموں کا ہر کردار آغا حشر کا تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنا اونچا ہوتا ہے کہ سنیماؤں کو ایمپلی

فائر لگانے کی حاجت نہیں۔ ہاں کوئی آلہ آواز دھیمی کرنے والا ہو تو اس کا لگانا مستحسن ہو گا۔

اس فلم میں چھ گانے، آٹھ مزاحیہ سین، دس دردناک مناظر، تین قاتلانہ حملے، بارہ لپاڈکیاں اور پندرہ سسپنس تھے۔ یہ مسالہ جس سے دوسرے ملکوں میں پچاس فلمیں بنائی جاتی ہیں ہمارے ہاں ایک ہی فلم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے فلمساز محنت نہیں کرتے۔ پچھلے دنوں ٹیلیویژن پر فلمسازوں اور فلم بینوں کا ایک مباحثہ ہوا تھا۔ وہاں ایک فلم بین نے اس بات کی تعریف کرنے کی بجائے اس پر اعتراض کیا ٹیلیویژن والوں نے دونوں پارٹیوں کے درمیان احتیاطاً میزوں کا ایک جنگلا بنا دیا تھا ورنہ ایک فلم ڈائیریکٹر تو اس فلم بین کو ضرور مار بیٹھتے۔ ہائے ہائے ہمارے ملک کے پاگل پاگل پاگل پاگل فلمساز۔ اگر وہ برا نہ مانیں تو یوں سہی۔ یہ پاگل پاگل پاگل پاگل نہیں دیکھنے والے کہ ایک ہی فلم کو مختلف ناموں سے بار بار ہم دیکھے جا رہے ہیں۔

انجمن معین الاموات

اخبار میں آیا ہے کہ گزشتہ بدھ کو گڑھی شاہو میں ''انجمن معین الاموات'' کا جلسہ ہوا جس میں نئے سال کے لئے عہدے دار منتخب کیے گئے۔

معین کا مطلب ہے مدد گار، اعانت کرنے والا۔ اموات جمع ہے موت کی۔ ہم نے یہ نام پہلی بار سنا تھا لہٰذا اس کے معنی کچھ غور کرنے سے سمجھ میں آئے لیکن جب سمجھ میں آ گئے تو ہم نے فوراً اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے کہا کہ ''دیکھو، لاہور والے تم کراچی والوں سے بازی لے گئے۔ اپنی انجمن بنالی۔ جو کام تم لوگ یہاں فرداً فرداً کرتے ہو اب وہاں اجتماعی طور پر ہوا کرے گا۔ اب یہ آباد کاری والوں پر زور دے

کر قبرستانوں کے لئے مزید زمین منظور کرالیں گے۔ یہاں تم لوگوں سے یہ بھی نہ ہو سکا۔"

آج کل نیکی کا زمانہ نہیں، بجائے اس کے کہ اس امر ضروری کی طرف توجہ دلانے پر وہ ہمارا شکریہ ادا کرتے، بپھر گئے اور کہنے لگے۔

"دیکھو جی۔ تم ہر پھر کر بات ہم پر لاتے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔ خود تمہارے پڑوس میں تابوت الحالما حکیم عزرائیل علی خاں مالک ہلاہل دواخانہ بھی تو موجود ہیں اور اب تو ہومیوپیتھوں کو بھی خلقِ خدا کے مارنے جلانے کا اختیار مل گیا ہے۔ طب چین و جاپان والے تو مریض پر وار کرنے کے لئے لائسنس تک نہیں لیتے۔ ان نیولوں اور سانڈوں اور درویش کی چٹکی والوں کو بھی تم بھول گئے، جن کی ایک پڑیا زکام، آشوبِ چشم، بواسیر، ہیضہ، کھٹّی ڈکاروں، گٹھیا اور گنج کا شرطیہ علاج ہوتی ہے، بلکہ چہرے کی رنگت سفید اور سفید بالوں کو کالا کرنے کے لیے بھی مزید کسی دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

ادھر سے ہماری توجہ ہٹی تو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ ملاوٹ کا کام کرنے والوں کی انجمن ہے جنہوں نے لکڑی کے برادے، بھٹے کی لال اینٹوں کے سفوف اور کیکر کی چھال

وغیرہ کی چھوٹی صنعتوں کو ترقی دے کر اتنا بڑا بنا دیا ہے۔ اب تک یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ تعمیر مکانات یا ایندھن کے کام کی سمجھی جاتی تھیں۔ ہلدی مرچ مسالوں اور چائے کے طور پر ان کا استعمال کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ موبل آئل بھی فقط بسوں اور ٹرکوں وغیرہ میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ کسی نے نہ سوچا تھا کہ یہ گھی کا نعم البدل ہے اور اس سے انسانی جسم کی گاڑی بھی خوش اسلوبی بلکہ زیادہ تیزی اور تیز رفتاری سے چلائی جا سکتی ہے۔ زندگی کی راہ جو پہلے ساٹھ سترّ اسّی سال میں طے ہوتی تھی، موبل آئل باقاعدگی سے استعمال کرنے والے اسے دو تین ہی سال میں طے کر لیتے ہیں۔

اس پر ہم اپنے پرانے کرم فرما سیٹھ ہلدی بھائی، چونا بھائی، نوٹوں والے، پرانے کوٹوں والے کے پاس گئے اور اس انجمن کے بنانے پر مبارک باد دی۔ انہوں نے فوراً موبل آئل میں تر تراتی جلیبیوں کی پلیٹ ہماری طرف بڑھائی، جوہڑ کا پانی ملے دودھ کی چائے کے ڈبل کپ کا آرڈر دیا جس میں کیکر کی چھال کے علاوہ چنوں کا چھلکا بھی استعمال کیا گیا تھا، جو اعصاب کے لئے خصوصاً گھوڑوں کے اعصاب کے لیے مفید مانا گیا ہے۔ اس کے بعد بھُس ملے تمباکو بیڑی ہمیں پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بابا انجمن نہیں ہے۔ ہم تو درویش گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شہرت سے ہمیں نفرت ہے۔ نام و نمود کا شوق نہیں، اس لیے خفیہ تہہ خانوں میں اپنا کام کرتے ہیں اور پبلک کی خدمت بجالاتے ہیں۔ اگر کوئی منصفی کرے تو دیکھے کہ فیملی پلاننگ والوں سے زیادہ مفید کام تو ہم کرتے ہیں۔ آخر آبادی کو کم ہی تو کرنا ہے۔"

اس کے بعد بھٹے کی اینٹوں سے بنے ہوئے کتھے اور پیپل کی لکڑی کی سپاری کا پان پیش کرتے ہوئے کہا۔ "حکومت کہتی ہے اناج بچاؤ۔ جب ہم نے اناج بچایا اور اپنے گوداموں میں بھر لیا تو اب حکم نکالا ہے کہ یہ بُری بات ہے۔ اسے باہر نکالو، سستا بیچو۔ بابا تم اخبار والا ہے، حکومت کو سمجھاتا کیوں نہیں۔ رزق جیسی انمول چیز کو سستا کیسے بیچ دیں۔"

اب ہم نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ انجمن بسوں، ٹرکوں اور رکشا والوں نے بنائی ہے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ہمارا دھیان سب سے پہلے اس طرف کیوں نہ گیا، جو پبلک کی خدمت کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے سے گریز نہیں کرتے اور فٹ پاتھ پر ٹرک چلا کر اور نالے میں بس گرا کر ثابت کرتے ہیں کہ انسان ہمّت کرے تو بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانا بھی کچھ مشکل کام نہیں۔ ہم پتہ پوچھتے پوچھتے ٹرک

ٹرانسپورٹ یونین کے دفتر پہنچے تو اس کے سیکرٹری جنرل نے فوراً ٹرانسسٹر کی آواز دھیمی کر کے نسوار کے چٹکے سے ہماری تواضع کی اور کہا۔ "ابھی حقّہ تازہ کر کے لاتا ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی انجمن معین الاموات کی اس ماہ میں کیا کارگزاری ہے اور آیا بس والوں کا پلّہ بھاری رہا ہے یا ٹرک اسے ہارن دیئے بغیر پاس کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔"

ہماری بات ان کی سمجھ میں آئی تو فوراً تھرڈ گیئر میں گفتگو کرنے لگے اور پھر فورتھ گیئر میں آنے کو تھے کہ ہم نے وہاں سے بھاگنے میں سلامتی دیکھی۔ اس اثنا میں سامنے "انجمن معین الاموات" شاخ کراچی کا بورڈ نظر آ گیا۔ ہم نے ہانپتے کانپتے اندر داخل ہو کر کہا:

"صاحبو! ہماری مدد کرو۔۔۔۔۔۔" اس پر ایک صاحب جو مٹکوں کے درمیان بیٹھے لٹھا ناپ رہے تھے، بولے۔ "جناب ہمارا کام تو مردے کو اس کی ابدی آرام گاہ تک پہنچاتا ہے۔ زندوں کے امور میں ہم دخل نہیں دیتے۔ وہ سامنے ٹرک آ رہا ہے۔ پہلے اس کے سامنے لیٹ جایئے پھر ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے۔"

دراصل ہم صوفی ہیں

بمبئی کے ایک پرچے میں اشتہار آیا ہے۔

شراب مت پیجئے

صوفیانہ زندگی بسر کیجئے

شراب ہم نہیں پیتے، نہ پینے کا جواز تو ہمارے پاس کوئی نہیں، بس نہیں پیتے۔ اس بات کو ہم نے کبھی کوئی اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ اس اشتہار کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ دراصل ہم صوفی ہیں۔ صوفیانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بے اختیار از راہِ

عقیدت اپنے ہاتھ پر بیعت کرنے کو جی چاہا۔ اس میں شک نہیں کہ کہیں قوّالی ہو رہی ہو تو ہمیں بھی آپ گھٹنا پہنے ململ کا کُرتا زیبِ تن کیے، چاندنی پر پھسکڑا مارے تبرک ٹھونگتے اور سر ہلاتے پائیے گا۔ قوّالوں پر قال اور حاضرین پر حال طاری ہو تو ایک آدھ نعرۂ مستانہ بھی ہم سے سرزد ہو جاتا ہے لیکن اس سے آگے نہیں۔ اپنے پر قدوۃ السالکین وغیرہ ہونے کا شبہ ہمیں کبھی نہ ہوا تھا۔ نہ یہ امکان بھی ذہن میں آیا تھا کہ ہم یہ حیات مستعار گزارنے کے بعد عرس سراپا قدس وغیرہ کے سزاوار ٹھہریں گے۔ ہمارے مزار پر لوگ چادریں چڑھایا کریں گے اور ملنگ لوگ بھنگ گھوٹا کریں گے۔ ہمارے نام لیواؤں سے لوگ سٹّے کے نمبر پوچھا کریں گے اور اولاد کے لیے تعویذ لینے آیا کریں گے؟ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

بمبئی کا یہ پرچہ جس میں یہ اشتہار چھپا ہے فلمی پرچہ ہے۔ جس کا مطلب بخوبی یہ لیا جا سکتا ہے کہ ایڈیٹر نے دو بوتل ٹھرّا پی کر اسے ایڈٹ کیا ہو گا اور کاتب نے چانڈو کا دم لگا کر اس کی کتابت کی ہو گی۔ المشتہرین کے طور پر نشہ بندی کمیٹی کا نام ہے۔ جانے یہ کون لوگ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شراب مت پیو، پیسے بچاؤ اور گورنمنٹ کو دو تا کہ ڈیفنس پر خرچ کر سکے۔ مطلب یہ کہ تمہاری جگہ فوجوں کو شراب پلا سکے۔

واقعی شراب بڑے کام کی چیز ہے۔ پچھلی جنگ میں چھمب سے بھاگنے والے سورماؤں کے مورچوں سے شراب کے کنٹر نکلے تھے۔ بھارتی حکومت کو معلوم تھا کہ یہ لوگ بقائمی ہوش حواس تو پاکستانی مجاہدین سے لڑنے سے رہے کہ کہیں اقدام خودکشی میں چالان نہ ہو جائے۔ پی کر البتہ ضرور لڑیں گے۔ ایک چوہے کو کہیں شراب کا پیالہ پڑا مل گیا۔ جانے کیا سمجھ کر غٹ غٹ پی گیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ پچھلے پاؤں پر سیدھا کھڑا ران پر ہاتھ مار رہا ہے اور للکار رہا ہے کہ نکالو بلی کو باہر۔ آج دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ خیر وہ پھر چوہا تھا۔ بھارتی فوجیوں میں سے اکثر مورچہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جو پکڑا گیا اس نے یہ عذر کیا کہ یارو مجھے معاف رکھو، میں نشے میں ہوں۔

ابھی بہت دن نہیں ہوئے کہ اس شہر بمبئی سے انجمن محبانِ شراب بننے کی خبر آئی تھی۔ ان لوگوں نے بھی اس قسم کا اشتہار دیا تھا کہ شراب پیو اور صوفیانہ زندگی بسر کرو۔ ان لوگوں نے حافظ وغیرہ کے کلام سے چُن چُن کر اپنے مطلب کے شعر دیئے تھے۔ جستجو تو نشہ بندی کمیٹی نے بھی کی تھی۔ لیکن انہیں سارے اُردُو فارسی ادب میں ایک بھی شعر ایسا نہ ملا جس میں ترکِ شراب کی تلقین کی گئی ہو۔ جس کا

دیوان اٹھاؤ یہی بنکار تا ملے گا کہ پلا ساقی مے باقی۔ یعنی جتنی مے باقی ہے میری بالٹی میں ڈال دے۔ بہت دن کی بات ہے، پنجاب میں ٹمپرنس سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن بنی تھی۔ یہ لوگ جلسے کرتے اور اس میں تمباکو نوشی کے خلاف دھواں دھار تقریریں ہوتیں۔ لوگوں پر تو چنداں اثر نہ ہوا۔ جو حقّہ پیتے تھے برابر شریعت حقہ کے پابند رہے۔ ہاں مولوی محمد حسین آزاد کی اُردُو کی پہلی کتاب میں جہاں لکھا تھا، ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ بیٹھا حقّہ پی رہا ہے، انہوں نے حقّے کو حذف کرا دیا۔ بس یہ رہ گیا کہ باپ بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ ظالموں نے یہ خیال نہ کیا کہ انسان خالی بیٹھا دیکھتا ہی بیوقوف لگتا ہے۔ اگر حقّے کے ذکر سے لوگوں کے حقّے کی طرف راغب ہونے کا اندیشہ تھا تو اب لوگ بیٹھے بیٹھے کاہل اور احدی نہ ہو جائیں گے؟ خالی بیٹھے الکسانے سے کیا بہتر نہیں کہ انسان حقّہ ہی پیے! خیر ان لوگوں نے اتنا تو کیا، نشہ بندی کمیٹی والوں نے تو اتنے کی بھی توقع نہیں کہ اُردُو شاعری سے شراب کے موضوع کے اشعار ہی نکلوا دیں۔

ایسے اشعار نکلوانے کی بات ویسے ہے دقّت طلب۔ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ اس بنیاد پر تطہیر ہوئی تو اُردُو میں بس گائے اور بکری اور بُلبُل کی فریاد قسم کی نظمیں رہ

جائیں گی۔ ایک بار حلقۂ ادبِ صالح کی طرف سے تحریک ہوئی تھی کہ گزشتہ را صلوٰۃ، آئیندہ ہمارے شعرا کو حرام اور ممنوع اشیا کے متعلق شعر نہ کہنے چاہیں۔ ان صاحبوں کا مطلب بھی شراب ہی سے تھا۔ کیونکہ سور اور جھٹکے کے گوشت کے متعلق لکھنے میں شعرا پہلے سے احتیاط کرتے آئے ہیں۔ ہم بھی اس حلقے کے بگوش تھے۔ لہٰذا سیکرٹری صاحب نے ہم سے بھی کہا کہ کیا شراب کے بغیر انسان کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ لکھنا ہی ہے تو اور مشروبات موجود ہیں؟ ان کی فرمائش پر ہم نے بادام، گنّے کے رس، سوڈا واٹر اور لسّی کے مضامیں باندھے لیکن یہ اعتراض کرنے میں باک نہیں کہ وہ کچھ مقبول نہ ہوئے۔ شائد ہم سے بہتر شاعر اس کی کوشش کرتے تو کامیاب ہو جاتے۔

یونیورسٹی پروفیسر اور طوطے کی توپ

کراچی کے اہلِ نظر جو تازہ بستیاں آباد کر رہے ہیں، ان میں ایک کراچی یونیورسٹی اسٹاف ٹاؤن بھی ہے۔ اس کا شمار ان ٹاؤنوں اور بستیوں میں نہیں ہے جن کے لمبے چوڑے اشتہار اخباروں میں آتے ہیں کہ آیئے سبز باغ میں مکان بنائیے، ایسا عمدہ موقع ہے کہ آپ کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آئے گا۔ پھر ایک دن معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کے ڈی اے سے منظوری لینا بھول گئے۔ پھر یہ پتہ چلتا ہے کہ زمینوں کے اصل مالک سے بھی جو گوٹھ فلاں کا زمیندار ہے، سودا پوری طرح طے نہ کیا تھا کیونکہ انسان خطا و نسیاں کا پتلا ہے۔ بعض بزرگ تو ان تازہ بستیوں کے آباد کرنے

والوں میں سے جو خریداروں کو ہزار ہزار گز کے پلاٹ مٹی کے مول آسان قسطوں پر دیتے تھے آخر حوالات میں بھی گئے۔

ع گز بھر زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

ہم نے ایک آدھ بار ایسے ایک بزرگ کی سفارش بھی کی کہ بھُول چُوک میں ایسا ہو جاتا ہے۔ افسر متعلقہ نے کہا ہم بھی تو انسان ہیں۔ خطا و نسیان کا مرکب ہونے کی رعایت ہمیں بھی تو دیجئے۔ انہوں نے بھُول چُوک میں پلاٹ بیچے اور لوگوں کی رقمیں کھائیں، ہم نے بھُول چُوک میں انہیں پکڑ لیا۔

خیر اس وقت بات کراچی یونیورسٹی کے اسٹاف ٹاؤن کی ہے۔ جس میں ہمارے دانشور طبقے کی کریم یعنی بالائی رہتی ہے یا جمی ہوئی ہے۔ یعنی یونیورسٹی کے استاد اور عملے کے دوسرے آدمی مقیم ہیں۔ اس کا سروے گھر کے ایک بھیدی یعنی یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کے ایک استاد اے ٹی عمر صاحب نے کیا ہے۔ اس میں عورتوں مردوں کی آمدنیوں، تنخواہوں، بچوں، نوکروں حتیٰ کہ ان کے نوالوں تک کو گنا گیا ہے۔ اگر کاتب صاحب جنھوں نے اس روز شورے کے تیزاب کو سونے کا تیزاب لکھ دیا تھا، آج نوالوں کو نواسوں لکھ جائیں تب بھی ہرج نہیں کیونکہ عمر صاحب نے

اپنے جائزے میں سب سے پہلا انکشاف یہی کیا ہے کہ اس ٹاؤن والے فیملی پلاننگ سے بے اعتنائی برتنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ ہر چند کہ فیملی پلاننگ کا بورڈ بھی چوراہے میں نصب ہے کہ جو بولے سونہال۔ بڑا کنبہ جنجال۔ چھوٹا کنبہ خوشحال وغیرہ لیکن جو کوئی بھی آتا ہے، اسے ٹھوکر ہی لگاتا ہے۔ حتیٰ کہ دمِ تحریر اس میں بچوں کی تعداد ۲۵ فیصد ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی کے متعلق تو ہم بوجہ احترام کچھ نہیں کہتے لیکن یونیورسٹی ٹاؤن ضرور بازیچۂ اطفال بن گیا ہے۔

اساتذہ کی اس بستی کے متعلق یہ جان کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ اس میں خواندگی کا تناسب ستّر فی صد ہے۔ آسان زبان میں یہ کہ کراچی یونیورسٹی کے ستّر فی صد استاد پڑھے لکھے ہیں۔ بعض ملکوں میں یہ تناسب اس سے زیادہ بھی ہوتا ہے۔ بعض یونیورسٹیوں کے تو سو فیصد استاد تعلیم یافتہ پائے گئے لیکن ہمارے ملک میں جہاں عام لوگوں کا تناسب خواندگی بیس فیصد سے زائد ہیں، اساتذہ میں سے ستّر فی صد کا لکھا پڑھا ہونا بھی بڑی بات ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے لکھے پڑھوں کا اتنا بڑا تناسب اگر اور کسی طبقے میں ہے تو وہ بے روزگاروں اور گداگروں کا ہے۔ سال گزشتہ حیدر آباد میں گداگروں کا جو سروے ہوا تھا اس سے معلوم ہوا تھا کہ ان میں

گدڑی کے کیسے کیسے لال ہیں۔ مڈل اور ہائی اسکول تک پڑھے تو بے شمار ہیں لیکن گریجویٹ بھی نایاب نہیں۔

شروع میں اور لوگوں کی طرح ہم بھی سب پروفیسروں کو پڑھا لکھا سمجھتے تھے۔ کم از کم یہ ضرور گمان تھا کہ حرف شناس ہوں گے اور اپنے دستخط کر لیتے ہوں گے۔ ہمارے سامنے کے فٹ پاتھ پر پروفیسر جی خان جو اس پیشے میں آنے سے پہلے گھسیٹے خان کہلاتے تھے اور گنڈیریاں بیچتے تھے، اب آج کل لوگوں کو قسمت کا حال بتاتے ہیں اور بیاہ شادی محبوب اور مقدمے وغیرہ کے ضمن میں نامرادوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ ایک بار ایک معاملے میں ہمیں ان کی گواہی کی ضرورت پڑی تو ہم نے ان سے کہا، پروفیسر صاحب لیجئے اس کاغذ پر دستخط کر دیجیے۔ فوراً انگشت چپ سامنے کر دیا کہ لیجئے، انگوٹھا لگایئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی تمام تر توجہ باطنی علوم پر رہی ہے۔ اس لیے ظاہری علوم کی انہوں نے زیادہ پروا نہیں کی۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ اسکول گئے بغیر آپ نے ستاروں کے علم اور جنات پر عبور کیسے حاصل کیا تو فرمانے لگے۔ یہ اللہ کی دین ہے۔

ممکن ہے یونیورسٹی کے استاد کہیں کہ ان کو فٹ پاتھ کے پروفیسروں یعنی قسمت کا حال بتانے والوں، طوطے سے توپ چلوانے والوں اور موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والوں کے زمرے میں کیوں شمار کیا جارہا ہے لیکن یہی اعتراض ان لوگوں کو بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ کیوں ملایا جارہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ بعض یونیورسٹی پروفیسروں کی تحریر و تقریر دیکھنے کے بعد اس اعتراض میں خاصا وزن محسوس ہوتا ہے۔ جس نے ایم اے کر لیا پروفیسر بن گیا۔ بھلا طالب علموں کے سامنے غالب پر تقریر کر لینا کون سا بڑا کمال ہے۔ کسی مجمع کے سامنے تقریر کر کے ممیرے کا سرمہ تو ذرا بیچ کر دکھائیں اور ایسا پروفیسر تو شاید کراچی یونیورسٹی میں ایک بھی نہ ہو گا جو طوطے سے توپ کیا بندوق بھی چلوا سکے۔ جنات کو قابو میں کرنے کا عمل تو شائد ہمارے وائس چانسلر صاحب تک کو معلوم نہ ہو۔

چڑیا گھر کے دروازے صحافیوں پر کھل گئے

رشک اور حسد اچھے جذبے ہوں یا برے، بہر حال انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ کئی بار ہمیں، کہ اپنی خودی کو بلند کر کے اپنا شمار ادیبوں میں کرتے ہیں، خیال آتا ہے کہ ہمارے صحافی یعنی اخبار نویس بھائی کتنی اچھی قسمت لے کر آئے ہیں۔ پچھلے دنوں کراچی کے کمشنر صاحب نے مکانوں کے لیے پلاٹ دیے تو صحافیوں کو۔ اگرچہ اس میں گیہوں کے ساتھ ساتھ کسی کسی گھن کا بھی فائدہ ہو گیا۔ یعنی ہمارے یار عزیز ابراہیم جلیس بھی لامکان سے لینڈ لارڈ ہو گئے لیکن ادیب بے چارے من حیث القوم اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور نالے کو رسا باندھتے رہ گئے۔ غالب

کسی نے کمشنر صاحب کو مشورہ دیا ہو گا کہ آج کل کے ادیب جب بغیر پلاٹ افسانہ بلکہ ناول تک لکھ سکتے ہیں تو کیا بغیر پلاٹ کے مکان کھڑا نہیں کر سکتے؟ یہ عالی خیال لوگ سنگ و خشت سے جہاں پیدا کرنے کے محتاج نہیں۔ یہ وہ شاہین ہیں کہ پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ شہروں میں بھی ہمیشہ صورتِ خورشید جیتے آئے ہیں، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے۔ یعنی اس محلے سے مالک مکان نے نکال دیا تو کسی دوسرے محلے میں جا بسے۔ وہاں مکاندار نے اپنے نرخ کو بالا اور اپنی نوا کو تلخ تر کر دیا تو کہیں اور جا براجے۔ فراغت ادیب کی دشمن ہے۔ کسی ادیب کو کھانے کو روٹی اور رہنے کو مکان مل جائے تو پھر وہ ادیب نہیں رہتا۔ رہتی دنیا تک زندہ رہنے والا ادب پیدا نہیں کر سکتا۔ وغیرہ۔

ہمارا اپنا معاملہ عجیب ہے۔ ہم نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ ہمیں بھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو سکا کہ ہم کیا ہیں۔ ادیب ہونے کا دعوی کریں تو ذی علم نقّاد فرماتے ہیں کہ تم اخباری اشتہاری آدمی کس برتے پر تتا پانی لکھتے ہو تو اخبار میں لکھتے ہو جو دوسرے روز ردی میں بک جاتا ہے۔ ادبِ عالیہ وہ ہوتا ہے کہ ناشر کے گودام میں پڑے پڑے اسے کیڑا بھی کھا جائے یا چوہا بھی کُتر جائے تو اسے زوال نہیں۔ دوسری پہچان اس

کی یہ ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے ڈکشنری اور اسپر و دونوں کی ضرورت بار بار پڑے۔ ادھر سے مایوس ہو کر جرنلسٹ برادری میں جائیں تو وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ یہ شعر گو اور افسانہ نویس بہت اونچا اُڑنے لگا ہے۔ صحافیوں میں قدم رکھنے کی کوشش کرتا ہے "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ ما نیست" جو شخص پریس کلب میں شطرنج، کیرم اور تمبولا کھیلنے اور چائے سگریٹ کی عاشقی میں آدمی کی بجائے آدمی کا کشتہ نہ بن جائے اسے ہم اپنے میں نہیں گنتے۔ نہ اسے ہم زمیں کے پلاٹ کا مستحق جانتے ہیں۔ اے صاحبہ چاہو تو ہمیں چمگاڈر کہہ لو کہ کبھی ادب کے شہتیر سے چمٹے ہیں اور کبھی صحافت کی شاخ سے الٹے لٹکے ہیں۔

لاہور اور کراچی کے ادیب کہ مدّت سے کاغذ پر ادیبوں کی ہاؤسنگ سوسائیٹیوں کے نقشے لیے پھرتے ہیں۔ آج کل اپنی بے خانمانی اور دربدری کا عشرہ ترقیات منانے کی سوچ رہے ہیں۔ خیر سے ان کی امیدوں اور عرضداشتوں کا تیسرا پنج سالہ منصوبہ جلد ہی شروع ہونے والا ہے کیونکہ جنوری میں رائٹرز گلڈ کی تاسیس کو دس سال ہو جائیں گے۔ اپنے صحافی بھائیوں کو ہم مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کو نہ صرف پلاٹ ملے بلکہ اس رعایت کا بھی اعلان ہو گیا ہے کہ وہ صحافی جو واقعی مستند صحافی ہیں یعنی جن

کے پاس اپنے اخبار کا شناختی کارڈ ہے، اسے دکھا کر چڑیا گھر مفت دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اعلان کراچی کارپوریشن کے چیئرمین صاحب جاتے ہوئے کر گئے ہیں۔ ہم نے تحقیق کیا آیا یہ شاندار رعایت ادیبوں کو بھی دی جائے گی؟ کارپوریشن کے دفتر سے معلوم ہوا کہ جی نہیں۔ اپنا منہ دھو رکھیے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا بھر میں کسی صحافی کے ساتھ اس قسم کی رعایت نہیں برتی جاتی۔ واٹر لپ میں اور آرٹ بخوالڈ وغیرہ اور نہ جانے کون کون کہ اپنے کو بڑا تیس مار خاں اخبار نویس جانتے ہیں، چڑیا گھر جائیں تو ان کو پورے پیسے دے کر ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ پاکستانی صحافیوں کی طرح نہیں کہ پاس دکھایا اور دندناتے مونچھوں پر تاؤ دیتے چار آنے ادا کیے بغیر چڑیا گھر میں داخل ہو گئے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ شام کو چڑیا گھر کا وقت ختم ہونے پر ان کو نکالنے کا بھی حکم ہے یا یہ لوگ چاہیں تو رات بھی وہاں رہ سکتے ہیں۔ ایک زمانہ میں تو وہاں بہت سے پنجرے خالی ہوتے تھے۔ اب کا کہہ نہیں سکتے۔ کیونکہ مسئلہ فقط ٹھکانے کا ہے۔ کھانے کے لیے تو چڑیا گھر کے تماشائی مونگ پھلی، پرمل چاول، بھٹے، کیلے وغیرہ چڑیا گھر کے مکینوں کے لیے لے ہی جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ادیبوں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان پر چڑیا گھر کے دروازے بند ہیں۔ چلئے مکان اور پلاٹ نہیں ملتا نہ سہی۔ ہم اس پر اصرار نہیں کرتے۔ کیونکہ لا مکانی میں بھی ایک مزہ ہے لیکن چڑیا گھر کے پاس انہیں بھی جاری کر دیے جائیں تو بڑی حد تک ان غریبوں کی اشک شوئی اور پرانی بے انصافیوں کی تلافی ہو جائے۔ جب کبھی ہمارا دل طرز تپاک اہلِ دنیا دیکھ کر جل اٹھے تو چڑیا گھر میں جا بیٹھے۔ گھاس کا بھی وہاں وافر انتظام ہے کہ کھودنے اور کھانے دونوں کام آ سکتی ہے۔ وہیں شام کو صبح اور صبح کو شام کر دیا۔ اس انتظام سے عام ادب دوستوں اور قاریوں کو بھی سہولتیں ہو جائیں گی جو ادیبوں کی شکل دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ پھر یہ ہو گا کہ جسے حضرت گلدم امیٹھوی یا عقرب امر تسری یا گور خر رومانی کی زیارت کا شوق ہوا، چونّی میں چڑیا گھر کا ٹکٹ لے کر اندر جا کر انہیں دیکھ لیا کرے گا۔ چونّی تو انہی کی زیارت سے وصول سمجھنی چاہیے۔ باقی جانور مفت میں دیکھ لیے۔

سائل اور گدا

سنا ہے کہ شہر میں گداگدوں کو اٹھانے کا ہفتہ شروع ہو گیا ہے۔ پہلے گداگر سخی داتا کو دیکھ کر اس کے پیچھے بھاگتے تھے۔ اب آگے بھاگتے ہیں کہ کہیں پکڑوا نہ دے۔ شہر کے اکثر یتیم اپنے والدین کے ہمراہ حیدرآباد کو ہجرت کر گئے۔ کچھ جو تماشائے اہلِ کرم دیکھنے پر مصر رہے، اب پولیس والوں کے مہمان ہیں۔ یہ بھی برا نہ ہوا۔ چند دنوں کے لیے روٹی کپڑا نیک مائی نیک باوا کے ذمے نہ سہی سرکار کے ذمے

ہی سہی۔ پھر ایک ہی ہفتے کی تو بات ہے، باقی اکاون ہفتے تو اپنے ہی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس بار پولیس دربدر پھر کر چندہ مانگنے والوں پر بھی گرفت کر رہی ہے۔ یہ

سن کر ہمارے بعض دوستوں نے جو رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر ہیں، اپنی پیشانی پر سے (ہمارا مطلب ان کے اخباروں رسالوں کی پیشانی سے) سالانہ چندہ وغیرہ کے الفاظ اڑا دیے۔ اور تو اور چند اقلم، چند ابیڑی وغیرہ والوں کو بھی لوگوں نے گڑبڑا دیا ہے کہ بھائیو خطرہ ہے۔ کہیں کوئی این ہم بچہ شتر است کہتا ادھر نہ آ نکلے۔ پرانے شاعروں کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی چوروں کی پکڑ دھکڑ ہوتی تھی تو دزدِ حنا کے نام کا بھی پرچہ چاک ہوتا تھا۔ ہاتھ پر مہندی لگاتے ہیں۔ جو نشیبی علاقے مہندی سے بچ رہتے ہیں ان کو اصطلاح میں دزدِ حنا کہتے ہیں۔ لیکن پولیس والوں سے یہ توقع کرنا کہ تعزیرات اور ضابطہ فوجداری کے علاوہ ڈکشنری میں بھی دیکھا کریں اور ایم اے اُردُو میں داخلہ لیں، ذرا زیادتی ہے۔ ایک بار لاہور پولیس نے ایک پیکٹ پکڑا تھا کیونکہ مخبر کی اطلاع تھی کہ اس میں فارغ بخاری صاحب نے پشاور سے زیر و بم رکھ کر بھیجا ہے۔ بڑی احتیاط سے کہ پھٹ نہ جائے، پیکٹ کو کھولا گیا تو تصدیق ہوئی کہ ان کے مجموعۂ کلام زیر و بم کا مسودہ ہے (Zero bomb) نہیں ہے۔

ہم اپنے ان شاعر احباب کو بھی جن کے تخلص سائل، گداو غیرہ ہیں یہ مشورہ دیں گے کہ اس ہفتے گھر سے نہ نکلیں۔ گدا کے تخلص سے پرہیز کا مشورہ تو ہم ایک اور بنا پر بھی دیں گے۔ ہمارے وطن پنجاب بالخصوص لاہور کے صحت مند لوگ بعض اوقات بے ضرورت بھی ہر لفظ کے تلفظ میں دو چشمی ھ کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ آج کل اتنی فرصت کسے کہ ٹانگیں گنتا پھرے، دو ہیں یا چار۔ اور پھر سینگ ان میں سے کسی کے بھی نہ ہونے کے باعث ایسی غلط فہمی ایک حد تک قابل معافی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح خطوں میں اپنے نام کے ساتھ حقیر فقیر لکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ ہمارے ایک دوست جو اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ خاکسار لکھا کرتے تھے، خاکساروں کی پکڑ دھکڑ کے زمانے میں ایک دن رات کے لیے حوالات ہو آئے ہیں۔

ادھار کے لفظ سے خیال آیا کہ مانگنا کا مصدر اس کے ساتھ بھی لگتا ہے۔ یوں تو آج کل دعا مانگنا بھی خطرے سے خالی نہیں لیکن ادھار میں تو پیسے ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں۔ یعنی بنا بنایا ثبوت ہے۔ ہمارے احباب جانتے ہیں کہ صرف مشتاق احمد یوسفی کا نہیں ہمارا بھی بینکنگ سے پرانا تعلق ہے۔ وہ اس طرح کہ

شائد ہی اس ملک میں کوئی بینک ہو جس سے ہم نے کبھی قرض نہ مانگا ہو۔ اور اس نے انکار نہ کیا ہو۔ حالانکہ اچھے زمانے میں ہم خود بینکوں کی دامے درمے مدد کرتے رہے ہیں۔ ایک بار ایک مشہور بینک نے اخبار میں یہ دراخوست طبع کرائی تھی کہ ہمارے ہاں روپے جمع کرائیے۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ گھر میں بھی روپیہ بیکار ہی پڑا ہے، اچھا ہے ان لوگوں کی مدد ہو جائے، ساری رقم وہاں جمع کرا دی۔ سو روپے سے کچھ اوپر ہی ہوں گے اور ہمیں یقین ہے کہ بینک مذکور نے کسی کاروبار میں لگا کر لاکھوں کے وارے نیارے کیے ہوں گئے۔ لیکن چند ماہ بعد بینک کا رویہ یک سر تبدیل ہو گیا۔ کہاں تو یہ عجز و الحاح کہ اخبار میں ضرورت روپیہ کی اپیلیں شائع کرا رہے ہیں اور کہاں یہ کہ ہمارا کھاتہ خود ہی بند کر کے پانچ روپے چپراسی کے ہاتھ ہمارے پاس بھجوا دیے کہ صاحب اپنا اکاؤنٹ کہیں اور کھو لیے۔ اس سے زیادہ کا تو آپ کے کھاتے کی اسٹیشنری ہی کا خرچ ہے۔ ہم یہ ذکر بھول گئے کہ مہینے بھر کے بعد ہم نے پانچ روپے چھوڑ کر باقی رقم نکلوا لی تھی اور اس کے بعد پہلی کو چیک جمع کرتے اور دوسری کو روپیہ نکلوا لیتے۔ کیوں نہ نکلواتے۔ ہمارا اپنا روپیہ تھا۔

بات گداؤں سے چلی تھی۔ مضمون کی رعایت سے آوارہ ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ گداگروں کے متعلق یہ فرض کر لینا درست نہ ہو گا کہ سبھی فراڈ ہوتے ہیں۔ بعض کی مجبوریاں پیدائشی بھی ہوتی ہیں۔ ابھی کل ہی ایک لڑکا معصوم صورت گلے میں تختی لٹکائے آیا، جس پر لکھا تھا کہ میں گونگا بہرا یتیم ہوں۔ راہِ مولا مدد کیجئے۔ ہم نے ایک روپیہ دیا اور چمکار کر پوچھا کہ برخودار کب سے گونگے بہرے ہو؟ بولا جی پیدائش ہی سے ہوں۔

میلہ مویشیاں میں اول انعام ایک شاعر کو ملا

اخبار میں آیا ہے کہ اُردُو کے مشہور شاعر اور صحافی جناب خلیق قریشی مدیر روزنامہ ''عوام'' لائلپور کو ششماہی میلہ مویشیاں کے جلسۂ تقسیمِ انعامات میں گورنر صاحب نے ایک ہزار روپے کے انعام سے نوازا ہے۔ پہلے ہم سمجھے کہ خلیق صاحب نے کوئی بھینس پالی ہو گی اور اسے مقابلے میں داخل کیا ہو گا۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ انعام خود ان کو ملا ہے۔ جب ہمیں ایک اور طرح کی غلط فہمی ہونی شروع ہوئی تو ایک دوست نے وضاحت کی کہ اس میں خلیق صاحب کی صحت مندی اور ضخامت کی طرف کوئی اشارہ نہیں، یہ انعام ان کی قومی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ہے۔

خلیق صاحب قادر الکلام شاعر اور پرانے صحافی ہیں۔ وہ اس اعزاز کے ہمیشہ سے مستحق تھے۔ ہاں اس میں ہمیں کلام ہے کہ میلہ مویشیاں اس اعزاز بخشی کے لیے موزوں مقام تھا۔ ہمیں تو خیر معلوم ہے ہی کہ یہ انعام ان کی ادبی خدمات کا صلہ ہے لیکن لاکھوں قارئین کو فرداً فرداً ان کے گھر جا کر کون سمجھائے گا۔ ایسی غلط فہمی ہمیں پہلے بھی ہو چکی ہے۔ ایک مشہور افسانہ نگار صاحبہ نے ایک بار ہم سے فرمائش کی تھی کہ آپ مقامی وٹرنری اسپتال والوں کے خلاف لکھیے۔ میں کئی روز سے وہاں جارہی ہوں لیکن کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔ ہم نے ان سے کہا کہ جب شہر میں دوسرے اسپتال انسانوں کے علاج کے موجود ہیں تو آپ مویشوں کے اسپتال جاتی ہی کیوں ہیں؟ وہ بہت ناراض ہوئیں اور بولیں، میں وہاں اپنے علاج کے لیے تھوڑا ہی جاتی ہوں، اپنی بیمار بکری کو لے کر جاتی ہوں۔

قیاس کہتا ہے کہ میلہ مویشیاں کے موقع پر کوئی مشاعرہ ہوا ہو گا جس میں خلیق صاحب نے مویشیوں کے متعلق یا پھر ویسے ہی کوئی قومی یا رومانی نظم پڑھی ہو گی۔ دراصل آج کل مشاعرے کی رسم ہر تقریب پر ہے۔ پچھلے دنوں بیمہ کمپنیوں کی طرف سے ہوا۔ گزشتہ ماہ ایک مشہور میمن رئیس نے اپنے بچّے کے ختنے پر پہلے مجرا

کرانا چاہا لیکن جب معلوم ہوا کہ اس میں خرچ زیادہ پڑتا ہے تو مشاعرہ کرا لیا۔ ہمارے دوست اور مشہور شاعر دیوانہ میر ٹھی نے ایک بار ہم سے آکر فخریہ بیان کیا کہ حجاموں کی سالانہ آل پاکستان کانفرس میں پہلا انعام مجھے ملا ہے۔ ہم نے کہا اچھا مبارک ہو۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ ہمارا خیال تھا نرے شاعر ہیں، اک ذری ہمارے بال بھی کاٹ دیجیے۔ بھنّا کر کہنے لگے۔ جناب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے انعام بال کاٹنے پر نہیں ملا اس کانفرس کے مشاعرے میں غزل پڑھنے پر ملا ہے۔

آئندہ کے لیے ہماری سفارش ہے کہ اس قسم کی تقریبوں کے اعلانات زیادہ مفصّل اور واضح ہوا کریں۔ ورنہ کل کلاں یہ بھی سننے میں آسکتا ہے کہ بزمِ اُردُو لاڑکانہ کے سالانہ مشاعرے میں کمشنر صاحب نے ایک بھینس کو انعام اور خلعتِ فاخرہ عنایت کی ہے۔ بعد میں تحقیق سے پتہ چلے کہ دونوں تقریبیں یعنی مشاعرہ اور میلہ مویشیاں ایک ساتھ تھیں، اس لیے خبریوں بن گئی۔ ورنہ بھینس کو یہ انعام غزل پڑھنے پر نہیں ملا۔ عین ایسے ہی جیسے خلیق صاحب کو انعام زیادہ دودھ دینے پر نہیں ملا۔ پچھلے سال جشنِ مہران کے موقع پر بھی کچھ ایسی واردات ہو چلی تھی۔ خبر آئی کہ اس تقریب کے ضمن میں گھوڑوں کی نمائش اور مشاعرے کے لیے یکساں

رقمیں رکھی گئی ہیں۔ کچھ شاعروں نے شور مچایا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ گھوڑوں گدھوں کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہیے۔ ہم نے بھی ایک کالم اس موضوع پر لکھا اور ایک افواہ کی بنا پر ذکر کیا کہ دعوت نامہ میں بھی آیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مشاعرے میں شرکت کے لیے ہے یا نمائش میں۔ سنا ہے خود منتظمین میں بھی بحث ہوئی کہ ہمیں بلایا جائے تو کس تقریب سے، بطور شاعر یا گھوڑے کی حیثیت سے۔ اس بحث میں اتنا وقت گزر گیا کہ ہم نہ جا سکے۔ ہم ذاتی طور پر تو اپنے کو شاعر ہی سمجھتے ہیں، گھوڑا نہیں۔ لیکن چونکہ جشنِ مہران میں بھی جلسۂ تقسیمِ انعامات یکجا ہوتا ہے لہٰذا کیا عجب اس موقع پر بھی اخباروں میں اسی قسم کی خبر چھپتی کی سکھر کی گھوڑ دوڑ میں ابنِ انشاء صاحب اوّل آئے۔

اُردُو ادب میں ہمارا مقام

اُردُو ادب میں ہمارا جو مقام ہے (ہماری اپنی نظر میں) اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کچھ کہیں گے تو کسی کی زبان تھوڑا پکڑی جا سکتی ہے۔ لوگ اسے خود ستائی پر معمول کریں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے مضامین میں ہم کورے ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے ہمارے نابلد ہونے کی بات جو اتنی مشہور ہے اس کی کچھ اصل نہیں۔ ڈرامہ ہو یا موسیقی یا مصوّری کسی میں ہم کسی اور سے پیچھے نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے معیار بہت اونچے ہیں۔ لندن میں ہم نے سر لارنس الیور کا ایک کھیل دیکھا اور بہت خوش ہو کر اخباری نمائندوں سے ان کی ہونہاری کی تعریف

اور ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی اور یہ واقعی سچ ہے کہ وہ برابر اسٹیج پر آتے رہے تو ایک دن نام پیدا کریں گے۔ شکپسیر کو بھی ہم بہت پسند کرتے ہیں اور اُردُو کے نقّادوں سے متّفق ہیں کہ اپنے زمانے کا آغا حشر تھا۔ موسیقی میں لوگوں نے ہمیں اس روز روشن آرا کی گائیکی پر سر ہلاتے پکڑا۔ ایک روشن آرا ہیں اور ایک اور ہیں جن کا بھلا سا نام ہے اور ان سب کے فن سے ہم محظوظ ہونے پر قادر ہیں بشر طیکہ ہمیں پہلے سے کوئی بتا دے کہ یہ روشن آرا گا رہی ہیں یا نور جہاں ہی ہیں۔ مصوّری میں ہم اپنی ژرف نگاہی کے قائل ہیں۔ اس روز کسی نے ہمیں اپنی تصویر دکھائی۔ ہم نے پوچھا کس کی ہے۔ معلوم ہوا پکاسو کی ہے۔ ہم نے کہا یہ بات ہے تو بہت اچھی ہے۔ پکاسو کے کیا کہنے ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ اس کا ایک ایک نقش فریادی ہے اور رنگ کتنے اعلیٰ کوالٹی کے لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے کراچی آرٹ کونسل میں کئی مقامی مصوّروں کی نمائشیں دیکھی ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ پکاسو کا کوئی جواب نہیں۔

کتّوں کے کاٹنے کے اوقات مقرر ہو گئے

اخبار کی خبر سے معلوم ہوا ہے کہ کراچی میں کتّوں کے کاٹنے کے اوقات مقرر ہو گئے ہیں۔ وہ دن گئے جب یہ اپنی من مانی کیا کرتے تھے۔ جب چاہا کاٹ لیا، دانت گڑو دیئے۔ نہ دن دیکھتے تھے نہ رات دیکھتے تھے۔ اب ان کو گھڑی دیکھ کر کاٹنا ہو گا۔ بس صبح ۹ بجے سے ۴ بجے تک اجازت ہے۔ اس سے باہر نہیں۔ جمعہ اور ہفتہ کو فقط دوپہر تک کاٹ سکتے ہیں اور اتوار کو بالکل منع ہے۔ بعض اور دنوں اور تہواروں کی چھٹیاں بھی لازمی ہیں جن کی فہرست کوئی بھی کتّا کارپوریشن کے دفتر جا کر ملاحظہ کر سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ہماری اطلاع کا ذریعہ بالواسطہ ہے کیونکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کتّوں کے نام کوئی تحریری سرکلر جاری نہیں کیا گیا۔ شاید اس لیے کہ ہمارے ملک میں کتّوں کی شرح خواندگی انسانوں سے بھی کم ہے۔ معلوم رہے کہ پاکستان میں انسانوں کی شرح خواندگی پندرہ فیصدی کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے دس فیصدی کو تو پڑھنے کی کتابیں نہیں ملتیں اور وہ اپنا پڑھا پڑھایا بھول جاتے ہیں۔ پانچ فیصدی کے قریب فلموں کے بورڈ اور ڈائجسٹ پڑھ پڑھ کر اپنی خواندگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض طبقوں مثلاً اعلیٰ افسروں، ادیبوں، صحافیوں، اسکول ٹیچروں اور پروفیسروں وغیرہ کی ایک بڑی تعداد خواندہ ہے اور دستخط تو قریب قریب سبھی کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ کہیں کوئی سیاستدان بھی پڑھا لکھا نکل آئے تو تعجّب نہ کرنا چاہیے لیکن عام آبادی کا یہ حال نہیں اور جانوروں کو تو نئی پالیسی تک میں نظر انداز کیا گیا ہے۔

آج کل اپنا ذریعہ معلومات تو بالعموم کوئی نہیں بتاتا اور ہم صحافیوں کو تو بالخصوص اس کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی ہم بتا دیں کہ اس پابندی کا علم ہمیں سول اسپتال کے ذریعے سے ہوا ہے جنھوں نے کتّے کا کاٹے کے لیے علاج کی سہولت صبح

۹ بجے سے ۴ بجے تک کے لیے رکھی ہے۔ ظاہر ہے انہوں نے سفارتی سطح پر یا کسی چوٹی کی کانفرنس میں کتّوں کے ساتھ مقررہ اوقات میں کاٹنے کا کوئی شریفانہ معاہدہ طے کیا ہو گا۔ ورنہ وہ دن رات کے بھی اوقات میں اسپتال کھلا رکھتے۔ بہتر ہوتا کہ وہ سول اسپتال میں اوقات کا بورڈ آویزاں کرنے کے ساتھ ساتھ اس معاہدے کی مناسب پبلسٹی بھی کرتے اور شہری آبادی کو بھی ہدایت کرتے کہ وہ اپنے آپ کو ان اوقات سے باہر کتّوں سے ہر گز نہ کٹوائیں۔ ہمارے ملک میں ایسے غیر ذمہ دار لوگوں کی کمی نہیں جو جس وقت جی چاہتا ہے، کسی کتّے کے منہ میں جا کر اپنی ٹانگ دے دیتے ہیں۔ یہ بری بات ہے۔ اگر کسی کو بہت ہی شوق ہے تو کسی اور جانور سے کٹوا سکتا ہے۔ کاٹنے والے دیگر جانوروں کی فہرست بھی غالباً کارپوریشن یا سول ہسپتال سے ان کے دفتر کی اوقات میں حاصل کی جاسکتی ہے۔

اوقات کی پابندی کے لیے کئی تجویزیں کارپوریشن کے زیرِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر کتّے کو ایک ایک گھڑی مہیا کی جائے اور اسے وقت دیکھنا بتایا جائے۔ ہمارے خیال میں ایک ایک گھڑی شہریوں کے لیے بھی ہونی چاہیے تاکہ وقت بے وقت کتّوں سے فرمائش نہ کریں کہ ہمیں کاٹو۔ سائرن بجانے کا انتظام بھی ہو سکتا ہے، مہذّب

ملکوں میں جہاں وقت کی پابندی جزوِ ایمان ہے، ہمیں نہیں معلوم اس سلسلے میں کیا ہوتا ہے۔ ولایت جا کر ہم اور ہی قصّوں میں الجھے رہے۔ اس مسئلے کا مطالعہ نہ کر سکے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن بھی اس سلسلے میں خبر دار کر سکتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے بیشتر کتّوں کو پاکستان ٹیلیویژن کارپوریشن ان کے لیے lassie نام سے آج کل ایک خاص پروگرام چلارہی ہے جس میں ایک کتّااور اس کے ساتھ پالتو انسان اور بچے وغیرہ ہیں۔

آ گئے قوم کی بے لوث خدمت کرنے والے

ہمارے دوسرے اعلان کا انتظار کیجئے!!

جوں جوں الیکشن قریب آرہے ہیں لوگوں میں بے لوث خدمت کا جذبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ہم نے بعض چاہنے والوں سے کہا بھی کہ حضرت آپ اپنا گھر بار دیکھئے، کاروبار دیکھئے۔ اتنے ایثار کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن جواب یہی ملتا ہے کہ ہم قوم کی ناؤ کو منجدھار میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ الیکشن میں کون کون کھڑا ہو رہا ہے فی الحال معلوم نہیں۔ وثوق سے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم کھڑے نہیں ہو رہے۔ کم از کم فی الحال ہمارا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں، کیونکہ ہم نام و نمود سے کوسوں دور

بھاگتے ہیں۔ البتّہ اگر دوسرے امیدوار موزوں نہ ہوئے، جس کا ہمیں اندیشہ ہے تو شاید پبلک کے اصرار سے مجبور ہو کر قوم کی خدمت اور نظریۂ پاکستان کی حفاظت کے لیے میدان میں آنا ہی پڑے کیونکہ بے جا ضد ہماری طبیعت میں نہیں ہے۔ ہماری ذات اور خدمات محتاجِ تعارف نہیں اور ہمیں اعتراف ہے کہ ہم ہر طرح سے آپ کے قیمتی ووٹ کے مستحق بلکہ حقدار ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں ہمارے قطعی فیصلے کے لیے ہمارے دوسرے اعلان کا انتظار کیا جائے جو جلد ہی اُردُو میں کیا جائے گا۔

ہمارے محترم بزرگ ڈاکٹر ایم اے خانزادہ نے البتّہ ابھی سے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیاہے اور ہمارے پاس ان کا ایک کتابچہ پہنچاہے جس کا عنوان ہے ''قرآن کریم کی ایک ہزار آیات۔'' ڈاکٹر صاحب جامع کمالات آدمی ہے۔ عام ڈاکٹروں کی طرح نہیں کہ صرف آدمیوں کا علاج کرتے ہیں۔ ان کا فیض عام ہے۔ انشا اللہ شفایاب ہو کر واپس آئے گا۔ پہلے تو یہ خود کو فقط ڈاکٹر ایم اے خانزادہ ہی لکھا کرتے تھے۔ پھر شاید کوئی پرانا شجرہ، اپنا یا کسی اور کا، ان کے ہاتھ آگیا اور یہ خود کو نواب لکھنے لگے۔

اب کے سرورق پر جگہ زیادہ خالی پائی تو اپنی ذات پر سے تصوّف و سلوک کے کچھ پردے بھی اٹھا دیے ہیں اور ہم ان کا نام یوں لکھا پاتے ہیں۔

ڈاکٹر نواب ایم اے خانزادہ حنفی نقشبندی، بریلوی۔

اتنی نسبتیں مشخص ہونے کے باوجود ان کی وجہ شہرت کچھ اور ہی ہے۔ آپ ہمارے کالموں کی رونق ملکہ تغزل، شعلہ سخن، موجدِ صوتِ واحد مس بلبل کے نفسِ ناطقہ یعنی وزیر اعظم اور وزیرِ خارجہ وغیرہ ہیں۔ چونکہ اتنے بڑے منصب کے لیے فی زمانہ قریبی عزیز ہونا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا واضح ہو کہ مس صاحبہ موصوفہ کے والد گرامی بھی ہیں۔

یہ بات پشے تک محدود نہیں بعض اور لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ جب قصد خوں کو آئیں تو پہلے پکار دیں۔ سرورق پر جس طرح پرانی کتابوں میں "حسبِ فرمائش، جے ایس سنت سنگھ" وغیرہ لکھتے ہیں، یہاں بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ کتاب مستطاب، بعون صناع مکین و مکان، جس کی بنیاد پر ایک اسلامی مملکت کا دستور تیار کیا جا سکتا ہے، ملکہ تغزل، مس بلبل امیدوار قومی اسمبلی پاکستان الیکشن کی خصوصی درخواست پر لکھی گئی ہے۔ ورق الٹئے تو معلوم ہو گا کہ خانزادہ صاحب سے لوگوں

نے کہا تھا کہ "آپ ۱۹۱۴ سے سیاست کے میدان میں آ چکے ہیں۔ خود کھڑے ہو جایئے کیونکہ آپ کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔" لیکن یہ نہ مانے اور اپنی جگہ بقول خود "اپنی سب سے ذہین اور فہیم اولاد مس بلبل کو کھڑا کیا۔" قارئین کرام ہم سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ کیونکہ اظہر من الشمس ہونے کی وجہ سے ہم خود نہیں جانتے۔ اتنی تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا جانے کے باعث کوئی کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب ہی کے الفاظ میں ان کے کو یہ مژدہ دیتے ہیں کہ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی تمام عمر مس بلبل کو مشورہ دیتا رہوں گا اور جب قربانی کی ضرورت پیش آئے وہ مجھے سب سے آگے پائیں گی۔" چونکہ لوگ قربانی کا نام سنتے ہی کھال لینے پہنچ جاتے ہیں لہٰذا ہم واضح کر دیں کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ لفظ یہاں استعارتاً استعمال کیا ہے۔

دستور بنانا خصوصاً اسلامی دستور بنانا ہمارے ہاں گھریلو دستکاری بن چکا ہے۔ جہاں دو آدمی بیٹھ گئے، اسلامی دستور بنانا شروع کر دیا۔ صدرِ مملکت کا اعلان سنتے ہی ڈاکٹر صاحب اور مس بلبل نے ہمیں اور ہم جیسے ہی دو ایک اور صاحبانِ علم و فضل کو دعوت نامہ بھیجا تھا کہ اب کی اتوار ہمارے ہاں آیئے۔ کھانا ہو گا اور کھانے کے بعد

پاکستان کا دستور بنا کر صدرِ مملکت کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ افسوس کہ ہم نہ جا سکے اور دستور بننے میں اتنی دیر ہو گئی جس کے لیے ہم قوم کے آگے شرمندہ ہیں۔ ہم گھنٹے دو گھنٹے کے لیے چلے جاتے اور دستور بنا آتے تو ڈاکٹر صاحب کو یہ کتابچہ نہ چھاپنا پڑتا، جس کی پیشانی پر لکھا ہے کہ مقصد اس کا بھی ایک اسلامی مملکت کا دستور تیار کرنا ہے۔

اس الیکشن نامے کا نام ہم بتا چکے ہیں ''قرآن کریم کی ایک ہزار آیات'' انداز اس کا یہ ہے کہ پہلے آیت پھر ترجمہ پھر توضیح۔ توضیح میں لامحالہ مس بلبل کی زندگی اور خدمات اور عزائم کے حوالے اور اشارے آ گئے ہیں۔ مثلاً آیت تو یہ ہے (ترجمہ) ''اور میں نے جہاد کیا خدا کی راہ میں۔ پھر قتل ہو گیا یا غالب آ گیا۔'' توضیح میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ مس بلبل اپنی بزم نعت و ادب کی جس کی وہ بانی اور مستقل صدر ہیں سارے اسلامی ملکوں میں شاخیں قائم کریں گی۔ پھر آیت ہے (ترجمہ) ''اور قتل کیا داؤد نے جالوت کو اور دیا اللہ تعالیٰ نے اس کو ملک۔'' توضیح میں ارشاد ہوتا ہے کہ صدر ایوب کو نالائق کہنے والا خود نالائق ہے۔ ایسے ہی ایک آیت کی توضیح میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ وزیرِ خارجہ نے یک طرفہ معاملہ اقوامِ متحدہ میں

پیش کر کے غلطی کی۔ مس بلبل کو انتخاب مل گیا تو یہ کشمیر اور حیدر آباد دونوں کے معاملات اقوام متحدہ میں ایک ساتھ پیش کریں گی۔ ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ قومی اسمبلی کا ممبر جو ہوتا ہے وہیں نشستن گفتن اور برخاستن کر کے گھر چلا آتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ذکر کا کیا محل ہے؟ ایسے ہی کم فہم مگس کے باغ میں جانے پر معترض ہوا کرتے ہیں کہ اس سے پروانے کے خون کا کیا تعلق ہے؟ بات سیدھی صاف ہے۔ مس بلبل اسمبلی کی ممبر بن گئیں تو ہم پاکستان کے تین کروڑ شاعروں کی طرف سے مطالبہ کریں گے کہ ان کو وزیرِ خارجہ بنایا جائے۔ اس لیے نہیں کہ ہم چاہتے ہیں یہ ملک کے باہر ہی رہیں، کبھی یہاں نہ آئیں بلکہ اس لیے کہ یہی ہیں جو اقوامِ متحدہ میں کشمیر اور حیدر آباد کے مسائل کو منظوم کر کے پیش کر سکتی ہیں۔ اتنی لمبی لمبی نظمیں سننے کی کس میں تاب ہے۔ اقوامِ متحدہ کہے گی کہ بابا جاؤ کشمیر لے جاؤ اور حیدر آباد بھی لے جاؤ اور ہاں جونا گڑھ بھی رکھا ہے۔ اپنے سوٹ کیس میں ایک طرف کو اسے بھی ڈال لو۔

ڈاکٹر خانزادہ صاحب کا یہ پمفلٹ ''پسر اگر نہ تواند پدر تمام کند'' کی تعریف میں آتا ہے۔ کیونکہ کچھ دنوں پہلے خود مس صاحبہ نے جو اپنا منشور انتخاب نظم میں چھاپا تھا اس میں فقط یہ لکھا تھا کہ

میں چاہتی ہوں قومی اسمبلی پہنچ جاؤں

نغموں سے ساری سوتی ہوئی قوم کو جگاؤں

ارادہ یہ مبارک ہے لیکن مس بلبل نے ذہین اور فہیم ہوتے ہوئے بھی شاید نہیں سوچا کہ کسی کو کچی نیند جگا دیا جائے اور وہ بھی نغموں سے یعنی غزلیں وغیرہ گا کر تو وہ کتنا شور مچاتا ہے۔ فیل مچاتا ہے۔ جگانے والی کی جان کو آجاتا ہے۔ اس لیے رات کے وقت ریڈیو پاکستان والے اعلان کرتے ہیں کہ اپنا ریڈیو آہستہ بجائیے۔ جب ایک آدمی فساد برپا کر سکتا ہے تو پوری قوم کو جگانے کا نتیجہ آپ خود سوچ سکتے ہیں اور قوم بھی کون سی پاکستانی قوم؟

انٹرویو رضیہ بٹ کا

کل کے اخبار میں اُردُو کی مشہور و مقبول ناول نگار محترمہ رضیہ بٹ کا ایک بیان چھپا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ سیاستداں انتقالِ اقتدار کا مطالبہ نہ کریں۔ فرمایا تو اور بھی بہت کچھ ہے مثلاً یہ کہ قوم کو متحد رہنا چاہیئے اور ملک میں اسلامی معاشرہ قائم ہونا چاہیے اور جتنی اچھی اچھی باتیں ہیں سب ہونی چاہئیں لیکن اس وقت اس سے بحث نہیں کہ انہوں نے کیا فرمایا ہے۔ خوشی کا مقام یہ ہے کہ ان سے بیان لیا گیا ہے۔ ہم رضیہ بٹ کے سے مشہور و مقبول نہ سہی پھر بھی ادیبوں شاعروں میں قدم رکھتے ہیں۔ لہٰذا امید رکھ سکتے ہیں کل ہم سے کوئی اخباری نمائندہ یہ پوچھنے

آئے گا کہ جناب انشاء صاحب ذرا جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کا مسئلہ تو حل کر دیجئے۔

دیکھا جائے تو ملک کی سیاسی گھتیاں جس طرح ناول نگار اور فلمساز لوگ سلجھا سکتے ہیں اور کوئی نہیں سلجھا سکتا۔ آپ نے دیکھا ہو گا ناولوں اور فلموں میں کتنی کتنی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ہیرو اب مرا کہ مرا۔ ہیروئن اب رقیبِ روسیاہ کے قبضے میں آئی کہ آئی۔ ولن بھری سبھا میں آکر کھنڈت ڈال دیتا ہے کہ شادی نہیں ہو سکتی۔ لیکن بالآخر یعنی ناول کے آخری دس صفحوں میں اور فلم کے آخری دس منٹ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ظالم سماج منہ کی کھاتا ہے۔ ہیرو نکاح کے چھوہارے لٹاتا ہے۔ یہ ہم محترمہ رضیہ بٹ کے ناولوں کی بات نہیں کر رہے نہ کسی فلم کی کیونکہ ہمیں معلوم ہے ان کے ناولوں پر بھی فلمیں بنی ہیں جن سے متاثر ہو کر بعض خاتون ناول نگاروں نے اور بھی ناول لکھے ہیں جو اس وقت فلمسازوں کے زیرِ غور ہیں۔ یہ ہم ایک بات کر رہے ہیں۔ ہم ایک خاتون ناول نگار کو جانتے ہیں کہ سوئی میں دھاگہ نہیں ڈال سکتیں لیکن ہیرو کو سمندر کی تہہ سے زندہ سلامت نکال لاتی ہیں اور پہاڑ سے گرا کر رقیب کی ہڈیوں کا اس طرح سرمہ

بناتی ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کرتا رہ جاتا ہے۔ پی پی آئی کا نمائندہ جس نے یہ بیان لیا، نکلا تو سیاستدانوں ہی کی تلاش میں تھا لیکن ان میں اکثر منقار زیر پر ہیں۔ بیان دینے سے پہلے چاروں طرف دیکھ لیتے ہیں۔ کیا عجب کہ یہ تو انتقالِ اقتدار کی مخالفت کریں اور انتقالِ اقتدار ہو جائے۔ اس سے کاروبار اور ٹھیکوں وغیرہ کے سلسلے میں جو چند در چند قباحتیں پیدا ہو سکتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ اب رہ گئے اسلام سلمانی صاحب بی اے اور ہم اور رضیہ بٹ صاحب سو ہم حاضر ہیں۔ ہم سے جو چاہے قوم کی خدمت کرا لے، جو چاہے آکر سیاسی گتھیاں سلجھوا لے۔

ہماری اطلاع کے مطابق رضیہ بٹ صاحبہ کا بیان لینے کے بعد پی پی آئی کا نمائندہ محترمہ کوثر پروین صاحبہ کے پاس بھی گیا تھا۔ کوثر پروین صاحبہ کو کون نہیں جانتا۔ ملک کے مشہور اخباروں اور رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ کیل مہاسے کیسے دور کیے جائیں اور قیمہ بھرے کریلے پکانے کا طریقہ کیا ہے۔ کپڑوں پر آم امرود اور چار سیاہی کے دھبے پڑ جاتے ہیں ان کو چھڑانے کی ترکیبیں بھی یہ رفاہِ عام کے لیے اکثر چھپواتی رہتی ہیں۔ جب اس نمائندے نے ان سے پوچھا کہ کوثر پروین صاحبہ انتقالِ اقتدار پر کوئی بیان دیجئے، چچ چچ کرنے لگیں اور بولیں اناللہ و انا

الیہ راجعون۔ اقتدار صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ لکھ دیجئے کہ ان کے انتقال سے قومی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے کوثر پروین صاحبہ کہتی ہیں وہ کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ بھنڈی گوشت میں بھگار لگا کر اور ایک پلیٹ میں دو شامی کباب نکال کر نیک بیبیوں کی طرح دوپٹہ سر پر اچھی طرح اوڑھ کر اخباری نمائندے کے پاس آ بیٹھیں۔ پی پی آئی کے نمائندے نے ان کو حوصلہ دلایا کہ اقتدار صاحب کوئی بھی ہوں ان کا انتقال نہیں ہوا۔ ہو بھی تو ایسی افسوس کی بات نہیں۔ کیونکہ مرنا جینا تو خدا کے اختیار میں ہے، میرا اشارہ کسی اور طرف تھا۔

آپ نے محترمہ تمیز فاطم سلنگی کا نام بھی سنا ہو گا۔ ان کا نام کس نے نہیں سنا۔ جو لوگ ریڈیو پاکستان اور ریڈیو سیلون کا فرمائشی پروگرام سنتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ فرمائشیں وہ اور ان کی بہنیں ہی بھیجتی ہیں۔ ان کا گھر کوثر پروین صاحبہ کے گھر کے پاس ہی ہے۔ جب پی پی آئی کا نمائندہ ان کے گھر پر پہنچا سلنگی بہنیں ریڈیو پاکستان کا فرمائشی پروگرام سن کر فارغ ہوئی تھیں اور نئی فرمائشیں بھیجنے کے لیے فونٹین پین میں سیاہی بھر رہی تھیں۔ نمائندے نے اپنا تعارف کرایا کہ پی پی آئی سے آیا ہوں اور آپ کا نام سن کر آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ آپ کا بیان

چاہیے کہ یورپ میں جو کرنسی کا کرائسس ہو گیا ہے اس کا کیا حل ہے۔ تمیز فاطمہ سلنگی نے اسٹوڈنٹس انگلش اُردُو ڈکشنری نکال کر پہلے کرنسی اور کرائسس کے معنی دیکھے۔ کرنسی کا مطلب سکہ تو ٹھیک لیکن کرائسس کا مطلب بحران تھا۔ بحران کے معنی کے لیے انہیں نور اللغات دیکھنی پڑی صفحہ ۵۷۸ پر لکھا تھا بحران (بالضم، یونانی، مذکر، طب کی اصطلاح) بیماری کے زور کا دن۔ یاد رہے کہ سلنگی بہنیں سہون شریف کے ایک مشہور خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ تمیز فاطمہ کی بہن دبیر فاطمہ نے فوراً نسخوں کی خاندانی بیاض نکالی اور کہا ایک تولیہ بھگو کر مریض کے سر پر رکھا جائے اور اسے تخم ملنگاں کا شربت پلایا جائے اور کھانے کو سوائے طباشیر کے کچھ نہ دیا جائے۔

یہ نمائندہ شربتِ بزوری کا ایک گلاس پی کر اور کئی فلموں کے گانے پر گفتگو کر کے وہاں سے اٹھ آیا اور اب ہم بتا دیں کہ اس کے بعد ہمارے پاس آیا ورنہ ہم کو اوپر کی تفصیلات کیسے معلوم ہو سکتی تھیں۔ ہم سے بھی اس نے کرنسی کے کرائس کے بارے میں پوچھا اور پونڈ اور ڈالر اور مارک کی قیمتوں کی گفتگو شروع کی۔ ہم نے اسے بتایا کہ یورپ کو تو کرنسی کا کرائسس اب لاحق ہوا ہے، ہم جب بھی ولایت گئے

ہمارے لیے کرنسی کا کرائسس ہو گیا۔ چنانچہ ہمارے سفر نامہ میں جو جا بجا آلو مٹر کھانے اور سستے سستے ہوٹلوں میں جانے کا ذکر ملتا ہے، اس کی علّت یہی ہے۔ چونکہ ہمارا ارادہ مستقبل قریب میں پھر باہر جانے کا ہے، لہٰذا ہم نے اس نمائندے سے کہا کہ بھیّا پہلے ایک گڈی پونڈوں اور ڈالروں اور مارکوں کی لا کر ہمارے سامنے رکھ تب ہم فیصلہ کر لیں گے۔ بغیر دیکھے کیسے فیصلہ کر دیں۔ اس نمائندے نے ہم سے انتقالِ اقتدار والا سوال بھی کیا۔ ہم نے کہا، ہمارا بیان چھاپ دیجئے کہ اگر سارا اقتدار ہمیں منتقل کر دیا جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا بلکہ ہم رضاکارانہ طور پر اس بار کو اٹھانے کی پیشکش کرتے ہیں۔ اگر قوم کے مسائل نہ بھی حل کر سکے تو کم از کم اپنے تو حل کر ہی لیں گے۔

سپاس نامے بند مت کیجئے

ہمارے محترم جناب رسول بخش تالپور نے فرمایا ہے کہ یہ لمبے لمبے اور لچھے دار سپاس نامے پیش کرنے کی رسم اب ختم ہونی چاہیے۔ اس کی بجائے کام ہونا چاہیے۔ ہمیں میر صاحب کا یہ ارشاد پڑھ کہ بہت تعجّب ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ سپاس نامے پیش کرنے کو کام میں شمار نہیں کرتے۔ کل وہ فرمائیں گے وزیروں مشیروں کو ان کے تقرر پر جو مبارکباد کے پیغام دیے جاتے ہیں یا اخبار میں چھپوائے جاتے ہیں وہ بھی کام میں داخل نہیں۔ آفیسروں اور حاکموں کے ہاں مٹھائی لے جانا بھی کام نہیں۔ ہار اور گجرے پہنانا بھی کام نہیں۔ حکومت کے قصیدے کہنا بھی کام نہیں۔

ہم بڑے ادب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ کام نہیں تو پھر کام کسے کہتے ہیں۔ ہمیں تو یہی کام آتا ہے۔ ہمیں تو یہی کام سکھایا گیا ہے اور اس کی روشنی میں ہم نے ایک زمانے میں یہ شعر کہا تھا۔ ع

کام نے ہم کو نکمّا کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے

جس طرح سائنس علمِ دریاؤ ہے اور اس میں باون بکسورے لگتے ہیں، اسی طرح سپاس نامہ لکھنا بھی ایک فن ہے۔ پیارے یہ ہمیں سے ہو، ہر کارے دہر مردے۔ ہم نے بھی ایک مدّت اس پر ریاض کیا ہے اور گاتے گاتے کلاونت ہوتے ہیں، تب یہ ہماری گرفت میں آیا ہے۔ اس کے لیے ہم نے استاد ذوق کے قصائد سے لے کر زمانہ حال کے سیاسی اور سماجی کارکنوں کے بیانات اور اخبارات کے اداریوں اور تبریکی اشتہاروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور خود بعض ماڈل سپاس نامے تیار کئے ہیں جو با رعایت نرخوں پر ہم سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔ یہ سپاس نامے ہر موقع کی ضروریات کو کماحقہ پورا کرنے کے اہل ہیں اور ان کی تعریف میں ہمارے پاس رؤسا اور دیگر زعما کے سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔

دفتروں میں سپاس نامے پیش کرنے والے کی ذہانت اور فطانت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب سامنے والا افسر اور آنے والا افسر دونوں موجود ہوں۔ ایک طرف مصلحت دامن کھینچتی ہے اور دوسری طرف وصعداری عناں گیر ہوتی ہے لیکن شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

وہ ایک طرف تو جانے والے کو ہدیہ عقیدت پیش کرتا ہے کہ خان صاحب بڑے مہربان اور بے عدیل افسر تھے۔ ان کی لیاقت کا آدمی اس زمانے میں چراغ لے کر ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ سارا عملہ ان پر جان چھڑکتا تھا اور ان کا خلا پورا ہونا ناممکن ہے۔ ازاں بعد کھنکار کر آنے والے افسر کی طرف توجہ کرتا ہے کہ "حضور والا ہم آپ کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔امید ہے آپ کے آنے سے ہمارے دفتر میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گا اور اب تک صوبائی بنیاد پر جو بے انصافیاں اور خوشامد خوری کی وجہ سے جو دھاندلیاں ہوتی رہی ہیں آئندہ ان کا سد باب ہو جائے گا اور صرف مستحقین کو ترقی ملے گی۔ خاکسار جس کا نام سنیارٹی میں سب سے اوپر ہونے کے باوجود ترقی کے لیے اب تک نظر انداز کیا جارہا ہے، اس روزِ سعید کا خاص طور پر منتظر تھا۔" اسی سپاس نامے کا ایک دوسرا ماڈل ہے جو لوگوں

نے پہلے صدر ایوب کے آنے پر استعمال کیا تھا اور پھر ان کے جانے اور صدر یحییٰ کے آنے پر۔ آج کل صدر یحییٰ کے جانے اور ہمارے عوامی اور ہر دلعزیز حکومت کے آنے پر جو سپاس نامہ جلسوں میں استعمال ہوتا ہے وہی ہے، ہماری ہی دکان کا مال ہے۔

میر صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ اگر قصیدے اور سپاس نامے کام کی تعریف سے نکل گئے تو کتنے لوگوں کے روزگار پر زد پڑے گی۔ ہم جیسے مضمون بنانے والے، کیونکہ "جناب معلی القاب" وغیر فصیح و بلیغ الفاظ لوگ نہیں لکھ سکتے اور ہم جیسے شاعر جو تم سلامت رہو ہزار برس، ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار کی دُعا تو دے دیتے ہیں، یہ نہیں گنتے کہ کتنے سال ہو گئے۔ اتنے سال ممدوح جیا تو کہاں سے کھائے گا۔ کتابت کرنے والے خوشنویس اور پھول دار کاغذ پر چھاپنے والے مطبعے اور ان کو شیشے میں اتارنے والے فریم ساز۔ جو پیش کرتا ہے، وہ شیروانی بھی نئی سلاتا ہے، کم از کم ڈرائی کلین تو کراتا ہی ہے اور اس روز بار بر سے شیو کرا کے اور بالوں کی کھونٹیاں نکلوا کے اور چہرے پر رنگ گورا کرنے والی کریم لگوا کے آتا ہے۔ پس بالواسطہ طور درزی، نائی، دھوبی، جوتا پالش کرنے والے اور عطر پھلیل بنانے

والے سبھی زد میں آجاتے ہیں۔ میر صاحب نے اپنے بیان کے عواقب پر غور نہیں کیا۔ امید ہے کہ اب نظرِ ثانی فرمائیں گے۔ سچ یہ کہ ہمیں تو امید تھی اب اس کاروبار کو فروغ حاصل ہو گا۔ سپاس ناموں کی صنعت ترقی کرے گی۔ سپاس نامہ ڈویلپمنٹ کارپوریشن بنے گی، جس میں نوکری کے لیے ہماری درخواست پر بھی غور کیا جائے گا کیونکہ اب آپ سے کیا پردہ۔ اخباروں میں جتنے ایڈیٹوریل نکتہ چینی کے ہوتے ہیں وہ تو کوئی اور لکھتا ہے، لیکن مبارکباد کے سارے اداریے، سارے کالم، سارے قطعات، ہمارے لکھے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان پر ہمارے دوست اپنے نام ڈال لیتے ہیں لیکن پہچاننے والے رنگِ تحریر پہچان لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ حاجی فضل احمد کشمیر والا کی طرف سے جتنے اشتہار چھپتے ہیں ان میں عبارت ہماری ہوتی ہے۔ انہوں نے ہمارے ہی ایماء پر جناب ذوالفقار علی بھٹو کو سیّد ذوالفقار علی بھٹو لکھنا شروع کیا ہے۔ یہ باتیں ہم تعلیٰ کے طور پر نہیں فقط اظہارِ حقیقت کے لے لکھ رہے ہیں۔

پس جہاں میر صاحب نے اتنے سارے سپاس نامے سنے ہیں ایک سپاس نامہ ہمارا بھی ہے۔ وہ یہ کہ حضور علی القاب آپ جو نوشیر وانِ زمان اور کیواں بارگاہِ حسن

میں یوسف اور طاقت میں رستم اور داؤد و ہش میں حاتم ہیں۔ ہماری سنیے اور جو جی چاہے بند کیجئے، سپاس نامہ بند مت کیجئے۔ ہمارے روزگار پر لات مت ماریے۔ مشرقی روایات سے روگردانی مت کیجئے۔ ورنہ ہمیں کچھ اور کرنا پڑے گا۔ شاید کام ہی کرنا پڑے۔ یعنی ایسا کام جسے آپ بھی کام گردانتے ہوں اور جس کی ہمیں عادت نہیں رہی۔

ٹیکس

اخباروں میں ایک تصویر چھپی ہے جس میں ایک سنار کو اپنی دوکان کے بند دروازوں کے آگے پکوڑے تلتے دکھایا گیا ہے۔ اردگرد لوگوں کا ہجوم ہے۔ کوئی کہتا ہے پاؤ بھر تول دو، کوئی کہتا ہے اٹھنی کے باندھ دو۔ سنار بھی خوش خوش بیٹھا ہے۔ سونے پر ٹیکس لگنے سے اس کی تو چاندی ہو گئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ سنار میاں کو سونے کا کام چھوڑ کر پکوڑوں ہی کی کیوں سوجھی، اور بھی تو بہت سے کام بیچ میں پڑتے تھے۔ رنگت پکوڑوں کی بھی سونے کی ہی ہوتی ہے۔ یہ تو خیر ہوئی ایک مشابہت، اصل اشتراک دونوں میں کھٹائی کا ہے۔ پکوڑے

بھی کھٹائی میں پڑتے ہیں تو مزہ دیتے ہیں اور سونے کا یہ ہے کہ کھٹائی میں پڑنے کا اُردُو محاورہ یہیں سے نکلا ہے۔ جب کوئی سنار سے تقاضا کرتا ہے کہ میاں اتنے دن لگا دیئے میرے کڑے نہیں بنائے تو اس کے پاس گھڑا گھڑایا عذر موجود ہے، میاں جی کھٹائی میں پڑا ہے آپ کا سونا۔ ذرا میل اس کی کٹ جائے، بس ایک دن میں بنا دوں گا۔"

ستار میاں تو خیر عادت سے مجبور ہیں۔ کھٹائی میں ڈالنے کو سونا نہیں تو کچھ سہی۔ پکوڑے ہی سہی لیکن سونے کے ساتھ ایک دنیا کا کاروبار کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ اخبار میں ایک شکایت آئی ہے کہ باجے والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ آج بازار میں نکاح خواں حضرات کا پروٹسٹ دیکھا اور ایک بیان پھوپھی خدا بخش نے بھی اپنی قوم کی طرف سے نکالا ہے کہ قربان جاؤں، یہ کیسا ٹیکس لگا دیا ہے۔ آپ کے بچے جئیں۔ ہمارا تو روزگار ہی شادیوں سے بندھا ہے۔ وزیرِ خزانہ صاحب میں واری، یہ فیس معاف کر دو اور جگ جگ جیو۔

دیکھا جائے تو مسئلہ صرف دولہا دلھن یا ان کے والدین کا نہیں۔ نہ فقط صرافوں اور سناروں کے کاروبار کا ہے۔ شادیانے بجانے والوں اور نکاح خوانوں سے بھی آگے کا

ہے۔ سونے پر ٹیکس لگنے کا خیمے اور دریاں، دیگیں اور دیگچے اور پرچیں اور پیالے کرائے پر دینے والوں پر بہت اثر پڑا ہے۔ جس دن سے ٹیکس لگا ہے اور شادیوں کا مندا ہوا ہے، یہ لوگ اپنی دریوں پر چاندنیاں بچھا کر ان سے صفِ ماتم کا کام لے رہے ہیں۔ باورچیوں کو بھی اس ٹیکس کے اعلان سے مرچیں لگی ہیں تو ٹھیک لگی ہیں اور نائی تو باراتوں کی جان ہوتے ہیں۔ اسلام سلمانی صاحب بی اے کے لیے ایک اور موقع موشگافی کا اور بیان بلکہ پریس کانفرس کا تیار ہے۔ ہمارے ہاں شادیوں میں اصل اہمیت زیورات کی ہوتی ہے یا جہیز کی۔ یہ کافی ہو تو دولہا کا گنجا ہونا اور دلہن کا گنجی بھی ہونا چل جاتا ہے۔ ان کی صورتوں پر، آدمی کا بچہ ہے، کہہ کر درگزر کا پچارا پھیرا جا سکتا ہے۔ درزیوں کے بازار میں جائیے تو وہ بھی چاک گریبان بیٹھے ہیں۔

اپنے ہی کپڑے ادھیڑ کر سی رہے ہیں۔ بزازے کا بھی یہی حال ہے کہ گاہکوں کا کال ہے اور پورا بازار میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے۔ مہندی اور کھوپرے کنگھی اور موباف کا کاروبار بھی سرد ہے بلکہ پورا بازار ائر کنڈیشنڈ معلوم ہوتا ہے۔ رانجھا بنسری بجا بجا کر بے حال ہو رہا ہے۔ ہیر الگ بیٹھی رو رہی ہے۔ اشکوں سے منہ دھو رہی ہے۔ یہی حال اپنی لیلیٰ اور مجنوں کا ہے۔ آج کل خالی خولی عشق سے کام نہیں چلتا۔

شیریں بی بی بھی فرہاد میاں سے نہیں پوچھتی کہ کتنے پہاڑ کاٹے۔ یہ سوال کرتی ہے کہ زیور کتنے تولے کا لائے ہو؟ ایک شاعر کو بھی ان دنوں میں دیکھا کہ اداس جا رہا ہے۔ پوچھا اے میاں کس غم میں گرفتار ہے؟ غمِ جاناں ہے کہ غمِ روزگار ہے؟ بولا اے حضرت! کیا بود و باش پوچھو ہو ہماری۔ سہرے لکھتے تھے۔ انعام پاتے تھے۔ لن ترانیاں اس پر مستزاد کہ دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا۔ ایک اور خراب حال کو سر بہ گریباں پایا۔ اس نے اپنا نام "جماں جنج نال" بتایا کہ باراتوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ جہاں خیمہ اور چھولداری دیکھی، شیروانی ڈانٹ کر جا پہنچے اور تر نوالے کھا کر

بیڑے کھائے پان کے مزے دار

قلیان پیئے مشک بو دھواں دھار

خود ہم بھی اس ٹیکس سے متاثر ہوئے ہیں۔ ہماری آنے والی کتاب ہی کھٹائی میں پڑ گئی ہے۔ اسے زیورِ طبع سے آراستہ کرتے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایکسائز والوں کا پیادہ نہ آن پکڑے کہ لاؤ ٹیکس دو اس پر پچیس فیصدی۔

اس بحث نے صرف سنار کا سونا، لیلیٰ مجنوں کا عشق اور ہماری کتاب ہی کھٹائی میں نہیں ڈالے۔ اس کے نتائج اس سے زیادہ دور رس ہیں۔ بناسپتی گھی کے دام بھی چڑھے۔ جو لوگ ڈالڈا کھاتے تھے اب فقط ماماتا سے کام چلائیں گے۔ ماماتا میں چکنائی تو تھوڑی بہت ہوتی ہے لیکن وٹامن ڈی اتنی نہیں ہوتی۔ جوتوں پر ٹیکس لگنے سے بہت سے لوگ پریشان ہیں۔ جن لوگوں نے بی اے یا ایم اے پاس کیا ہے، وہ پوچھتے ہیں کہ ہم نوکری کی تلاش میں سڑکوں پر کیا بتاتے پھریں گے۔ سیاسی پارٹیوں کے ہاں بھی بے رونقی کا عمل ہو گا۔ اوّل تو دال مہنگی ہے۔ سونے کے بھاؤ بکتی ہے۔ خیر فراہم کر لیں تو بانٹیں گے کس میں؟ اس ڈر سے بعض سیاسی گروہ اپنی صفوں میں اتحاد رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

صدارت

”جی فرمایئے۔“

حضور میں ہوں گجراتی ادبی منڈل کا سیکرٹری تار محمد دُکھیا۔ ہم گجراتی کے مشہور ادیب حضرت غبغب گھڑیالوی کی برسی منارہے ہیں۔ آپ صدارت فرمایئے گا۔“

”دکھیا صاحب۔ ہم انکار کر کے آپ کو مزید دُکھیا تو بنانا نہیں چاہتے۔ لیکن گجراتی ہم نہیں جانتے اور غبغب صاحب کا نام بھی آج ہی سنا ہے۔“

”جی یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل بہترین صدارت وہی لوگ کرتے ہیں جو موضوع یا ممدوح کے متعلق کچھ نہ جانتے ہوں۔“

”عجیب بات ہے۔ مثالیں دے کے واضح کیجیۓ تار محمد صاحب۔“

”آپ نے سنا ہو گا پچھلے دنوں برُوہی صاحب نے اقبالؔ کی شاعری پر ایک نہایت پُر مغز تقریر کی۔ بعد ازاں فرمایا ”صاحبو میں نہ اُردُو جانتا ہوں نہ فارسی۔“

”لیکن ہر کوئی بروہی صاحب تو نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو اس پر نہایت جامع مانع اور مدّلل تقریر کرے۔““لیکن جی بیگم وقار النسانون نے تو یومِ اقبال اور نذر الاسلام کے مجموعی جلسے کی صدارت کر ڈالی اور بڑی دل پزیر تقریر کی۔“

”بھئی ہم انہیں جانتے نہیں۔ کیا پتہ وہ اُردُو فارسی اور بنگلہ وغیرہ کی فاضل ہوں۔“

”جی انہوں نے وضاحت کر دی کہ مجھے یہ زبانیں نہیں آتیں اور میں نے ان شاعروں کو پڑھا بھی نہیں لیکن اتنا معلوم ہوا ہے کہ عمل کی تلقین کیا کرتے تھے۔

پس اے حاضرینِ جلسہ تم بھی عمل کیا کرو۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مت بیٹھے رہا کرو۔
بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ اسلام و علیکم۔"

"بھئی ہماری مصروفیات ہیں۔ ہمیں معاف کرو۔"

"آپ ناحق گھبراتے ہیں، انشا صاحب۔ گھبرایئے نہیں یوں تو آپ کو معلوم ہے ایسے موقع پر کیا کہا جاتا ہے۔ کہیں آپ رکیں تو یہ بندہ لقمہ دینے کو تیار ہے۔ یا تو میں آپ کے کان میں بتا دیا کروں گا۔ آپ پانی پینے کے بہانے سُن لیں یا پرچی لکھ کر بڑھا دیا کروں گا۔"

ہم نے کہا۔ "اچھا بھئی۔ آپ مجبور کرتے ہیں تو منظور ورنہ ہمارا اب بھی یہی خیال تھا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔"

جناب تار محمد دُکھیا نے ہمارے گلے میں گوٹے کا چمکیلا ہار ڈالا جو غالباً اس سے پہلے کئی صدروں کے گلے کا ہار ہو چکا تھا۔ اور اس کے علاوہ مختلف منگنیوں اور شادیوں وغیرہ کے موقع پر بھی استعمال ہو چکا تھا۔ بعد ازاں ہمارا اور ہمارے علم و فضل کی بیکرانی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہر چند انشا صاحب گجراتی زبان نہیں جانتے اور یہ بھی حقیقت ہے

کہ غبغب صاحب کا کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں ہوا تاہم وہ غبغب مرحوم کے افکار اور شاعری پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے باوجود بے پناہ مصروفیتوں کے تشریف لا کر ہماری عزّت افزائی کی ہے۔ اب میں انشا صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ خطبہ ارشاد فرمائیں۔

ہم نے پانی مانگا۔ سیکرٹری صاحب نے ایک گلاس آگے بڑھایا۔ ہم نے کہا پورا جگ چاہیے۔ وہ بھی آگیا۔ ہم نے سیکرٹری صاحب کو ان کا فرض یاد دلایا اور پانی پی پی کر یوں رطب اللسان ہوئے۔

"صاحبو۔ حضرت غبغب گھڑیالوی کو کون ہے جو نہیں جانتا۔ پاکستان کے لئے ان کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں (سیکرٹری نے پرچی دی۔ وان کا انتقال تو سنہ ۱۹۱۴ء میں ہو گیا تھا حالانکہ وہ پاکستان بننے یا پاکستان کا نظریہ پیش ہونے سے بہت پہلے سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے کام آگئے تھے۔ (سرگوشی: ان کا انتقال ملیریا سے ہوا تھا، لڑائی میں نہیں) ہمارا مطلب ہے کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے دنوں میں ایک جان لیوا بیماری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے جان جاں آفریں کو سپرد کی۔

نشان مرد مومن با تو گویم

چومرگ آید تبسم برلب اوست

ہم جب ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں (پرچی۔ شاعر نہیں ناول نگار تھے) جس کو غالب کی طرح وہ ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ناولوں کی طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہیں (پرچی۔ انہوں نے صرف ایک ناول لکھا تھا چوہے دان) جن میں سے صرف ایک چھپا باقی کتم عدم سے ظہور میں نہ آئے یا آتے تو چوہوں نے کھا لیے۔ تو ان کی عظمت ہمارے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ ان نے کمال فن کا اندازہ کرنا ہو تو ایک نظر ان کے ناول چوہے دان پر ڈالنی کافی ہے۔۔۔ (پرچی چوہے دان نہیں چمنستان)"

واقعی پرچی پر چمنستان ہی لکھا تھا۔ ہم جانے کیوں چوہے دان پڑھ گئے تھے۔ بہرحال اب ہم نے پانی پی پی کر ان کے حالاتِ زندگی کی طرف سے گریز کیا۔

"گھڑیالہ (جس کی نسبت سے وہ گھڑیالوی کہلاتے ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ (پرچی پھر آئی۔ گھڑیالہ کوئی قصبہ نہیں غبغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے) یہ بات ایک مشہور نقّاد نے ایک مضمون میں لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر ہمیں بڑی ہنسی آئی کیونکہ گھڑیالہ نام کا کوئی قصبہ گجرات میں نہیں۔ اصل میں

غبغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے۔ یہ ادبی تاریخیں لکھنے والے ذرا بھی تحقیق نہیں کرتے۔ جو انٹ سنٹ چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں۔ اُردُو کے مشہور شاعر حضرت شیوا چوہڑ کانوی کے بارے میں بھی ڈاکٹر غمزدہ ردولوی نے لکھ دیا تھا کہ وہ چوہے پکڑا کرتے تھے۔ حالانکہ چوہڑ کانہ قصبہ ہے۔ یہاں کا اچار مشہور ہے۔ شیوا صاحب بڑے شیوا بیان شاعر تھے۔ میں آپ کو چند اشعار سناتا ہوں جو صفت مراعات النظیر میں سے ہیں۔ زباں پہ خدایا کس کا نام آیا۔ یہ نظیر اکبر آبادی بھی خوب شاعر تھے۔ (پرچی یہ یوم غبغب صاحب کا ہے نظیر اکبر آبادی کا نہیں) لیکن افسوس یہ یوم نظیر اکبر آبادی کا نہیں ورنہ ہم ان کی نظم بنجارہ نامہ کے چند بند آپ کو سناتے، بلکہ بے ڈھب انبالوی کا ہے۔ (سرگوشی: صحیح نام غبغب گھڑیالوی ہے) جن کا صحیح نام غبغب گھڑیالوی تھا۔ پس ہم اس دعا کے ساتھ اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہیں کہ خدا نئی پود کے ادیبوں کو ان کی شاعری یاناول نگاری جو کچھ بھی وہ کرتے تھے اس کی تقلید کی توفیق دے۔ تاکہ وہ بھی اسی طرح آنکھیں کھول کر مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ کریں جس طرح غبغب صاحب کرتے تھے۔ اقبال صاحب بھی کہہ گئے۔

کھول آنکھ فلک دیکھ زمین دیکھ فضا دیکھ

سیکرٹری صاحب نے پوچھ دی (غبغب صاحب تو نابینا تھے) لیکن یہ بعد از وقت آئی تھی اس لئے اسے ہم نے ایک طرف ڈال دیا اور پانی کا ایک گلاس پی کر تالیوں کی گونج میں بیٹھ گئے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ آج کل اقبال کا صحیح مقام بھی انگریزی زبان ہی میں متعیّن کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کسی نہ کسی غیر ملکی کو بلایا جاتا ہے۔ اب کے ایک یوم اقبال تو ایرانی کلچرل سینٹر میں منایا گیا۔ ایک ہم نے اپنے علم دوست احباب کے ساتھ مل کر اپنے کلب میں منایا۔ ہمیں صدارت کے لیے کسی غیر ملکی کی تلاش تھی۔ خوش قسمتی سے کسی نے ہمیں ہالینڈ کے ایک نکتہ داں مسٹر ہیگ روٹرڈم سے ملا دیا اور وہ صدارت پر راضی بھی ہو گئے۔ ہم نے کہا۔ "آپ کو کچھ اقبالؔ کے متعلق بتا دیں۔" بولے۔ "واہ اس مایہ ناز ہستی کو کون نہیں جانتا۔ اس نے فلسفۂ خودی ایجاد کیا تھا نہ۔ بس یہ بتا دیجئے کہ رہنے والے کہاں کے تھے۔" ہم نے کہا "سیالکوٹ کے، جہاں کھیلوں کا سامان بنتا ہے۔" فرمایا "مر گئے یا ابھی مرنا ہے۔" ہم نے کہا "آپ کی اور ہماری خوش قسمتی سے مر گئے ہیں۔"

بولے ”کیوں مر گئے؟“

ہم نے کہا۔ ”ہم خود بھی حیران ہیں کہ ملّت کو ابتلا میں چھوڑ کر کیوں مرے۔“

فرمایا۔ ”میرا مطلب ہے۔ کیسے مرے؟“

”بس حکیموں ڈاکٹروں کی دوائیں کھا کر مرے۔ لیکن آپ کو اس سے کیا مطلب؟ آپ ان کی شاعری اور شخصیت پر بولیے۔“

”اچھا۔ نام ذرا پھر سے بتا دیجئے۔ ایکو بلال تھا شاید۔“

ہم نے کہا۔ ”ایکو بلال نہیں بابا۔ اقبال۔ ٹھیک سے یاد کر لو۔“

مسٹر ہیگ روٹرڈم نے اپنی پُر مغز تقریر کا آغاز ہی سیالکوٹ سے کیا۔ اس کی وجہ شہرت بیان کی اور فرمایا۔ ”اقبال بھی کھیل ہی کھیل میں بہت سی کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ آج کل تو فلسفہ خودی کی بہتات ہے۔ بلکہ اسے دساور بیچ کر زرِ مبادلہ بھی کمایا جا سکتا ہے لیکن ایجاد یہ اس شاعر نامی گرامی کی تھی۔ یہ فارسی اور اُردُو میں لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ اے کاش ڈچ زبان کی شیرینی پر ان کی نظر گئی ہوتی۔ وہ اس میں لکھتے اور ہم ان کا مطالعہ کر سکتے۔ اب ہم سب کو چاہیے کہ ان کے نقشِ قدم

پر چلیں اور ان کا اجالا زمانے میں پھیلائیں۔ جس طرح فلپس کمپنی کے بلب پھیلاتے ہیں جس کی پاکستان میں نمائندگی کا شرف اس ناچیز کو حاصل ہے۔ یہ کمپنی صرف بلب ہی نہیں، ریڈیو، ٹرانزسٹر، ٹیلیوژن، ٹیوب لائٹ ہر طرح کا مال عمدہ بناتی ہے اور بکفایت فراہم کرتی ہے۔ (ہم نے انہیں ٹہوکا دیا کہ موضوع پر آئیں) اور ہاں ایکو بلال (ہم نے ایک اور ٹہوکا دیا) یعنی اقبال صاحب بہت بڑے اور مایہ ناز شاعر تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیوں مر گئے اور قوم کی نیّا بھنور میں چھوڑ گئے (تالیاں)۔ سُنا ہے ڈاکٹروں اور حکیموں کی دوائیں کھا کھا مر گئے۔ ابھی طبّی سائنس کو اور ترقی کرنی ہے۔ فلپس کمپنی نے اس پر بھی ریسرچ کا شعبہ کھولا ہے۔ ہماری تحقیقات کامیاب ہو گئیں تو آیندہ اچھے اچھے شاعر مرا نہیں کریں گے بلکہ صدیوں ایڑیاں رگڑا کریں گے۔ ان کی جان نہیں نکلا کرے گی (تالیاں)۔ میں شکریہ ادا کرتا ہوں (ہمارا نام بھول کر) اپنے ان محترم دوست کا جنھوں نے مجھ ہیچمدان کو اس عزّت سے نوازا اور کرسیٔ صدارت پر بٹھایا۔ بے شک اقبال سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور میں اور بھی تقریر کرتا لیکن افسوس ہال میں روشنی بہت کم ہے۔ اگر آپ لوگ فلپس کی ٹیوب لائٹیں استعمال کرتے۔۔۔۔۔۔۔۔

ان کی تقریر کا آخری حصّہ تالیوں کے شور میں ڈوب گیا۔ ٹھیک سے سُنا نہ جا سکا۔

عدالت کی بے بی نے چھٹی کر دی ہے

برطانیہ میں مسز مونیکا نام کی ایک صاحبہ حال ہی میں مجسٹریٹ مقرر ہوئی ہیں۔ آل اولاد والی ہیں ماشا اللہ چار بچے ہیں۔ اور خبر کے ساتھ جو تصویر چھپی ہے، اس میں وہ ایک طفلک کو جو تادمِ تحریر ان کا سب سے چھوٹا بچہ ہے، اپنی گود میں لیے بوتل سے دودھ پلاتی دکھائی گئی ہیں۔

یہاں تک تو اس خبر میں کوئی خاص بات نہیں لیکن مسز مونیکا کے متعلق آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ وہ مقدمات سننے کے دوران اپنے گود کے بچے کے پوتڑے اور

دوسرے کپڑے بھی دھویا کریں گی۔اس کے علاوہ ان کا فرمانا ہے کہ میں اپنے دوسرے بچوں کے لیے کھانا بھی عدالت ہی میں پکایا کروں گی۔

خاتون مجسٹریٹیں ہمارے ہاں بھی ہیں لیکن ہمارے ہاں یہ آزادی کہاں؟ کھانا پکانا اور پوتڑے دھونا تو ایک طرف ہماری عدالتوں میں سروتے سے چھالیا کاٹنے اور سل پر مسالہ پیسنے تک کی اجازت نہیں حتیٰ کہ بچوں کو بھی گھر پر چھوڑ کر آنا پڑتا ہے۔

بہرحال اب جو برطانیہ میں اتنی مراعات ملی ہیں تو ہم جو ہر معاملے میں مہذّب ملکوں کی تقلید کرتے ہیں، امید کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی عدالتوں کے قواعد وضوابط کو نرم کر دیا جائے گا۔ تاکہ خاتون مجسٹریٹیں دلجمعی سے مقدمہ بھی سنتی رہیں اور گھر کے دھندے بھی بھگتاتی رہیں۔ پھر یہ نہیں ہو گا کہ بظاہر مقدمہ سُن رہی ہیں۔ لیکن دھیان گھر میں لگا کہ کب مقدمہ ختم ہو، کب جا کر آٹا گوندھیں اور بچّوں کے کپڑے دھوئیں۔ یہ وقت ابھی کچھ دور نظر آتا ہے لیکن چشمِ تصور سے بھی دیکھا جا سکتا ہے بلکہ ہم دکھاتے ہیں آپ دیکھئے:

ایک طرف فائلوں کا ڈھیر ہے اور دوسری طرف ایک چولہا جس پر دیگچی چڑھی ہے یہ آلو گوشت کی اشتہا افزا خوشبو وہیں سے آرہی ہے۔

ایک نظر ادھر ملزم پر بھی ڈال لیے۔ بیٹھازار و قطار رو رہا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اپنے کئے پر پشیمان ہے بلکہ مجسٹریٹ صاحبہ نے حکم دیا ہے کہ جب تک خالی بیٹھے ہو کچھ پیاز ہی کتر دو۔ تو حضرات با ادب با ملاحظہ ہوشیار، یہ بی بی نیک پروین مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت ہے۔ ایوانِ عدالت میں یہاں سے وہاں تک رسیاں تنی ہیں جن پر بچّے بچیوں کے کرتے، نیکریں، بب اور پوتڑے سوکھ رہے ہیں۔ کوئی کپڑا ٹھیک سے نہیں نچوڑا جا سکا تو اس سے پانی کے قطرے بھی ٹپک رہے ہیں۔ لہٰذا مدعی اور مدعا علیہ دونوں فریقوں کے آدمی سمٹ سمٹائے بیٹھے ہیں۔ خصوصاً وہ جو نمازی ہیں۔ اگر چپراسی ابھی ابھی فنائل کا چھڑکاؤ کر کے گیا ہے اور ایک طرف اگربتیاں بھی سلگ رہی ہیں، پھر بھی گواہوں کے کٹہرے کے پاس کچھ لوگ ناکوں پر رومال رکھے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ پوتڑے آخر پوتڑے ہیں۔ خواہ مجسٹریٹ کے بچوں ہی کے کیوں نہ ہوں۔ کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتا، توہینِ عدالت نہ ہو جائے۔

اب ڈائس کی طرف نظر کیجئے۔ ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ یہی تو بی بی نیک پروین ہیں۔ ادھر داہنے ہاتھ جو صاحب بیٹھے حقّہ پی رہے ہیں اور قوام والا پان کلے میں دبائے ہیں وہ بچے کے باپ نہیں ہیں بلکہ پیش کار صاحب ہیں۔ ان کی میز پر

دیکھے بائیں ہاتھ پر ایک اسٹول پر ایلومینیم کا ایک تسلّہ اور پانی کی بالٹی نظر آرہی ہے۔ تسلے میں بچّوں کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔ ابھی استغاثے کا بیان ختم ہو گا تو انہیں دھوئیں گی اور مقدمے کے فریقین رسیوں پر پھیلاتے جائیں گے تاکہ کاروائی جلد از جلد دوبارہ شروع کی جاسکے۔ مجسٹریٹ صاحبہ کی اپنی میز پر عدالت کی گھنٹی اور موگری کے علاوہ ایک نامکمل سویٹر، اون کے گولے اور سلائیاں بھی نظر آرہی ہیں۔ جب بچہ سو جائے گا تو اسے سرکاری وکیل کی گود میں دے کر انہیں اٹھالیں گی۔ چونکہ ہوشیار اور فرض شناس ہیں اس لیے سویٹر بُننے کے ساتھ ساتھ مقدمہ بھی سنتی جائیں گی اور منصفی کرتی جائیں گی۔

اب تو شاید یہ جنس ناپید ہے لیکن انگریزوں کے عہد معدلت میں آنریری مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے جن کو کم پڑھے لکھے لوگ اناڑی مجسٹریٹ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ قانون وغیرہ کی رسمی تعلیم کے جھنجھٹوں میں یہ کم پڑتے تھے۔ بس عقل کے زور سے فیصلے کرتے اور شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلواتے تھے۔ انبالے میں میر حامد علی نام کے ایک بزرگ سے ہماری بھی یاد اللہ تھی جو اس عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک روز ان کے سامنے ایک مقدمہ آیا جس

میں ایک شخص نے دوسرے کو سر بازار زد و کوب کیا تھا اور ضربات شدید پہنچائی تھیں۔ ملزم سے پوچھا گیا تو اس نے اقبالِ جرم سے انکار کر دیا۔ میر صاحب کو بہت طیش آیا۔ بولے نابکار ایک تو مارتا ہے پھر جھوٹ بولتا ہے جس وقت ارتکابِ جرم ہو رہا تھا عدالت خود وہاں کھڑی سبزی خرید رہی تھی۔

سو بی بی نیک پروین کی عدالت میں بھی یہ ہو گا کہ وہ پیش کار سے فرمائیں گی منشی جی ذرا مارکیٹ والے مقدمے کے فائل اور بچّے کی چوسنی دینا اور دیکھنا ذرا دیگچی میں کرچھی پھیرتے جانا۔ میں ذرا فریقین سے حلف لے لوں تو پھر بگھار لگاؤں گی۔ بحث زور و شور سے جاری ہو گی کہ یکایک صدر عدالت سے اعلان ہو گا۔ ”صاحبان کاروائی پانچ منٹ کے لیے ملتوی۔ عدالت کی بے بی نے چھی کر دی ہے۔ عدالت اس کے اور اپنے کپڑے بدل کر ابھی آتی ہے۔“ پھر جب وکیل استغاثہ طویل بحث کے بعد ملزم کے جرم کو پایہ ثبوت کو پہنچا کر عدالت سے درخواست کرے گا کہ اب مجرم کے لیے عبرتناک سزا تجویز کی جائے تو مجسٹریٹ صاحبہ یہ کہتی سنائی دیں گی ”اسے آگ پر چڑھا دو اور دھیمی آنچ پر بھونو“ ملزم کانپنے لگتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے ”حضور اتنی سخت سزا نہ دیجیے۔ میں بھی بال بچے والا ہوں۔“ اس پر عدالت

ماں ڈانٹتی ہیں ''چُپ رہو جی تم سے نہیں کہہ رہی ہوں۔ پیش کار سے کہہ رہی ہوں۔ہاں منشی جی اب قیمے کی ہنڈیا آگ پر چڑھا دیجئے نا۔ اچھا تو وکیل صاحب آپ کیا فرما رہے تھے۔ میرا دھیان ادھر تھا۔ ذرا یہ گرائپ واٹر کی بوتل تھما دیجئے۔ اور اپنے دلائل ذرا دہرا دیجئے پلیز۔"

عدالت ختم ہوئی تو بی بی نیک پروین نے برقعہ سنبھالا اور چل دیں۔ بچّے کو سرکاری وکیل نے کاندھے پر بٹھایا اور دیگچیاں پیش کار صاحب نے ایک ٹوکرے میں سنبھالیں۔ انصاف کے تقاضے بھی پورے ہو گئے اور گھر کا کام بھی ہو گیا۔ ہمارے نامہ نگار نے لپک کر پوچھا کہ بی بی جی آپ کیا سارے کام عدالت میں کر لیتی ہیں؟ بولی جی نہیں یہاں پر تو صرف پکانا ریندھنا ہو سکتا ہے یا کپڑے دھوئے جا سکتے ہیں۔ جھاڑو دینے کا کام گھر جا کر کرتی ہوں۔ وہ عدالت میں نہیں کر سکتی۔ نہ رضائیوں میں ڈورے ڈالنے کے لیے یہاں کافی جگہ ہے۔

ہم نے افسانہ نگاری کیوں ترک کی

آلڈس ہکسلے سے کسی نے پوچھا کہ ادیب بننے کے لیے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔ اس نے بے تامل جواب دیا کہ ایک قلم، ایک دوات اور کچھ کاغذ۔ ایک رسالے میں اُردُو کی مشہور افسانہ نگار جمیلہ ہاشمی کا انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے وضاحت کر دی ہے کہ کچھ کاغذ سے کیا مراد ہے۔ فرماتی ہیں کہ جب میرا افسانہ لکھنے کو جی چاہا تو میں نے اپنے والد کے حساب کتاب کے رجسٹر کی جلد توڑی اور اس میں لکھنا شروع کر دیا۔ قیاس ہوتا ہے کہ اگر ان کے والد محترم حساب کتاب نہ رکھا کرتے جیسا کہ بعض لوگ نہیں رکھتے اور جمیلہ کے ہاتھ نہ پڑتا تو وہ افسانہ نگار نہ بن

سکتیں۔ جو حضرات اپنی بہنوں بیٹیوں کو افسانہ نگار بنانا چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ فوراً ہی کھاتے خریدیں اور جو اپنی نورِ نظر کو اس سے محفوظ رکھنا چاہیں انہیں لازم ہے کہ اپنے رجسٹروں کو دکان پر تالے کے اندر رکھا کریں۔

لیکن ہمارا تجربہ اس کے برعکس ہے۔

کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ہم نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانہ نگار کے طور پر کی تھی اور اس کے لئے نہایت عمدہ چکنے کاغذوں کی ایک کاپی مجلّد تیار کرائی تھی۔ ایک روز ہم کاپی کو افسانے کے ایک نازک موڑ پر بستر پر کھلی چھوڑ گئے۔ واپس آکر کھولا تو صورتِ احوال یوں نظر آئی۔ ”امجد نے کہا۔ میری رانی بولو تمہیں کیا چاہیے۔ کہو تو آسمان کے تارے توڑ کر تمہارے قدموں میں لا بچھاؤں۔ تمہارا دامن بہار کے رنگین پھولوں اور کلیوں سے بھر دوں۔ بولو بولو کیا چاہتی ہو۔ رانی نے کہا۔ امجد۔ مجھے دنیا میں اور کچھ مطلوب نہیں۔ فقط

بنولے ڈیڑھ من

بھوسہ دس بوری

نمک ایک ڈلا

گڑ ڈھائی من

چارپائی کا بان پانچ گٹھے

گھی سات سیر"

ہم نے جھنجھلا کے وہ صفحہ پھاڑ کے پھینک دیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے چچا عینک کو ناک کی پھننگ پر جمائے کچھ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ بولے بیٹا یہاں ایک کاپی میں کچھ حساب لکھا تھا میں نے۔ منڈی جا رہا ہوں سودا لانے۔ کہاں گئی وہ کم بخت کاپی۔

ہمارے نقطۂ نظر سے یہ افسانہ ہمارے بہترین افسانوں میں سے تھا۔ اس کا کلائمکس یعنی نقطۂ عروج اس کے آخر میں آتا تھا۔ یہ وضاحت ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ بعض افسانوں کا کلائمکس بالکل شروع میں آ جاتا ہے۔ آخری پیرا لکھتے لکھتے ہمیں ایک ضرورت سے تھوڑی دیر کو باہر جانا ہوا۔ واپس آئے تو افسانہ مکمل تھا۔

”امجد نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ میری غلام فاطمہ۔ اب میں گاؤں واپس آ گیا ہوں اور زندگی تمہارے قدموں میں گزاروں گا۔ رانی نے مجھ سے دغا کی۔ اب مجھے سچی محبت کی قدر ہوئی۔ صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا نہ جانو۔ مجھے معاف کر دو۔ غلام فاطمہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ امجد۔ اب میری زندگی میں رہ کیا گیا ہے۔ چند آنسو، چند آہیں اور۔۔۔۔

قمیصیں بڑی پانچ عدد

پاجامے چھوٹے چار عدد

تکیے کے غلاف دس

تولیے دو

جھاڑن دو

کھیس چار خانہ دو عدد

کُل ۲۵ عدد“

ہم نے شور مچایا۔ یہ کیا غضب کر دیا۔

بہن بولیں۔ ارے میاں کچھ نہیں۔ دھوبی کا حساب لکھا ہے۔ اس سے پہلے مرقع چغتائی کے حاشیے پر لکھا کرتی تھی، وہاں اب جگہ نہیں رہی۔ یہ کاپی خالی نظر آئی اس میں لکھ دیا۔ ہم نے کہا۔ بہن اب یہ کاپی تم ہی رکھو۔ ہمارے کام کی نہیں رہی۔ چنانچہ اس روز ہم نے افسانہ نگاری کو خیر باد کہا اور شعر کہنے لگے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شعر لکھنے کے لیے کسی کاپی یا رجسٹر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں دروازے کی چوکھٹ پر لکھا جا سکتا ہے۔ قمیص کے کفوں پر لکھا جا سکتا ہے۔ سکتا کیا معنی ہم لکھتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کے انٹرویو میں ایک اور جگہ ہی ٹھٹکنا پڑا۔ انہوں نے فرمایا "میں تو چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ ناول لکھوں لیکن یہ نوکر بہت تنگ کرتے ہیں۔" ہم نے اس کا مطلب یہ لیا کہ نوکر لکھنے سے منع کرتے ہیں کہ بی بی آپ ہانڈی روٹی کیجیے۔ یہ کیا لکھنے لکھانے کے پیچھے پڑ گئیں۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں جمیلہ بیگم سے ہمدردی ہے۔ زیادہ تر نوکر آج کل ایسے ہی گستاخ اور منہ پھٹ ملتے ہیں۔ ہمارا ایک نوکر بھی ہمیں مشورہ دیا کرتا تھا کہ شاعری واعری چھوڑیئے۔ بزازی کی دوکان کھول لیجئے۔ اس

میں بڑا فائدہ ہے۔ لیکن پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ ایک زمانے میں ہمیں خوش قسمتی سے ایک ایسا نوکر بھی مل گیا تھا جو ناول نویسی میں خاصی مدد دیا کرتا تھا۔ ہم کوئی باب ادھورا چھوڑ کر کہیں باہر چلے جائیں تو واپسی پر مکمل ہوتا تھا بلکہ کتنی بار تو وہ موجودگی میں بھی پیشکش کر دیا کرتا تھا کہ صاحب آپ لکھتے لکھتے تھک گئے ہوں گے۔ اگر آپ میری جگہ تھوڑی دیر فرش پر پوچی مار دیں تو میں ایک آدھ باب لکھ دوں۔

آپ پوچھیں گی وہ نوکر کہاں گیا؟ اس نے ہماری نوکری چھوڑ دی اور آسمانِ ادب پر آفتابِ عالم تاب بن کر چمکا۔ آج کون ہے جس نے تسنیم رومانی کا نام نہیں سنا۔ وہی تسنیم رومانی جو "لانبی زلفیں" اور "ڈوبتے دریا" نامی لافانی ناولوں کا مصنف ہے۔ ابھی پچھلے دونوں بازار میں اس سے مڈ بھیڑ ہو گئی تھی۔ ہم نے کہا جمّن میاں (اس کا پیدائشی نام یہی ہے۔ پولیس کے روز نامچے میں بھی یونہی لکھا جاتا ہے) میرا نوکر بھاگ گیا ہے۔ تم چاہو تو پھر آ جاؤ۔" وہ بولا "صاحب۔ آج کل تو 'جلتی پر چھائیاں' نامی فلم بنا رہا ہوں۔ بہت اچھی جا رہی ہے۔ آپ چاہیں تو اگلی فلم کے گانے کے لیے

آپ کو نوکر رکھ سکتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ کا ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ پیسے اس
سے زیادہ دوں گا جتنے آپ مجھے دیتے تھے۔

کسٹم کا مشاعرہ

کراچی میں کسٹم والوں کا مشاعرہ ہوا تو شاعر لوگ آؤ بھگت کے عادی، دندناتے، پان کھاتے، مونچھوں پر تاؤ دیتے، زلفِ جاناں کی بلائیں لیتے غزلوں کے بقچے بغل میں مار کر پہنچ گئے۔ ان میں سے اکثر کلاتھ ملوں کے مشاعروں کے عادی تھے جہاں آپ تھان بھر کی غزل بھی پڑھ دیں اور اس کے گز گز پر مکرر مکرر کی مہر لگادیں تب بھی کوئی نہیں روکتا۔ پھر تانا بانا کمزور بھی ہو تو ذرا سا ترنّم کا کلف لگانے سے عیب چھپ جاتا ہے۔ لیکن کسٹم والوں کے قاعدے قانون بڑے کڑے ہوتے ہیں۔ منتظمین نے طے کر دیا تھا کہ ہر شاعر زیادہ سے زیادہ ایک غزل وہ بھی اسی بحر کی

نہیں درمیانہ بحر کی بلا کسٹم محصول پڑھ سکے گا جس کا حجم پانچ سات شعر سے زیادہ نہ ہو۔ پیچ یہ آن پڑا کہ مصرع ایک نہیں پانچ دیے گئے تھے۔ وہاں دروازے پر تلاشی ہو گئی۔ سب کے تھیلے اور بستے باہر رکھوائے گئے۔ ایک صاحب نے نیفے میں ایک لمبی سی مثنوی اُڑس رکھی تھی۔ ایک اپنے موزوں میں رباعیاں چھپا کر لے جا رہے تھے۔ لیکن کسٹم کے پریوینٹو افسروں کی تیز نظروں سے کہاں بچ سکتے تھے۔ ان فرض شناسوں نے سب کو آنکا اور سب کے گریبانوں میں جھانکا۔ استاد ہمدم ڈبائیوی پر بھی انہیں شک ہوا۔ استاد نے ہر چند کہا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے یہی پانچ سات شعر ہیں لیکن کسٹم والوں نے ان کے کرتے کی لانبی آستیں میں سے ان کے تازہ ترین دیوان مارِ آستین کا ایک نسخہ برآمد کر ہی لیا۔ اتنی احتیاطوں کے باوجود سنا ہے بہت سے لوگ اپنا کلام ناجائز طور پر حافظے میں رکھ کر اندر گھس گئے اور موقع پا کر بلیک میں داد کھری کی۔ یعنی بلا سامعین کی فرمائش کے اسے دوبارہ سہ بارہ پڑھا۔

ہمارے کرم فرما ملک الشعر اگھڑیال فیروز آبادی نے ہمیں فون کیا۔ "تم بھی آٹھوں گانٹھ شاعر ہو۔ موقع اچھا ہے۔ ایک غزل کہہ لو۔" گھڑیال صاحب نغمہ گو شاعر اور گھڑیوں کے تاجر ہیں۔ فیروز آبادی اس نسبت سے کہلاتے ہیں کہ فیروز آباد تھانے

کی حوالات میں کچھ روز رہ چکے ہیں۔ ہم نے عذر کیا کہ ہمارے پاس شعر کہنے کے لئے کسٹم والوں کا پرمٹ یا مشاعرے کا دعوت نامہ نہیں لہٰذا مجبوری ہے۔ بولے۔ "اس کی فکر نہ کرو۔ میں تمہیں کسی طور اسمگل کر دوں گا۔" ہم نے کہا "ہم کوئی گھڑی تھوڑا ہی ہیں۔" منغّض ہو کر بولے۔ "یہ کیا ٹک ٹِک لگا رکھی ہے۔ غزل لکھو۔"

ہم نے اپنے کو شاعری کی چابی سے کوستے ہوئے پوچھا "مصرعِ طرح کیا ہے؟"

فرمایا۔ "ایک نہیں پانچ ہیں۔ ایک تو یہی ہے۔

ع کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔"

ہم نے کہا "اس کا قافیہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ ہونے تک، کونے تک، بونے تک۔ کیا زرعی مضامین باندھنے ہیں اس میں؟"

گھڑیاں صاحب نے وضاحت کی کہ "نہیں اس کے قوافی ہیں۔ سَر، خَر، شر وغیرہ۔ ہمیں اس مصرعے سے کچھ شر کی بو آئی۔ لہٰذا ہم نے کہا کوئی دوسرا مصرع بتایئے۔ یہ نظیر اکبر آبادی کا تھا۔

ع طور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم

یہ بھی ہمیں نہ جچا۔ ہم نے کہا۔ "اگر اس کے قافیے ہیں، سُن کے، دُھن کے، بُن کے، وغیرہ تو اس سے ہمیں معاف رکھئے۔

اس پر گھڑیاں صاحب نے ہمیں تیسرا مصرع دیا۔

ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

"یہ کس کا مصرع ہے؟" ہم نے دریافت کیا۔

جواب ملا: "مہمل دہلوی کا۔"

"مہمل دیلوی؟ یہ کون صاحب تھے؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔ پتہ چلا کہ سننے میں ہم سے غلطی ہوئی۔ گھڑیاں صاحب نے مومن دہلوی کہا تھا۔ چوتھا اور پانچواں مصرع طرح بھی ہماری طبع رواں کو پسند نہ آئے۔ پھر ہماری صلح کُل طبیعت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ایک مصرع لیں اور باقیوں کو چھوڑ دیں۔ بڑی ترکیب سے ایک غزل تیار کی جو بیک وقت ان پانچوں بحروں اور پانچوں زمینوں میں تھی۔ یوں کہ ایک مصرع ایک بحر میں دوسرا دوسری میں۔ ہمارا خیال تھا اس سے سبھی خوش ہوں گے

لیکن کوئی بھی نہ ہوا۔ جانے مس بُلبل کیسے نبھا لیتی ہیں اور اس شاعر کا کیا تجربہ ہے جس نے اقبال کے کلام میں قلم لگا کر یہ شاہکار تخلیق کیا ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں

جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اہاجی، زنجیریں۔ زنجیریں۔ زنجیریں۔

لئے آنکھوں میں سرور۔ کیسے بیٹھے ہیں حضور

جیسے جانتے نہیں۔ پہچانتے نہیں

بعض محکمے شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ بعض کم۔ ایکسائز یعنی آبکاری کی فضا شاعری کے لیے زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتی۔ ہمارے دوست میاں مولا بخش ساقی نکروری پہلے اسی محکمے میں تھے۔ ایک روز کہیں ان کا ساقی نامہ کسی رسالے میں چھپا ہوا ان کے ڈائریکٹر صاحب نے دیکھ لیا۔ فوراً بلایا اور جواب طلب کیا کہ آپ سارے محکمے کے کام پر پانی پھیر رہے ہیں۔ حکومت اتنا روپیہ ناجائز شراب کی روک تھام پر خرچ کرتی ہے اور آپ کھلم کھلا لکھتے ہیں۔

خدارا ساقیا مجھے

شرابِ خانہ ساز دے

یا نوکری چھوڑیے یا شاعری چھوڑیے۔ شاعری تو ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ نوکری چھوڑ کر جوتوں کی دوکان کرلی۔

کسٹم والوں کے مصرہائے طرح بُرے نہیں لیکن ہماری سفارش ہے کہ آئندہ کوئی محکمہ مشاعرہ کرائے تو مصرع طرح کے اپنے کام کی مناسبت سے رکھے۔ مثلاً کسٹم کے مشاعرے کے لیے یہ مصرع زیادہ موزوں رہے گا۔

ع داورِ محشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ

ع حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

ع جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا۔ وغیرہ

اگلے ہفتے گوردھن داس کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے والوں کی طرف سے جو مشاعرہ ہو رہا ہے اس کے لئے ہم یہ مصرعے تجویز کریں گے۔

ع ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ

ع یا اپنا گریبان چاک یا دامنِ یزداں چاک

ع اندر کفن کے سر ہے تو باہر کفن کے پاؤں

دھوبی، ڈرائی کلینز، ٹیلر ماسٹر حضرات مشاعرہ کرائیں تو ان کے حسبِ مطلب بھی اساتذہ بہت کچھ کہہ گئے ہیں منجملہ

ع دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے ع دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ع تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ع دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

موٹر ڈرائیور حضرات تو اپنے بس یا ٹرک کی باڈی پر لکھا ہوا کوئی مصرع بھی چُین سکتے ہیں جیسے

ع سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔

ع نے ہاتھ باگ پر ہے، نے پا ہے رکاب میں

سب سے زیادہ آسانی گورکنوں کے لیے ہے کیونکہ اُردو شاعری کا ایک بہت بڑا حصّہ کفن، دفن، گورکنی اور مردہ شوئی کے متعلق ہے۔ ہماری شاعری میں مُردے بولتے ہیں اور کفن پھاڑ کر بولتے ہیں۔ بعضے تو منکر نکیت تک سے کٹ حجتی کرتے ہیں۔

چھیڑو نہ میٹھی نیند میں اے منکر و نکیر

سونے دو بھائی میں تھکا ماندہ ہوں راہ کا

اسی طرح ہمارے شاعروں نے بہت کچھ حکیموں، ڈاکٹروں اور عطائیوں کے بارے میں کہہ رکھا ہے۔ کل کلاں میڈیکل ایسوسی ایشن یا طبّی کانفرنس والے یا جڑی بوٹی سنیاسی ٹوٹکا ایسوسی ایشن کے سیکرٹری سائیں اکبر بخش کشتہ مشاعرہ کرائیں تو حسبِ ذیل تیر بہدف مصرعے کام میں لا سکتے ہیں۔

ع یاالٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل

ع آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ع پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال

اور

ع مریضِ عشق پر رحمت خدا کی۔

وغیرہ فیملی پلاننگ کے محکمے نے پچھلے دنوں ڈھیروں نظمیں لکھوائی ہیں جن میں بعض میں ایسی تاثیر سنی ہے کہ کسی جوڑے کو پانی میں گھول کر پلا دیں تو نہ صرف ان کو بقیہ عمر کے لیے چھٹی ہو جائے بلکہ ان کی اگلی پچھلی سات نسلیں بھی لاولد ہو جائیں۔ ہمارے محکمۂ زراعت، محکمۂ جنگلات، آبپاشی اور میلہ مویشیاں والے بھی ان کی دیکھا دیکھی شاعری کے فروغ میں پیش از پیش سرگرم نظر آتے ہیں۔ ابھی کل ہی محکمۂ زراعت اور آبپاشی نے ہمیں ذیل کے مصرعے بھیجے ہیں۔

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بڑی زرخیز ہے ساقی

ع کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہہ رہی ہے گنگا

ع تو برائے فصل کردن آمدی

جنگلات والوں کی پسند ملاحظہ ہو۔

ع پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

ع کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں

ع مجنوں جو مر گیا ہے تو صحرا اداس ہے

ع ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

ایک مشاعرہ ہم ملتان کے چڑیا گھر میں پڑھ چکے ہیں جس کی طرحیں حسبِ ذیل تھیں:

ع لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

ع کیا ہی کنڈلی مار کر بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا

ع رگِ گُل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

محکمے ہو گئے۔ اب اہلِ حرفہ کی بھی تو ضرورتیں ہیں۔ کریانہ فروشوں کی عید ملن پارٹی ہونے والی ہے۔ اس کے لیے بھی مصرح طرح تجویز کر دیں: ؏ وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

بار بر ایسوسی ایشن کے سالانہ مشاعرے کے لیے:

؏ اب جو خط آنے لگا، شائد کے خط آنے لگا

؏ کون جیتنا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

؏ زخم کے بڑھتے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے گیا؟

ہاکرز فیڈریشن والوں نے بھی ہم سے مصرع مانگا تھا۔ ایک نہیں دو حاضر ہیں۔

؏ میں دل بیچتا ہوں، میں جہاں بیچتا ہوں۔

اور

؏ بیٹھے ہیں رہگذر پر ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

ایک مصرع جوتے والوں کی نذر ہے:

ع پاپوش میں لگادی کرن آفتاب کی

وکیل اس مصرع سے کام چلاسکتے ہیں

ع مدعی لاکھ برا چاہے پر کیا ہوتا ہے

اور قصاب حضرات کے لیے ہم نے:

ع کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجا نکال کے

ایک زمانے میں ہماری شاعری نے بادشاہوں اور نوابوں کی سرپرستی میں ترقی کی۔ ایک مشہور شاعر فرخی کو تو بادشاہِ وقت نے خوش ہو کر مویشیوں کا ایک گلہ انعام میں دے دیا تھا۔ اس نے غالباً غزل گوئی چھوڑ چھاڑ دودھ بیچنے کا پیشہ اختیار کر لیا کیونکہ پھر اس کے خاندان میں کوئی شاعر ہم نے نہ سُنا۔ ہمارے زمانے میں وار فنڈ والے، محکمہ زراعت والے، میلہ مویشیاں والے اس فن کے فروغ کا ذریعہ ہیں۔ پھر کلاتھ ملوں والوں نے اس نیم جان کا پردہ ڈھکا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انکم ٹیکس اور کسٹم والے بھی شاعری کی سرپرستی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ ہمارے ایک دوست پولیس میں ہیں۔ انہوں نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ وہ بھی اپنا دھوم دھامی

مشاعرہ کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ اس میں خرچ بہت پڑتا ہے۔ بولے "یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔ ہمارا اپٹے والا جہاں طلب نامہ لے کر پہنچا شاعر اپنے خرچ پر رکشہ میں بیٹھ بھاگا آئے گا۔ کھانا اسے سامنے کے تندور والے مفت کھلائیں گے۔ اور شب بسری کے لیے جگہ ہماری حوالات میں بہت ہے۔ البتّہ سُنا ہے مشاعرے میں ہوٹنگ وغیرہ کرتے ہیں لوگ۔"

ہم نے کہا۔ "ہاں کرتے تو ہیں۔"

بولے۔ "اچھا پھر تو آنسو گیس کا بھی انتظام رکھنا ہو گا۔ آپ آئیں گے مشاعرے میں یا بھیجوں لال پگڑی والے کو ہتھکڑی دے کر؟"

خطبۂ صدارت حضرت ابنِ انشا

پچھلے دنوں ایک کتاب چھپی ہے۔ "چلتے ہو تو چین کو چلیے" اس کے فاضل مصنف کا کیا عمدہ قول ہے کہ انسان کی صحیح قدر اس کے وطن سے باہر ہی ہوتی ہے جہاں اس کی اصلیت جاننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سفر وسیلۃ الظفر کا مطلب بھی شاید یہی ہے۔ ان صاحب کا جب چین میں تعارف کرایا گیا کہ یہ اپنے ملک کے نامی گرامی ناول نویس ہیں اور فسانۂ آزاد، گئودان، آگ کا دریا، خدا کی بستی، اور آنگن وغیرہ انہی کی تصانیف میں تو یہ ہر چند کہ ناول لکھنا تو در کنار ناول پڑھنا بھی نہ جانتے تھے۔ فرطِ عجز و انکسار سے دوہرے ہو گئے۔ کسی بات کی تردید کرنا خلافِ آداب جانا۔ ایک اور

صاحب کسی کاروبار کے سلسلے میں کسی باہر کے ملک گئے اور ملک الشعرا ہو کر واپس آئے۔ آقائے حاجی بابا اِصفہانی بھی اصفہان آنا خلافِ مصلحت جانتے تھے۔ استنبول میں تو یہ ایک رئیس کے داماد ہو کر ٹھاٹ دکھاتے تھے۔ لیکن وطن آتے تھے تو پرانے گاہک بجائے سر آنکھوں پر بٹھانے کے یہی فرمائش کرتے تھے کہ خلیفہ ذرا میرا سر تو مونڈ دیجیو اور ہاں داڑھی بھی تراش دیجیو۔ اللہ بخشے تمہارے باپ کا ساخط بنانے والا اب سارے اصفہان میں کوئی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ استنبول کی آب وہوا کی تعریف کیا کرتے تھے اور جب تک زندہ رہے وہیں قیام کرنا پسند کیا۔ مقصود اس قصّہ کا یہ کہ ہمارا اپنے ہی شہر اور اپنے ہی پرانے کالج میں مہمانِ خصوصی بن کر آنا ایک طرح کی سنگین غلطی بلکہ غلط کاری ثابت ہوتا لیکن ہم نے اطمینان کر لیا ہے کہ ہمارے اس زمانے کے اساتذہ میں سے کوئی کالج میں بچا ہے تو مروّت کے مارے ہماری کسی بات پر یہ نہ کہے گا کہ ہماری بلّی ہمیں کو میاؤں۔

صاحبو! ویسے تو ہم آہیں بھر بھر کر اپنے ماضی کی عظمت کی جو جو داستانیں چاہیں بیان کریں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس درس گاہ کے برآمدوں میں دو برس جوتیاں چٹخاتے ہوئے ہم نے کچھ کھویا، سوائے عزّت سادات کے اور نہ کچھ پایا

سوائے ڈگری کے۔ ہماری کلاسیں ایک طرح سے تعلیمِ بالغاں کی کلاسیں تھیں۔ ہمارے اساتذہ نے ہمارا عیب و ثواب اور نفع نقصان ہمیں پر چھوڑ رکھا تھا کیونکہ ہمارے ہم سبقوں میں ایک دو تو شائد صاحبِ اولاد بھی تھے۔

ان اساتذہ کے علم و فضل میں کلام نہیں لیکن ان کا فیض صحبت ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ ہم جیسے چھلے چھلائے اور دھلے دھلائے آئے تھے ویسے ہی واپس گئے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم قطب بنے اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تھے اور ہمارا ستارہ گردش میں رہا کرتا تھا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم خود گردش میں رہنے لگے اور ہمارے ستارے نے کراچی میں بیٹھے بیٹھے آب و تاب سے چمکنا شروع ہوا۔ پھر اخبار جنگ میں "آج کا شاعر" کے عنوان سے ہماری تصویر اور حالات چھپے۔ چونکہ حالات ہمارے کم تھے لہٰذا ان لوگوں کو تصویر بڑی کرا کے چھاپنی پڑی اور قبول صورت سلیقہ شعار پابندِ صوم و صلوٰۃ اولادوں کے والدین نے ہماری نوکری تنخواہ اور چال چلن کے متعلق معلومات جمع کرنی شروع کر دیں۔ یوں عیب بینوں اور نکتہ چینیوں سے بھی دنیا خالی نہیں۔ کسی نے کہا یہ شاعر تو ہیں لیکن آج کے نہیں۔ کوئی بے درد بولا۔ یہ آج کے تو ہیں لیکن شاعر نہیں۔ ہم بد دل ہو کر اپنے عزیز دوست جمیل

الدّین عالیؔ کے پاس گئے۔ انہوں نے ہماری ڈھارس بندھائی اور کہا دل میلا مت کرو۔ یہ دونوں فریق غلطی پر ہیں۔ ہم تو تمہیں شاعر جانتے ہیں نہ آج کا مانتے ہیں۔ ہم نے کسمسا کر کہا۔ یہ آپ کیا فرمارہے ہیں؟ بولے میں جھوٹ نہیں کہتا اور یہ رائے میری تھوڑی ہی ہے سبھی سمجھدار لوگوں کی ہے۔

ابن انشا نام ہم نے نہ جانے کب رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا۔ کیوں رکھا تھا کی توجیہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے اصلی نام میں ایک چوپائے کا نام شامل ہے۔ نیا نام رکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگ سید انشاء اللہ خاں انشا کی رعایت سے ہمیں بھی سیّد لکھنے لگے۔ یعنی گھر بیٹھے ہماری ترقی ہو گئی۔ اسی نسبت سے دلّی والوں نے ہمیں اپنا ہم وطن جان کر ہماری زبان پر کم اعتراض کئے اور دلّی مرکنٹائل ہاؤسنگ سوسائٹی والوں نے ایک پُر فضا پلاٹ کی ہمیں پیش کش کی۔ لکھنؤ والوں نے البتّہ ہماری زبان کے نقائص کے لیے اسی کو بہانا بنالیا کہ ہاں دلّی والے ایسی ہی زبان لکھا کرتے ہیں۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے آکر ہمارا ہاتھ ادب سے چوما اور کہا۔ واللہ۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ آپ کا کلام پڑھا اور جی خوش ہوا۔ ہم نے انکسار برتا کہ ہاں کچھ ٹوٹا پھوٹا کہہ لیتے ہیں۔ آپ نے کون سی غزل دیکھی ہماری۔ حافظے پر زور ڈال کر بولے کچھ اس

قسم کی ہے، کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں۔ ہم نے کہا۔ کہاں پڑھی ہے۔ بولے مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات میں منقول ہے۔

جنگ میں ''آج کا شاعر'' کے ضمن میں خواتین کے بھیجے ہوئے پسندیدہ اشعار بھی چھپا کرتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحبہ نے ہمیں فون کیا کہ ذرا چیک کر کے بتایئے یہ سارے اشعار آپ کے ہیں؟ بعض اوقات بیبیاں مختلف شاعروں کے اشعار کو غلط ملط بھی کر دیتی ہیں۔ ہم نے کہا سنایئے۔ ان میں بھی پہلا شعر جو کوئی دس خواتین کی پسند تھا یہی تھا۔ ع کمر باندھے ہوئے۔۔۔ یہ غزل ہمیں ہمیشہ سے پسند رہی ہے لہٰذا ہم نے ایڈیٹر صاحبہ سے کہا کہ کسی کا دل توڑنے کی ضرورت نہیں اگر کسی کو ہمارا یہی شعر پسند ہے تو خیر چھاپ دیجئے۔ دوسرا شعر بھی اسی غزل کا تھا۔

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا

غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ہم نے کھنکار کر کہا خیر یہ بھی ٹھیک ہے آگے چلئے۔ اس سے اگلا شعر تھا۔

یاد آتا ہے وہ حرفوں کا اٹھانا اب تک

جیم کے پیٹ میں اک نقطہ ہے سو خالی ہے

ہم نے کہا ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ یہ شعر ہمارا ہو۔ مشتبہ بات ہے۔ اسے کاٹ دیجئے
اس کے بعد نوبت ان شعروں پر پہنچی۔

کہیں بچھڑا ہوا دیکھا جو اک سرخاب کا جوڑا

تو ڈھاریں مار کر رویا بطِ گرداب کا جوڑا

لگی غلیل سے اُبرو کی دل کے داغ کو چوٹ

پر ایسی ہے کہ لگے تڑ سے جیسے زاغ کو چوٹ

شوق سے تو ہاتھ کو میرے مروڑ

میں ترا پنجہ مروڑوں کس طرح

اس پر ہم گھبر ائے اور کہا حاشا و کلا یہ ہمارے شعر نہیں۔ اس مرحوم کے ہیں کہ میر ماشاء اللہ خاں کا بیٹا تھا اور دلّی کا تھا۔ پہلی بار افسوس ہوا کہ ہم نے یہ نام کیوں رکھا۔ اس سے تو وہ چوپائے والا نام ہی اچھا تھا۔ شیر محمد خاں۔ جھوٹوں موٹوں کی تو ایسا نام سن کر ہی گھگی بندھ جاتی ہے۔

پروفیسر ایّوب قادری نے کہ محقق آدمی ہیں اس تقریب سے ہم پر مضمون لکھنے کا بیڑا اٹھایا تو ایک دوست نے مخبری کی کہ انہوں نے انجمن ترقی اُردُو کے کتب خانے میں تمام پرانے تذکرے اور مخطوطے کھنگال ڈالے۔ کہیں آپ کے حالات نہیں ملے۔ لہٰذا اب وہ آپ سے ملیں گے اپنے پر مضمون لکھا جانے کا سن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ ہم نے کہا چشم ما روشن دل ما شاد۔ قادری صاحب کے لیے کسی ایسے شخص پر مضمون لکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا جو ابھی مرا نہیں اور قریب المرگ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن ریسیرتچ کا آدمی بھی مار نہیں کھاتا۔ آئے تو سوالات سے مسلح ہو کر آئے۔ سب سے پہلے ہمارا اسم گرامی دریافت کیا۔ وہ ہم نے خوشی سے بتا دیا۔ ولدیت بھی۔ عمر ہم اپنی موقع محل کے مطابق دو چار سال گھٹا کر یا بڑھا کر بتایا کرتے ہیں۔ یہاں بڑھا کر بتائی کہ اپنے مہمانِ خصوصی کو بالکل ہی بچّہ سمجھ لیں۔

کہاں پیدا ہوئے تھے اور کیوں پیدا ہوئے تھے کا ہم کوئی تسلّی بخش جواب نہ دے سکے۔ شجرہ نسب مانگ رہے تھے۔ ہمارے پاس کہاں سے آتا۔ ہم نے کہا بزرگوں میں اپنے والد کا نام یاد ہے یا ایک اور مورثِ اعلیٰ کا کہ اپنے زمانے کے مشہور پیغمبر تھے۔ بولے کون؟ ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کا نام بتایا تو عقیدت سے ادھ موئے سے ہو گئے۔ تعیم کا پوچھا۔ کچھ ہوتی تو بتاتے۔ فرمایا تعلیم نہیں تو ڈگریاں تو ہوں گی۔ وہ ہم نے بتا دیں۔ کہنے لگے آپ سنا ہے یونیورسٹی میں اوّل آئے تھے؟ انکار کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ ہم نے اقبال کیا۔ بولے۔ اس سال ایک سے زیادہ طالب علم تھے کیا؟ اس سوال کو ہم ٹال گئے۔ پوچھا شاعری میں کس کے شاگرد رہے۔ ہم نے ماسٹر چنّن سنگھ دلگیر اور چھجو رام تشنہ اور منشی اللہ دین چراغ ریواڑوی کے نام لکھوا دیئے۔ قوم، گوت، نوکری، تصانیف اور نہ جانے کیا کیا لکھ چکے تو بولے۔ ہمارے تحقیق کے اصولوں کے مطابق خاصی معلومات جمع ہو گئیں۔ یہ معاملہ کچا رہا کہ آپ کے بزرگ خراسان سے نہیں آئے تھے۔ اور صاحبِ دیوان وغیرہ نہیں تھے۔ لیکن خیر اب ایک آخری سوال باقی ہے۔ آپ کی تاریخِ وفات کیا ہے؟ یہ ہم نے بتانے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ کچھ ملول اور افسردہ واپس گئے۔ خود ہمیں بھی

افسوس ہوا کہ اس سلسلے میں ان کی تشفی نہ کر سکے حالانکہ وہ ہمارے ہی بھلے کی کہہ رہے تھے۔

خیر صاحبان اب تو ہماری صدارت کا سفینہ کنارے پر آ لگا۔ ستم و جور ناخدا کہنے کا کیا فائدہ۔ آپ صاحبوں نے مجھے مہمانِ خصوصی بنایا۔ بہت شکریہ۔ اس میں اتنی تاخیر کی تو اس کا کچھ ملال نہیں، ہمارے ملک میں جوہر قابل کی قدر شناسی میں عموماً دیر ہو ہی جاتی ہے۔ واللہ ہمارا دل آپ کی طرف سے صاف ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ یہ کالج ہماری مادرِ علمی ہے اور اس سے ہمیں دِلی محبت ہے۔ آئندہ بھی آپ حضرات کسی جلسے کی صدارت یا تقسیمِ اسناد کے لیے یاد فرمائیں گے تو اپنی بے پناہ مصروفیات کو پسِ پشت ڈالنے میں عذر نہ ہو گا۔ کیونکہ وہ انسان کیا جو کسی کے کام نہ آئے۔ ہاں دامے درمے کی بات تو چھوڑیے کہ دنیا میں روپیہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ ہاں قدمے سخنے اس کالج کی خدمت میں دریغ نہ ہو گا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آج کے جلسے میں زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اخبار میں جلسے کا اعلان ہو گیا تھا جس میں ہمارا نام بھی درج تھا۔ بہر حال زیادہ مجمع سے اس فقیر گوشہ گیر کا جی ہمیشہ گھبراتا ہے۔ تاہم میں ان اہلِ ذوق حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا

ہوں جو منتظمین یا مضمون پڑھنے والوں یا اسناد لینے والوں یا پانی پلانے والوں کے علاوہ یہاں موجود ہیں، اگر کوئی ہیں تو۔ جمیل الدّین عالی صاحب کا شکریہ بطورِ خاص مجھ پر فرض ہے جنہوں نے میرے ایما پر کالج والوں سے کہا کہ مجھ سے مہمانِ خصوصی بننے کی درخواست کریں اور اس کے لیے کالج کا پرانا طالب علم ہونے کا عذر یا عذرِ لنگ ڈھونڈا۔ پھر وہ جلسے میں حاضرین کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اپنے اہل و عیّال کو اپنی کار میں بھر کر لاتے۔ یہ ان کا دوسرا احسان ہے۔ سچے دوستوں کی پہچان ایسے ہی موقع پر ہوتی ہے اور اب سیکرٹری صاحب سے گزارش ہے کہ انہوں نے دریوں، کوسیوں، شامیانے، کوکا کولا اور آج کے جلسے کے خرچ کی دوسری تفصیل تیار کر لی ہو تو مجھ سے الگ آ کر ملیں۔ یہ ایک خصوصی معاملہ ہے اور اپنے پیارے کالج کی بات ہے۔ ورنہ تو ایسے جلسوں کا خرچ عموماً میزبان خود ہی اٹھایا کرتے ہیں۔

دعوتوں پر پابندی

لیجئے آج سے سندھ کی حکومت نے ہمارے نوالے گننے شروع کر دیئے ہیں یعنی پابندی عائد کر دی ہے کہ شادی کی تقریبات میں دس سے زیادہ مہمانوں کی دعوت نہیں کی جاسکتی۔ اگر کوئی مہمان نواز گھر میں احباب یا رشتہ داروں کو بلائے تو اس پر دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق ہو گا۔ یعنی پانچ سے زیادہ مہمان نہ بلا سکے گا۔ ہم تو خیر کسی کو بلاتے ہی نہیں، حکومت سندھ کا آرڈر نکلنے سے پہلے سے اس کی پابندی کر رہے ہیں لیکن اپنے ان دوستوں سے ہمدردی ہے جو آئے دن ہمیں دعوتوں میں بلاتے ہیں۔ ایک لحاظ سے ہمیں اپنے آپ سے بھی دلی ہمدردی ہے کہ اب کوئی بلائے گا نہیں تو

ہم جائیں گے کیسے۔ وہ جو شادیوں کے موسم میں ہم شیروانی پہن کر اور معطّر رومال ہاتھ میں لے کر جہاں پھولداری تنی دیکھی مہمانوں میں شامل ہو جایا کرتے تھے اور بسم اللہ کہہ کر کھانے کی قاب میں چمچہ ڈال دیتے تھے، اس کا موقع بھی گیا۔ کیونکہ جو آدمی دس آدمیوں کو بلائے گا، وہ ان کی پہچان بھی ضرور رکھتا ہو گا۔ ممکن ہے شناختی کارڈ کا رواج بھی ہو جائے کہ مہمان اپنا تصویر لگا کارڈ دکھائے تب کھانا ملے گا۔

اس وقت بھی جب کہ اس پابندی کا آغاز ہوا ہے، ہمارے پاس احباب کے کئی کارڈ جمع ہیں جن کی وجہ سے ہم نے گھر میں کہہ رکھا ہے کہ فلاں فلاں تاریخ کو دال پکانا یا تم لوگ بھی کسی دعوت میں چلے جانا کیونکہ ہمارا کھانا باہر ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ ہمارا برابر کا حساب ہے۔ کبھی وہ ہمیں کھانے پر بلاتے ہیں کبھی ہم ان کے ہاں کھانے پر چلے جاتے ہیں۔ ہفتے میں تین دن اور دعوتیں بھی ہو جاتی ہیں جن کا سامان ہم اپنے گوہان میں بھر کر ہفتہ بھر چلاتے ہیں۔ جس دن کوئی دعوت نہ ہو، اس دن ہمیں لا محالہ خیال آتا ہے کہ ہم اپنی صحت کی طرف سے غافل ہو رہے ہیں۔ ڈائٹنگ شروع کرنی چاہیئے۔ اور آج ہی سے شروع کرنی چاہیئے۔ اس میں خست وغیرہ کی کوئی بات نہیں۔ جو لوگ ہمیں جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہم دریا دل آدمی

ہیں۔ بس اسے اتفاق ہی کہیئے کہ جس دن ہماری کہیں دعوت ہو اس دن ڈائٹنگ کرنے کا وسوسہ کبھی ہمارے جی میں نہیں آتا۔

سوال یہ ہے کہ جو احباب ہمیں دعوت دے چکے ہیں۔ وہ کیا کریں۔ مثلاً ہمارے دوست اقبال صفی پوری نے اپنے فرزندِ نیک اطوار کی شادی کے ولیمے میں ہمیں بلا رکھا ہے۔ ان کا ایک خوبصورت سا کارڈ آیا ہے اور اس کے انتظار میں ہم نے ابھی سے بھوک رکھ کر کھانا شروع کر دیا ہے۔ اب یا تو وہ ہمیں اس مضمون کا کارڈ بھیجیں کہ "مکرمی میرے بیٹے کی شادی کا ولیمہ ۳ دسمبر کو ۸ بجے جناح کالج کے کمپونڈ میں ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ تشریف نہ لا کر اور ماحضر تناول نہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ تاکید ہے۔" یا پھر اس کو نذر نیاز کے جلسے کی صورت میں دے دیں۔ کیونکہ حکومت کے اعلان میں ہے کہ خیرات کے سلسلے میں تقسیم کیے جانے والے لنگر متبرک اور نیاز و فاتحہ کے کھانے پر اس پابندی کا اطلاق نہ ہو گا۔ تمبو کے باہر خواجہ غریب نواز کے عرس کا پھریرا لہرایا جا سکتا ہے یا اس قسم کی تختی کہ یہاں حضرت ابنِ انشا کے اعزاز میں لنگر دیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ حکومت کے آرڈر کی رو سے اس پابندی کا اطلاق سوڈا واٹر، فروٹ، اسکوائش، دودھ اور دیگر مشروبات، تازہ

پھل، خشک میوہ جات، چھالیہ، پان، آئس کریم، آلو کی چاٹ، آلو کے کباب اور مچھلی پر نہیں ہوتا۔ جو ان چیزوں کا انتظام بھی رکھیں، کیونکہ ہم کھانے سے پہلے سوڈا پیتے ہیں، یہ اشتہا انگیز چیز ہے۔ پانی کی جگہ ہمیں فروٹ اسکوائش پسند ہے اور دودھ بھی غذائیت سے بھرپور چیز ہے۔ البتّہ ہمارے گلاس میں شکر تین چمچ سے زیادہ نہ ڈالی جائے۔ دیگر مشروبات کوکاکولا وغیرہ کا بھی ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ تازے پھل ہمیشہ سے ہمیں پسند ہیں اور ہم کسی دعوت میں جائیں تو خشک میوہ جات ٹھونگنے سے پہلے چند کیلے اور سیب وغیرہ نوش کرنا ہمارے جسم کی وٹامن کی ضروریات کے لیے مناسب رہتا ہے۔ آئس کریم پستے کی ہمیں مرغوب ہے اور پان سادہ جس میں چھالیہ کتھا، الائچی خوشبو، ناریل کا سفوف اور مراد آبادی تمباکو ہو اور کچھ نہ ہو۔ آلو کی چاٹ اور آلو کے کباب پر ہم اصرار نہیں کرتے۔ مل گئے تو کھالیں گے البتّہ مچھلی ہونی چاہئے کیونکہ جس کھانے یعنی لنگر میں مچھلی نہ ہو، وہ کھانا کیسے کہلا سکتا ہے۔ یوں بھی مچھلی اور لنگر دونوں کا سمندر سے تعلق ہے۔ ہمیں بھی لوگوں نے دعوت کا کھانا کھا کر اسی طرح کرسی میں دھنستے دیکھا ہے جس طرح جہاز لنگر ڈالنے کے بعد بندرگاہ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہم نے حکومت کے حکم کو بہت غور سے پڑھا ہے۔ اگر حکومت کا کارندہ ولیمے کی دعوت کو لنگر نہ تسلیم کرے تب بھی گرفت نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ یہ انتظام تمبو اور قناتوں کے اندر ہو۔ حکم میں ہے کہ محکمہ خوراک کا کوئی بھی انسپکٹر کسی بھی عمارت، موٹر گاڑی یا بحری جہاز میں داخل ہو سکتا ہے اور کسی بھی شخص کی موٹر گاڑی یا بحری جہاز یا جانور کو روک سکتا ہے اور اشیا کو ضبط کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے انسپکٹر بو یعنی کھانے کی خوشبو سونگھتا ہوا آتا بھی ہے تو اس سے ہم حجت کر سکتے ہیں کہ بابا کہاں منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو۔ یہ نہ عمارت ہے نہ موٹر گاڑی نہ بحری جہاز ہے اور نہ جانور ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم نے ان چیزوں کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اگر وہ بھی حجتی ہوا تو بے شک پھولداری اور قناتیں ضبط کر لے۔ پھر محکمہ خوراک اور ایچ نظام الدّین اینڈ سنز کا اندرونی معاملہ ہو جائے گا۔ ہمارا اس میں دخل نہیں رہے گا اور اگر کھانا ضبط کرنا چاہے تو بے شک ہمارے سامنے سے آلو کی چاٹ اور آلو کے کباب اٹھا لے۔ ہم ویسے بھی کم خور ہیں۔ ایسی چیزیں نہیں کھاتے لیکن کھا کر پلیٹ واپس دینی ہو گی۔ کیونکہ حکومت کے اعلان میں کھانا ضبط کرنے کا حکم ہے پلیٹیں اور برتن نہیں۔

بہ نظرِ احتیاط ہم مشورہ دیں گے کہ ولیمے وغیرہ کی دعوت میں ایک دو قوال ضرور بلانے چاہیں۔ جہاں مخبر نے خبر دی کہ محکمہ خوراک کا کارندہ گھوم رہا ہے اور مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا ہے، وہ کان پر ہاتھ رکھ کر اپنا کاروبار شروع کر دیں۔ ''کس چیز کی کمی ہے مولا تیری گلی میں یا ہمیں نظرِ کرم کی بھیک ملے اجی بھیک ملے۔ ہاں ہاں بھیک ملے'' تا کہ باقاعدہ نذر و نیاز کی تقریب معلوم ہو۔ اگر ان ترکیبوں میں سے کوئی نہیں چلتی اور میزبان کو مثلاً ہمارے دوست اقبال صفی پوری کو حکومت کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر تین سال قید کی سزا ہو جاتی ہے تب بھی ایسی فکر کی بات نہیں۔ ہم ان سے جیل میں جا کر مل آیا کریں گے۔ کبھی کبھی ناشتہ دان میں ان کے لیے کھانا بھی لے جایا کریں گے اور ان کی رہائی کے لیے محضر پر دستخط بھی کر دیں گے۔ ان کی شاعری کو جیل جانے سے جو عروج حاصل ہو گا اس کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ جناب فیض احمد فیض کے مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فیض صاحب جیل نہ جاتے اور دستِ صبا اور زنداں نامہ نہ لکھتے تو کبھی اتنے بڑے شاعر نہ ہوتے۔ ''رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی'' اور ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' وغیرہ لکھتے رہتے۔ چونکہ ہم نے آرڈر کا دو تین بار مطالعہ کر

کے اطمینان کر لیا ہے کہ مہمانوں کو کسی صورت نہیں پکڑا جائے گا لہٰذا ہم اقبال صفی پوری صاحب کو مشورہ دیں گے کہ وہ دعوت ولیمہ ہر گز منسوخ نہ کریں اور اس میں اگر کوئی خطرات ہیں تو ان کا مردانہ وار سامنا کریں۔ اگر انہوں نے ہمیں محض اپنے کلام اور مشاعرے وغیرہ پر ٹالنے کی کوشش کی کہ یہ بھی ایک طرح کی موسیقی ہے اور موسیقی روح کی غذا کہی جاتی ہے، تو ایک تو اس منطق سے ہمارا پیٹ نہ بھرے گا۔ دوسرا خطرہ ہے حکومت کہیں مشاعروں اور موسیقی کی محفلوں پر بھی پابندی نہ لگا دے کہ اوّل تو یہ چیزیں ہوں نہیں اور ہوں تو سامعین کی تعداد دس سے تجاوز نہ کرے۔ ہمارا تو اس میں بھی نقصان نہیں لیکن شاعروں کو اپھارہ ہو جائے گا۔

بٹیر کی نہاری

گزشتہ بدھ کی شام ہمارا صدر کے ایک نامی ریستوران میں جانا ہوا۔ بیرا لپک کر آیا۔

ہم نے پوچھا ”کیا ہے؟“

بولا۔ ”جی اللہ کا دیا سب کچھ ہے!“

ہم نے کہا۔ ”کھانے کو پوچھ رہے ہیں۔ خیریت دریافت نہیں کر رہے۔ کیونکہ وہ تو تمہارے روغنی تن و توش سے ویسے بھی ظاہر ہے۔“

کہنے لگا۔ ”حلیم کھایئے۔ بڑی عمدہ پکی ہے۔ ابھی ابھی میں نے باورچی خانے سے لاتے میں ایک صاحب کی پلیٹ میں سے ایک لقمہ لیا تھا۔“

”لیکن آج تو گوشت کا ناغہ ہے۔“

بولا۔ ”ہوا کرے۔ یہ مرغ کی حلیم ہے۔ آپ کھا کے تو دیکھئے۔ فوراً بانگ دینے کو جی چاہے گا۔“

”نہاری ہے؟“

”جی ہاں ہے، مرغ کی نہاری بھی ہے۔ بٹیر کی نہاری بھی ہے۔“

”بٹیر کی نہاری!“

بولا۔ ”جی ہاں اور اس کے علاوہ پدی کا شوربا بھی ہے۔ تیتر کے سری پائے ہیں۔ مسور کی دال کے تکّے اور کباب ہیں۔ آپ کل آئیں تو بھینسے کے گوشت کا مرغ پلاؤ بھی مل سکتا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹیر کی نہاری لاؤ فی الحال۔“

ہمارے ساتھ ہمارے ایک دوست تھے۔ دلی کے جیوڑے، نہاری آئی تو بولے۔ ”میاں نلیاں تو اس نہاری میں ہیں نہیں۔ ہم لوگ تو جب تک نلیوں کو پیالی کے سرے پر بجا بجا کر نہ چوسیں مزا نہیں آتا۔“ بیرا جانے کیا سمجھا۔ ایک طشتری میں خلال اٹھا لایا۔ ہم نے کہا۔ ”میاں خلال تو کھانے کے بعد درکار ہوتے ہیں۔ کچھ تمیز ہے کہ نہیں؟“

بولا۔ ”حضور یہ خلال نہیں۔ نلیاں ہیں۔ بٹیر کی نلیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ویسے ہم آئندہ نلیوں کے شوقینوں کے لیے پلاسٹک کی نلیاں بنوا رہے ہیں۔ ناغے کے دن نہاری اور شوربے کے ساتھ پیش کی جایا کریں گی۔ گودا ان کے اندر آلوؤں کا ہوا کرے گا۔“

ہمیں معلوم نہیں کہ ہر چیز کا نعم البدل نکالنے والوں نے پلاسٹک کے بکرے بھی ایجاد کئے ہیں یا نہیں۔ ان کی ضرورت کا احساس ہمیں عید سے دو روز پہلے ہوا۔ وہ یوں کہ ہم دفتر جاتے برنس روڈ سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ دیکھا کہ ہجوم ہے۔ راستہ بند ہے۔ آدمی ہی آدمی۔ دُنبے ہی دُنبے۔ بکرے ہی بکرے!

ایک بزرگ سے ہم نے پوچھا۔ ”یہ کیا میلہ مویشیاں ہو رہا ہے۔ ہم نے اشتہار نہیں پڑھا اس کا۔ میلہ مویشیاں ہے تو ساتھ مشاعرہ بھی ضرور ہو گا۔ ایک غزل ہمارے پاس بھی ہے۔“

بولا۔ ”جی نہیں۔ یہ برنس روڈ کی بکرا پیڑی ہے۔ لیجئے یہ دنبہ لے جایئے۔ آپ کے خاندان بھر کو پُل صراط سے پار لے جائے گا۔“

ہم نے پوچھا ”ہدیہ کیا ہے اس بزرگ کا؟“

بولے۔ ”پانچ سو لے لوں گا۔ وہ بھی آپ کی مسکین صورت پر ترس کھا کر۔ ورنہ چھ سو روپے سے کم نہ لیتا۔“

ادھر سے نظر ہٹا کر ہم نے ایک اللہ لوک قسم کے بکرے کی طرف دیکھا جو مارے ضعف اور ناتوانی کے زمین پر بیٹھا تھا۔

ہم نے کہا۔ ”اس ذات شریف کے کیا دام ہوں گے؟“

اس کا مالک دوسرا تھا۔ وہ بھاگا آیا۔ بولا ”جناب آپ کی نظر کی داد دیتا ہوں۔ بڑی خوبیوں کا بکرا ہے۔ اس کی داڑھی پر نہ جایئے۔ ایک میمن گھرانے میں پلا ہے ورنہ عمر اس کی زیادہ نہیں۔ آپ سے دو چار سال چھوٹا ہی ہو گا۔“

ہم نے کہا ”یہ چُپ چاپ کیوں بیٹھا ہے۔ جگالی تک نہیں کرتا۔“ بولے ”دانتوں میں کچھ تکلیف تھی۔ پوری بتیسی نکلوا دی ہے۔ خیال تھا مصنوعی جبڑا لگوانے کا۔ لیکن اتنے میں عید آ گئی۔“

”کتنے کا ہو گا؟“

”دو سو دے دیجئے۔ اتنے میں مفت ہے۔“

ہم نے اپنی جیب کو ٹٹولا اور کہا۔ ”سو روپے سے کم کی چیز چاہیے۔“

بولے۔ ”پھر آپ مرغ کی قربانی دیجئے۔ چوپایہ نہ ڈھونڈیئے۔“

اس سے کچھ آگے ایک کالا بکرا نظر آیا۔ کالا ہونے کی وجہ سے نظر بھی آ گیا۔

ہم نے اس پر ہاتھ پھیرا لیکن اتنے میں ہوا کا جھونکا آیا اور یہ دور جا پڑا۔

ہم نے مالک سے کہا۔ ”یہ بکرا ہے یا بکرے کا خلاصہ ؟“

مالک نے کہا۔ ”سائیں آج کل زمانہ ہی خلاصوں کا ہے۔ یہ تو خلاصہ ہے۔ ایسے ایسے بکرے آپ کو دکھاؤں کہ آپ ان کو گیس پیپر کہیں۔ جانور کاست قرار دیں۔ ہوا تیز ہے لہٰذا اپنی جیب میں ڈال رکھے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”دکھاؤ تو۔“

انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی کھول کر کہا۔ ”یہ لیجئے۔“

ہم نے کہا۔ ”ہمیں تو نظر نہیں آتا۔“

بولے۔ ”قریب سے دیکھئے۔ جھک کے دیکھئے۔ سستا بھی ہے، چالیس روپے میں ہو جائے گا۔“

ہم نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”اچھا کل سہی۔ اس وقت تو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

ان بزرگوں نے ایک مینڈھے کو شُشکارا کہ صاحب کو دیر ہو رہی ہے ذرا پہنچا آئیو ان کے دفتر۔

وہ سینگ جھکا کر ہماری طرف لپکا۔

جب کوئی چیز نایاب یا مہنگی ہو جاتی ہے تو اس کا بدل نکل ہی آتا ہے۔ جیسے بھینس کا نعم البدل مونگ پھلی۔ آپ کو تو گھی سے مطلب ہے کہیں سے بھی آئے۔ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے کہ ہمارے ہاں بکرے اور دُنبے کی صنعت بھی قائم ہو۔ آپ بازار میں گئے اور دکاندار نے ڈبّا کھولا کہ جناب یہ لیجئے! بکرا اور یہ لیجئے پمپ سے ہوا اس میں خود بھر لیجئے۔ کھال اس بکرے کی کیریلین کی ہے۔ اور اندر کمانیاں اسٹین لیس اسٹیل کی۔ مغز میں فوم ربڑ ہے۔ واش اینڈ ویر ہونے کی گارنٹی ہے۔ باہر صحن میں بارش یا اوس میں بھی کھڑا کر دیجئے تو کچھ نہ بگڑے گا۔ ہوا نکال کر ریفریجریٹر میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ آج کل قربانی والے یہی لے جاتے ہیں۔

رسالوں کا زمانہ گیا۔ اب ڈائجسٹوں کا دور ہے۔ لیکن ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے مزا البشیر کی نہاری ہی کا آتا ہے کہ بے چارے کی جان گئی اور کھانے والے کو سواد نہ آیا۔ پھر زیادہ مصروف لوگوں کے لئے ڈائجسٹوں کے ڈائجسٹ نکلے۔ خلاصۃ الخلاصہ۔ خیر بہت سی کتابیں ہیں بھی اس قابل کہ محض ان کا عطر استعمال کیا جائے۔ ہمیں تو کوئی کسی ناول کے پڑھنے کی سفارش کرے تو ہم پوچھتے ہیں کہ صرف اتنا بتا دو کامیڈی ہے

یا ٹریجڈی؟ آخری باب میں باجے گاجے بجتے ہیں یا ہیرو ہیروئن کی قبر پر کھڑے ہو کر ٹسوے بہاتا ہے اور آسمان سے رحمت کے پھول برستے ہیں۔ بیچ کے مناظر سے ہمیں مطلب نہیں کیونکہ ان میں حد سے حد رقیب ہو گا۔ سو آخری سے پہلے باب میں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا ہو گا یا اس کے من کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی یا جیل میں اکڑوں بیٹھا چنے کی دال سے جو کی روٹی کھا رہا ہو گا۔ ہمارے خیال میں اخباروں کے ڈائجسٹ بھی نکلنے چاہئیں کیونکہ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ بارہ بارہ چودہ چودہ صفحے پڑھے۔ لوگ تو بس توس کا ٹکڑا منہ میں رکھ چائے کی پیالی پیتے ہوئے سرخیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ بڑا اخبار نکالنے کے لیے یوں بھی لاکھوں روپے درکار ہوتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ سرخی کے نام سے ایک روزنامہ نکالیں اور پبلک کی خدمت کریں۔ ہمارے پاس بینک میں پچاس روپے ہیں۔ شائد زیادہ ہی ہوں۔ اب اہلِ نظر سے سرپرستی کی درخواست ہے۔

اس اخبار میں مزاحیہ کالم کی جگہ صرف دیکھا ہو گا "ہنسئے۔" ایڈیٹوریل کے کالم میں فقط ایک لفظ ہو گا "روئیے۔" منڈیوں کے بھاؤ کا کالم بھی ہو گا لیکن وہ بھی ایک لفظی "لٹیے" ریلوں اور ہوائی جہازوں کے اوقات بھی ہم تفصیل سے نہ دیں گے۔ ان کی

جگہ فقط "جایئے" کا لفظ ہو گا۔ ڈائجسٹ نئی چیز نہیں۔ کسی نے پرانے زمانے میں حضرت یعقوب اور یوسفت کے قصّے کا خلاصہ بھی سرخیوں میں لکھا تھا:

"پدرے بود۔ پسرے داشت۔ گم کرد۔ بازیافت۔" آپ خود ہی سوچئے اصل بات اتنی ہی تو ہے۔ زلیخا کے قصّے سے کتنوں کو دلچسپی ہے۔

روپیہ کمانا

شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ خطائے بزرگان گرفتن خطا است۔ لیکن کیا کیا جائے۔ ہماری تو ساری زندگی بزرگوں کی خطائیں پکڑتے اور ان کے مقولوں کو غلط ثابت کرتے گزر گئی۔ بزرگوں کو بھی کچھ ہم سے ضد معلوم ہوتی ہے کہ جو بات فرمائیں گے غلط فرمائیں گے۔ انہی میں ایک مقولہ یہ سننے میں آتا ہے کہ دولت آنی جانی ہے۔یعنی آتی ہے اور جاتی ہے۔ ہمیں اس کا یہ دوسرا روپ (جانے کا) تو دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوا بلکہ ہر روز ہوتا ہے لیکن آتی کسی راستے ہے، یہ کبھی تحقیق نہ ہوا۔ کئی بار تو ہم اس راہ پر بھی امیدوار بیٹھے جو تری راہ گزر بھی نہیں، لیکن بے سود۔ پھر یہ بھی سنا

کہ روپیہ تو ہاتھوں کی میل ہے۔ بے شک یہ درست ہو گا لیکن یہ نکتہ سمجھ میں نہ آیا کہ صرف دوسروں کے ہاتھوں کی میل کیوں ہے۔ آخر ہمارے بھی تو ہاتھ ہیں۔ ان پر بھی تو میل جمنی چاہیئے۔ شیخ سعدی مرحوم نے تونگری کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ حالانکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے انہیں خود اس سے کم ہی واسطہ پڑا۔ ایک شعر وہ ہمارے بارے میں بھی کہہ گئے ہیں۔

قرار بر کفِ آزاد گاں نہ گیر و مال

نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب غرباں

آپ تو غیر فارسی جانتے ہیں نہ جاننے والوں کے لیے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس طرح عاشق کے دل میں صبر اور چھلنی میں پانی نہیں ٹھہر سکتا اسی طرح آزاد منش لوگوں کی ہتھیلی پر پیسہ نہیں ٹکتا۔ ان میں سے دو باتیں تو ہماری آزمودہ ہیں۔ صبر در دل عاشق والی اور مال والی۔ پانی والی بات کا تعلق چھلنی سے ہے۔ سو پانی جانے اور چھلنی جانے۔

روپے کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ملے تو براہِ راست ملے۔ چھپر پھاڑ کے ملے۔ راستے میں پڑا ہوا ہاتھ آ جائے یا الہ دین اپنا چراغ کچھ دن کو مستعار دے دے۔ کاروبار اور نوکری سے پیسہ ملا تو کیا ملا۔ ایسے تو ہر کوئی کما سکتا ہے۔ کام کرنے کی تخ ہمیں پسند نہیں۔ اس سے تو روپیہ ملنے کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔

آخر ایک روز مرادِ دِلی بر آئی۔ ایک بزرگ خصر صورت ملے اور بولے بچّہ غم نہ کر۔ کچھ ہم فقیروں کی خدمت کر اور ہم سے ۱۸ کیرٹ گولڈ یعنی تاند لیانوالہ کا خاص سونا بنانے کا نسخہ حاصل کر۔ چونکہ انسان کچھ کھو کر ہی پاتا ہے، یہ بھی داناؤں کا مقولہ ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے جو کچھ ہمارے پاس تھا ہم نے ان بزرگ کی خدمت میں کھو دیا۔ لیکن آخر وہ نسخۂ کیمیا ہاتھ آ ہی گیا۔ ان بزرگ نے بتایا کہ یہ نسخہ قارون بادشاہ سے ان تک دست بدست پہنچا ہے۔ ہر کسی کو وہ نہیں بتاتے۔ اور ہم نے جو دامے درمے ان کی خدمت کی ہے اسے محصول ڈاک اور خرچہ اشتہارات کی مد میں شمار کیا جائے۔ یوں پیسہ لینا ان کے لیے حرام ہے۔

اس نسخے کے بعض اجزا تو بڑی آسانی سے دستیاب ہو گئے لیکن بعض کی بہم رسانی میں کچھ دقت پیش آئی۔ شیر کے ناخن بھی مل گئے۔ اور بجّو کی کھال بھی ایک

بزرگ نے عنایت کر دی۔ لگڑ بگڑ کی ریڑھ کی ہڈی کا برادہ بھی بڑی دوڑ دھوپ کے بعد آخر میسر آگیا۔ اب فقط کانے اُلّو کی تھوڑی سی بیٹ جمع کرنی تھی جس کی شرط یہ تھی کہ چاند رات کی چودھویں کو بوقت نیم شب جب وہ نیم کے درخت پر استراحت کر رہا ہو تو اس کے گھونسلے سے حاصل کی جائے۔ پہلی دِقّت تو اُلّوؤں کا مہاراجہ رنجیت سنگھ تلاش کرنے میں ہوئی۔ اُلّوؤں خصوصاً ان اُلّوؤں سے جن کا شمار پرندوں یا جانوروں میں ہوتا ہے ہمارا واسطہ کم ہی پڑتا ہے۔ ایک اُلّو ملا تو یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ دونوں آنکھیں درست ہیں۔ ایک اس نے یادِ الٰہی میں بند کر رکھی تھی اور دوسری شکار کے لیے کھلی رکھی تھی۔ کئی دن کی دوڑ بھاگ کے بعد ایک آٹھوں گانٹھ کمیت اُلّو ملا تو وہ نیم کے درخت پر نہیں تھا۔ ایک کیکر کی پھننگ پر تھا۔ نیم کا درخت پاس ہی تھا۔ وہ چاہتا تو اس پر بیٹھ سکتا تھا۔ کوئی امر مانع نہ تھا۔ لیکن ہمیں تنگ جو کرنا ہوا۔ ایک بار نیم کی شاخ پر بیٹھا مل گیا تو قریب جانے پر معلوم ہوا کہ کوئی اور جانور ہے۔ اور جب نیم اور کانے اُلّو کا قِران السعدین ہوا بھی تو تاریخ چاند کی تیرھویں نکل آئی۔ خیر ہم نے شک کا فائدہ خود کو دیا کہ رویت ہلال ہمیشہ سے

جھگڑے کی چیز چلی آئی ہے۔ تیرھویں اور چودھویں میں چنداں فرق نہیں۔ لیکن پہلے تو اس کا گھونسلہ نہ ملا۔ ملا تو اس میں بیٹ نہ تھی۔

تہی داستانِ قسمت راچہ سود از رہبرِ کامل

یہ مل جائی تو اس کے بعد فقط نوگزے پیر کے مزار پر چالیس دن کا مراقبہ کرنے کی شرط رہ جاتی تھی جس کے بعد ان سب چیزوں کو کالی ہنڈیا میں گِل حکمت کر کے سرمہ بنا کر اس کی ایک ایک سلائی رجب کی ۲۸ ویں کو بوقت طلوعِ آفتاب اپنی دونوں آنکھوں میں لگانی تھی۔ اور اگر اس عمل کے بعد ہماری بینائی باقی رہ جاتی تو ہمیں ساری دنیا کا سونا نظر آجاتا۔ اپنا سونا تو خیر سمیٹ لیا جاتا۔ باہر کے سونے کو شائد اسمگل کر کے لانا پڑتا۔ خر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔

اس میں شک نہیں کہ دولت مند بننے کے بعض آسان تر نسخے بھی ہمارے ہاں مروج ہیں مثلاً ہنڈیا میں نوٹ ڈال کر ان کو دُگنے کرنا لیکن اس میں ایک قباحت یہ بھی ہ ہے کہ جب تک ہنڈیا میں کچھ ڈالا نہ جاتے دُگنا نہیں ہو سکتا۔ ایک باکماں بزرگ ہمیں بھی ملے۔ ہم نے کہا۔ بندہ پرور! ہمارے پاس نقد تو کچھ ہے نہیں آپ سو روپے ہماری طرف سے ہنڈیا میں خود ہی ڈال دیجئے۔ یہ آپ کا ہم پر قرض متصوّر

ہو گا۔ دُگنے ہو جائیں تو ان میں سے اپنی رقم وضع کر لیجئے گا بلکہ دس پانچ اوپر سے لیجئے گا۔ باقی پر ہم اکتفا کریں گے کیونکہ لالچ ہماری طبیعت میں نہیں ہے۔ لیکن وہ نہ مانے۔

کچھ دن بعد ہمارے پاس ایک اچھی خاصی رقم آئی۔ دس روپے سے اوپر ہی اوپر تھی۔ اب ان بزرگ کو تلاش کیا تو اتّفاق سے ان کے پاس ہنڈیا نہ تھی۔ کیونکہ جیل میں اس کے رکھنے کی اجازت نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ پولیس آس پاس ہو تو روپے دُگنے نہیں ہوتے۔ عمل کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انہی دنوں ایک صاحب نے یہ نسخہ بتایا کہ سیدھے سیدھے کسی رئیس کی فرزندی میں چلے جاؤ اور عمر بھر چین کی بنسی بجاؤ۔ اس میں پہلی قباحت تو یہی تھی کہ بنسی خواہ چین ہی کی ہو، عمر بھر بجانا مشکل ہے۔ دوسرے جب کوئی رئیس ملا تو فرزندی کا ذکر درمیان میں نہ لایا اور اگر کوئی یہ ذکر درمیان میں لایا تو پتہ چلا کہ وہ رئیس نہیں۔ ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی ہم نے ڈیل کارنیگی کی کتابوں سے رجوع کیا۔ اور گھر بیٹھے دولت مند بننے کے تجربے کیے اور دفتر کی میز پر بیٹھ کر معمّے

حل کرنے میں کمال حاصل کیا لیکن یہ داستان طویل ہے۔ پھر کسی موقع پر بیان ہو گی۔

مسئلہ بچوں کے ناموں کا

نومولود بچوں کے ناموں کا مسئلہ خاصا پریشان کن ہے۔ اتنے نئے نام کوئی کہاں سے لائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریڈیو پاکستان، زاہدان ریڈیو اور ریڈیو سیلیون کے فرمائشی پروگراموں سے خاصی مدد ملتی ہے۔ لیکن وہ چند سو ناموں تک محدود ہے۔ پرانے زمانے میں یہ مسئلہ پیش نہ آتا تھا۔ کیونکہ لوگوں کے نام عبدالغنی، عبدالغفور، سراج دین، فاطمہ بیگم، سکینہ خاتون اور رحمت بی بی وغیرہ ہوتے تھے۔ ان کا لامتناہی ذخیرہ اب بھی موجود ہے۔ قلّت صرف نئے ناموں کی ہے۔ ہر کوئی اپنے بیٹے کا نام صریرِ خامہ اور بیٹی کا نام نوائے سروش رکھنا چاہتا ہے۔ اساتذہ کے

دیوان بھی آخر کہاں تک ساتھ دے سکتے ہیں۔ فیملی پلاننگ پر جو ہمارے ملک میں اتنا زور دیا جا رہا ہے، اس میں صرف یہی ایک حکمت نہیں کہ خوراک کا توڑا نہ ہو جائے، ناموں کے توڑے کا بھی مسئلہ ملحوظ ہے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

بہت دن ہوئے ایک صاحب ہمارے پاس بھاگے بھاگے تشریف لائے کہ کوئی نام سبکتگین اور الپتگین کے قافیے کا بتاؤ۔ ہم نے کہا خیریت؟ بولے میں نے اپنے تاریخی ذوق کی بنا پر اپنے دو صاحبزادوں کے یہ نام رکھے تھے۔ بس غلطی کر گیا۔ یہ نہ سوچا کہ اللہ تعالی کی رحمت بے پایاں ہے۔ ورنہ خاندان سبکتگین کی بجائے خاندانِ مغلیہ کا انتخاب کرتا، جس میں بابر اور ہمایوں سے لے کر رفیع الدّولہ اور رفیع الدرجات تک کی گنجائش ہے۔ ہم نے پوچھا رنگ کیسا ہے صاحبزادے کا؟ معلوم ہوا باپ کی طرح کا ہے۔ ہم نے سرمگین کا لفظ تجویز کیا۔ وہ انہیں پسند نہ آیا غمگین، اندوہگین پر ان کو یہ اعتراض تھا کہ فالِ بد ہے۔ حالانکہ انہیں میں سے کوئی بڑا ہو کر نالائق نکل جائے یعنی شاعر بن جائے اور اپنے لیے رنجور، الم، افسوس، حسرت وغیرہ تخلّص اختیار کر لے تو کوئی نہیں روکتا۔ رنگین، تماشبین، دوربین، خوردبین وغیرہ بھی ہمارے ذہن میں آئے لیکن ہمارے دوست کا اطمینان نہ ہوا۔

اگلے روز ان کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک طرف میز پر عربی، فارسی اور ترکی لغت رکھے ہیں، دوسری طرف فیملی پلاننگ کے لٹریچر کا ڈھیر ہے۔ کبھی اسے دیکھتے ہیں کبھی اس پر نظر کرتے ہیں۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔

ہمارے ہاں ناموں کا ایک انداز یہ ہے کہ انگریزی کا قاعدہ سامنے رکھا اور اس کے حروف تہجّی میں سے ایک دو کو چمٹی سے اٹھا کر اس کے بعد خان، احمد یا دین وغیرہ لگا لیا۔ اے احمد، بی احمد، زیڈ خان وغیرہ حتیٰ کہ شہروں اور عہدوں کے ناموں کا مسئلہ بھی اسی طرح حل کیا گیا ہے۔ ابھی کل ہم نے پڑھا کہ ڈی آئی خان میں مسٹر این ایم احمد نے پی ڈبلیو ڈی کے ایس ڈی او کا عہدہ سنبھالا۔ جن بچوں کے نام والدین نے پرانی وضع کے رکھے ہیں وہ بھی احتجاجا گاتے پھرتے ہیں کہ نام ہمارا ہوتا ڈبلیو ڈبلیو خان اور کھانے کو ملتے لڈّو۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" ہمارے ادب میں ل احمد اور ن م راشد پہلے ادیب تھے جنھوں نے اُردُو کے قاعدے کی سرپرستی کی۔ ہمارے بزرگ اور مہربان اے ڈی اظہر صاحب اب اس عمر میں آخر مسلمان ہوئے ہیں یعنی خود کو الف دال اظہر لکھنے لگے ہیں۔ بہر صورت یہ بھی ان کی اُردُو دوستی پر دال ہے۔ اُردُو

حروفِ تہجّی میں ایک قباحت البتہ ضرور ہے۔ آپ احمد دین کو الف دین تو لکھ سکتے ہیں۔ بدر الدین کو ب دین نہیں لکھ سکتے۔ پڑھنے میں ازالہ حیثیت عرفی کا اندیشہ ہے۔

ڈبلیو خاں وغیرہ ناموں پر کئی بار ہمیں دھوکہ ہوا شائد لوگ مسیحی ہیں اور کسی میونسپٹی کے محکمہ صفائی میں نوکر ہیں۔ ہمیں اپنے مسیحی بھائیوں کی صلح کل روش پسند ہے کہ نہ مشرق کو ناراض کرتے ہیں اور نہ مغرب کو۔ سموئیل گنڈا سنگھ، جوزف خیر دین اور رابرٹ نتھے خاں قسم کے نام ان کے ہاں عام ہیں۔ ہماری گلی میں جو صاحب جھاڑو دیتے ہیں، ان کا نام ہے جارج گھسیٹے خان اور اندرونِ خانہ صفائی کا چارج مس الزبتھ بدھو رام کے پاس ہے۔ ان کے نام سن کر سلطنتِ انگلشیہ مرحوم کی عظمت و سطوت یاد آتی ہے جس میں یہ لوگ بھی برابر کے شریک تھے۔ آزادی سے پہلے جب کانگریسیوں نے 'ملک چھوڑ دو' کی مہم چلائی اور روزانہ جلسے جلوس کا غوغا ہونے لگا تو ایک روز پنجاب کے کسی شہر میں دو بزرگ اس قوم کے ایک کا نام پیٹر دوسرے کا نام پال، بڑے انہماک سے کوڑے کی ڈھیریوں کو جھاڑو سے سڑک پر پھیلا رہے تھے کیونکہ پورے رقبے پر کوڑے کو یکساں تقسیم کرنے سے سڑک

نسبتاً صاف معلوم ہونے لگتی ہے۔ اتنے میں ایک طرف سے نعروں کی آواز آئی۔ ایک نے ان میں سے ٹھٹک کر پوچھا۔ "اوے پیٹر ایہہ کی ہو رہیا اے" یعنی یہ کیا ہو رہا ہے۔ دوسرے نے جھاڑو سے ٹیک لگا کر غور سے سنا اور کہا۔ "اوے پال! ہونا کی اے۔ ایہہ لوگ اجادی منگدے پے نے، تے اسیں دیندے نئیں۔" یعنی اے برادر ہونا کیا ہے۔ یہ لوگ آزادی مانگ رہے ہیں اور ہم دے نہیں رہے۔

ناموں کی قلت کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ جو نام انسانوں کے ہونے چاہئیں وہ محکمہ ریلوے نے اپنے اسٹیشنوں کے رکھ لیے ہیں۔ رحیم یار خاں، راجہ رام، ہیرا سنگھ وغیرہ۔ سندھ میں ایک اسٹیشن کا نام تو مع القاب کے ہے، نواب ولی محمد خاں۔ ہمارے ایک دوست بیان کرتے ہیں کہ مجھے ایک روز وہاں جانا تھا۔ ٹکٹ بابو سے کہا کہ "مجھے نواب ولی محمد خاں کا ٹکٹ دو۔" اس نے کہا۔ "آپ کون ہوتے ہیں۔ کیا نواب صاحب کے اردلی ہیں؟ ہمارے ایک آدمی کو ان کے ہاں نوکر رکھوا دیجئے گا۔" میں نے کہا "یہ کسی آدمی کا نہیں، اسٹیشن کا نام ہے۔" بولے "اچھا؟ معاف فرمائے گا۔" نتیجہ اس حیص بیص کا یہ نکلا کہ گاڑی نے سیٹی دی اور ہمارے دوست کے دیکھتے دیکھتے چھوٹ گئی۔

سوچا جائے تو راہِ مضمون تازہ والی بھی بند نہیں۔ نقشِ فریادی کسی ایسے بچّے کا نام ہو سکتا ہے جو روتا بہت ہو اور لمبی ناک والی بچی کو مرقع چغتائی کا نام دے سکتے ہیں۔ زیادہ لمبے بالوں والی صاحبزادی کو بالِ جبریل کہنے میں ہرج نہیں۔ اور اگر کسی لڑکے کا نام ضربِ کلیم رکھا جائے تو بڑا ہو کر حساب میں یقیناً ہوشیار نکلے گا۔ ہمارے دوست انتظار حسین کی شادی بعد بے شمار انتظار کے سال گزشتہ عالیہ بیگم سے ہوئی ہے۔ ان کو تو نہیں ان کے دوستوں کو فکر ہے کہ اس جوڑے کے بچوں کے نام کلاسیکی قسم کے ہونے چاہئیں۔ ہم نے بچے کے لیے فسانۂ آزاد اور بچی کے لئے طلِسم ہوش رُبا تجویز کیا تھا۔ لیکن لوگ مطمئن نہ ہوئے۔ آخر اتفاق اس پر ہوا کہ لڑکا ہو تو ادبِ عالیہ کہلائے اور بچی ہو تو شبِ انتظار۔

خطبہ حضرت بھینس الملک

ایک بہرے میاں ایک صاحب کی عیادت کو گئے۔ راستے میں سوچتے گئے کہ وہاں کس قسم کی گفتگو ہو گی۔ میں پوچھوں گا کہ اب کیسی طبیعت ہے؟ کیا کہے گا کہ الحمدللہ اچھی ہے۔ میں پوچھوں گا معالج کون ہے؟ وہ کسی ڈاکٹر یا حکیم کا بتائے گا۔ اس پر میں کہوں گا کہ اچھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں شفا ہے۔ پھر میں پوچھوں گا کہ کھانے کو کیا بتایا ہے؟ بیمار جواب دے گا کہ دال کھچڑی، کیونکہ عموماً بیمار کو یہی بتایا جاتا ہے۔ میں کہوں گا مناسب، وغیرہ۔

چنانچہ حضرت نے جاتے ہی علیک سلیک کے بعد بیمار کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ بہت بری حالت ہے مر رہا ہوں۔ بہرے میاں بولے الحمد للہ۔ علاج کس کا ہے؟ بیمار نے چڑ کر کہا۔ ملک الموت کا، یہ بولے خوب۔ بڑا تجربہ کار معالج ہے۔ کھانے کو کیا بتایا ہے؟ بیمار بالکل ہی جل کر بولا۔ ''خاک۔'' بہرے میاں نے کہا، بہت مناسب ہے بس یہی کھاتے رہے۔ اچھا خدا حافظ۔

یہ قصّہ جو مثنوی مولانا روم کا ہے ہمیں اس لیے یاد آیا کہ لاہور میں گزشتہ ماہ کچھ اس سے ملتی جلتی واردات ہوئی ہے۔ ایف سی کالج نے اپنی جوبلی کی تقریب کی صدارت اور ایک نئے بلاک کے افتتاح کے لیے ایک بہت مشہور آدمی کو بلانے کی تجویز کی۔ جس کا نام آپ کچھ فرض کر لیجیے۔ چلئے اے بی خاں سہی۔ یہ بہت لائق فائق ہستی ہیں۔ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہے ہیں۔ تعلیمات کا بھی بڑا کام کیا ہے۔ اور ان کو بلانے کی تقریب یہ تھی کہ اس کالج کے اولڈ بوائے یعنی بڈھے بچے تھے۔ کونسل نے چٹھّی لکھی کہ آپ جوبلی کے جلسے کی صدارت کر کے ہماری عزّت افزائی فرمایئے اور طلبہ سے خطاب کیجئے۔ چٹھّی دفتر میں پوسٹ کرنے کے لیے دے دی گئی۔ بعد میں دفتر والوں نے پرنسپل صاحب کو بتایا کہ اے بی خاں صاحب نے

بطیّب خاطر آنا اور افتتاح کرنا منظور کر لیا ہے۔ ان کا خط ہم نے فائل میں لگا دیا ہے آپ تیاری کیجئے۔ چنانچہ تیاری شروع ہوئی۔ ایک زناٹے کا خطبہ استقبالیہ لکھا گیا کہ ''آپ کی ذات گرامی ملک ہی کے لیے نہیں، ہمارے کالج کے لیے بھی باعثِ فخر ہے۔ آپ نے وہ کام کیا جو رستم سے نہ ہو گا۔ ملک بھر میں تعلیم کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ جا بجا کالج اور کتاب گھر قائم کر کے نور کی روشنی پھیلانا آپ ہی کا کام تھا۔ انگریزی ڈرامے پر آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ولایت کی کتابوں کی ٹکر ہے۔ آپ نے اور آپ کی بیگم نے ملک میں ادبی ذوق کو عام کرنے میں بڑا حصّہ لیا۔ یوں آپ کے والد بھی بڑے نامور شاعر تھے۔ لیکن آپ نے تو بالکل ہی کمال کر دیا وغیرہ۔''

جلسے کے روز بڑے اہتمام سے لوگ ہار لے کر دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ وقت معینہ پر ایک کار آئی جس میں سے ایک کالا کلوٹا بینگن لوٹا آدمی نکلا۔ اور ہار والے آدمی کے پاس جا کر بولا۔ ''لایئے ڈالیے ہار۔'' پرنسپل صاحب نے پوچھا۔ یہ تو اے بی خاں صاحب کے لیے ہیں۔ اس شخص نے جیب سے کالج کی چٹھّی نکال کر دکھائی اور کہا۔ ''بندہ اے بی خاں ہی تو ہے۔ میں ضلع فلاں میں اسٹنٹ وٹرنری سرجن ہوں۔ وہاں سے سیدھا آ رہا ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے اولڈ بوائے

ہونے کے ناطے یہاں بلایا اور یہ عزّت بخشی ورنہ من آنم کہ من دانم۔ یہ رہا میرا خطبۂ صدارت۔ اسے حاضرین میں تقسیم کر دیجیے۔" اس کے بعد جیب سے ایک قینچی نکالی اور کہا۔ "کہاں ہے فیتہ جسے کاٹنا ہے۔ جلدی کیجئے۔ مجھے واپس جا کر ایک بیل کا آپریشن بھی کرنا ہے۔"

پرنسپل صاحب اور دوسرے لوگ سن ہو کر رہ گئے لیکن کیا کر سکتے تھے۔ کیونکہ تھے یہ بھی آٹھوں گانٹھ اے بی خاں، اور اس میں شک نہیں کہ اس کالج کے اولڈ بوائے بھی تھے۔ قہرِ درویش ان کو لے جا کر کرسئ صدارت پر بٹھایا۔ پرنسپل صاحب نے اپنا خطبہ استقبالیہ تہہ کر کے رکھ دیا۔ اور بے دلی سے زبانی کچھ کلمات ادا کئے۔ اب صاحب ممدوح کی باری تھی۔ انہوں نے بڑے دھڑلے کی تقریر کی کہ آج کل ملک کی سب سے بڑی ضرورت تندرست مویشی ہیں۔ لوگ اور باتوں کی طرف تو دھیان دیتے ہیں، کالج قائم ہو رہے ہیں، کارخانے لگ رہے ہیں، خارجہ پالیسی ٹھیک ہو رہی ہے لیکن افسوس کہ مویشیوں کی بیماریوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ خود میرے ضلع میں بیس فیصدی بھینسیں اپھارے کا شکار ہیں۔ اے نوجوانو، اس مرض کا انسداد ضروری ہے۔ اٹھو وگرنہ حشر نہ ہو گا پھر کبھی۔ دوڑو

زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پانی کا ایک گلاس پی کر رشتہ تقریر کو یوں جوڑا کہ "آپ لوگوں کو میری ذات سے سبق لینا چاہیے۔ ہر چند کہ میرا شمار اس کالج کے نالائق ترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ لیکن آج میں اس تقریب کی صدارت کر رہا ہوں۔ پڑھائی اور چیز ہے لیاقت اور چیز ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی کو ایک کار کے وقف کر دیا ہے۔ اور وہ ہے مویشیوں کی بہبود۔ مجھے خوشی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دی۔ ابّا مرحوم اور دادا مرحوم اپنے اپنے زمانے کے نامور سلوتری تھے۔ ان کے ہاتھ میں شفا تھی۔ جس گھوڑے یا گدھے پر ہاتھ رکھ دیا وہ تندرست ہو کر ہنہنانے لگا۔ یہی حال میرا ہے۔ میرے کالج کو میری قدر افزائی کا خیال بڑی دیر سے آیا لیکن آیا تو۔ دیر آید درست آید۔ اب اے عزیز طالب علمو، میری نصیحت پلے باندھ لو۔ مویشی پالو کیوں کہ مویشی قومی دولت ہیں۔"

تقریر کے آخر میں صاحب ممدوح نے کالج کے ہوٹل کے لیے ایک دودھیل بھینس کے عطیے کا اعلان کیا اور فرمایا کہ اسے میری نشانی تصوّر فرمایئے۔ جب آپ اسے دیکھا کریں گے، میری یاد تازہ ہو جایا کرے گی۔ صدارت کے خطبے ہمیشہ علامہ

اقبال مرحوم کے اشعار پر ختم ہوتے ہیں۔ ان صاحب نے بھی بیٹھنے سے پہلے حکیم الامت کے ایک حسبِ حال شعر کا سہارا لیا۔

جلسہ ختم ہوا۔ مہمانِ خصوصی رخصت ہو گئے۔ ڈاک بھیجنے والا کلرک معطل ہوا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ پرنسپل صاحب نے ہر چند کہ خطبہ استقبالیہ تہہ کر کے رکھ دیا تھا لیکن چونکہ وہ چھپا ہوا تھا اس لیے کالج کے دفتر نے تمام اولڈ بوائیز کو ڈاک میں بھیج دیا۔ کچھ دن کے بعد انہیں اے بی خاں صاحب کا عتاب آمیز خط آیا کہ آپ لوگ اچھے آدمی ہیں۔ بلاتے مجھے ہیں خطبہ استقبالیہ میں کسی اور شخص کی تعریف کرتے ہیں۔ جایئے میں نہیں دیتا بھینس ایسے ناشکروں اور نالائقوں کو۔

ایک انار و صد بیمار

ہمارے ملک میں ڈاکٹروں کی کمی ہے۔ کراچی جیسے ترقّی یافتہ شہر میں بھی سات سو آدمیوں کے پیچھے ایک ڈاکٹر کی اوسط ہے۔ جب کہ مغرب کے ملکوں میں ہر سو پچاس پر ایک ڈاکٹر ہوتا ہے۔ ایسے بھی دیس ہیں جن میں ہر پانچ سات آدمیوں کے پیچھے ایک ڈاکٹر ہے بلکہ ایک آدھ ملک تو ایسا بھی سنا ہے جہاں ایک ایک آدمی کے پیچھے دو دو ڈاکٹر ہیں۔ جدھر وہ جاتا ہے یہ اپنے تھیلے لٹکائے پچکاریاں بھرے ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔ دونوں کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ مجھ سے علاج کرائے۔ اگر مریض ایسا ہی ڈھیٹ ہوا کہ بہت دن بیمار نہ ہو تو ان ڈاکٹروں ہی میں سر پھٹول ہو

جاتی ہے اور پھر یہ دونوں بیٹھ کر ایک دوسرے کی مرہم پٹّی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو فیس دیتے ہیں اور یوں ان کا گزارہ چلتا ہے۔

بہرحال ہمارے لیے یہ ترقّی کی منزل ابھی دور ہی ہے۔ افق کے اس پار ہے۔ ہمارے ہاں تو بیماروں کے لیے ڈاکٹروں کا ابھی اتنا اوسط بھی نہیں جتنا اناروں کا ہے۔ محاورے میں ایک انار وصد بیمار آتا ہے جو یک ڈاکٹر ہفت بیمار کے مقابلے میں خاصی اونچی مقدار ہے۔ اسی لیے تو ڈاکٹر جتنوں کا علاج کر سکتا ہے کرتا ہے، باقی انار کھاتے ہوئے مر جاتے ہیں۔ دنیا سے سفر کر جاتے ہیں۔

ایک بزرگ جنھوں نے پچھلے دنوں کراچی میں عطائیوں کی مردم شماری کی ہے فرماتے ہیں کہ صحیح محاورہ یک اناڑ وصد بیمار ہے اور اناڑ دراصل اناڑی کا مخفف یا اسم مکبّر ہے۔ یہ بات ہمارے بھی جی لگتی ہے۔ کیونکہ کراچی قندھار تھوڑا ہی ہے جو انار کے ذکر کا موقع ہو۔ پھر انار ہم نے فقط دو طرح کے دیکھے ہیں۔ سفید دانوں والے اور سرخ دانوں والے لیکن اناڑ یا عطائی ہزار رنگ اور ہزار شیوہ ہوتے ہیں۔ ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، فٹ پاتھی، حکیم وید، عامل، کامل، منجم، جفار، طبِ چین والے، طبِ جاپان والے، تعویزوں والے، انگوٹھیوں والے ان سب کو ملا لیا جائے

تو ہمارے خیال میں فی کس ایک کی اوسط پڑے گی۔ یعنی جتنے بیمار اتنے انار بلکہ کیا عجب دو کی پڑ جائے یعنی ایک کا دارو دو۔ اس ریل پیل کے ہوتے اگر ڈاکٹر کم بھی ہیں تو ہرج کی کچھ بات نہیں۔ قبرستان کی آبادکاری ہی تو منظور ہے تو دیر سویر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مخدومی حضرت حفقط جالندہری کے الفاظ میں۔

ناکامی عشق یا کامیابی! دونوں کا حاصل، خانہ خرابی

خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی۔ کچھ لوگ ڈاکٹروں کے ہاتھوں مرنا پسند کرتے ہیں، کچھ حکیموں کے ہاتھوں۔ کچھ ایک سے مایوس ہو کر دوسرے کو آزماتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں ایک بزرگ تھے۔ بیماری تو ان کو جانے کیا تھی، شاید گیس کی تھی۔ معدہ ان کا سوئی گیس کی ٹنکی بنا ہوا تھا۔ لیکن سارا سارا دن فار کو ماپیا اور حکمت کی کتابیں لیے اپنے مرض کے نئے نئے نام تلاش یا ایجاد کرتے رہتے تھے۔ پہلے ڈاکٹروں سے رجوع کیا، ان سے کچھ نہ ہوا۔ پھر ہومیوپیتھوں کے پاس گئے، وہ بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ حکیموں کے جوشاندے اور خیساندے بھی ان کے مرض زیست کا مداوایا ازالہ نہ کر سکے۔ آخر فٹ پاتھ کے ایک سنیاسی بابا نے اپنے خاندانی ٹوٹکے سے ان کی مشکل آسان کی۔ کچھ گولیاں دیں جو ہمارے خیال میں بارود کی تھیں اور ایک شیشی

عرق کی تھی جو نستورے کے تیزاب کا اثر رکھتا تھا بلکہ شاید شورے کا تیزاب ہی تھا۔ ان بزرگ نے رات کو ایک ہی خوراک استعمال کی تھی کہ دوسرے دن کی ہمیں دفتر سے چھٹی لینی پڑی۔ آخر اتنے قدیمی ہمسائے کے جنازے کو کندھا تو دینا ہی تھا۔ ایک طرف ہم تھے۔ دوسری طرف سنیاسی بابا تھے۔ واپس آ کر ہم نے اپنے کندھے پر مالش کرنے کے لیے سانپ کی چربی بھی انہی بابا جی سے لی تھی۔

ہم نے جب بھی کسی پیشہ ور سے متعلق کالم لکھا یہی جواب ملا کہ ہم چونکہ اس کے ہم پیشہ نہیں ہیں اس لیے جلتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے ہمیں یہی طعنہ دیا۔ نقّادوں نے ہم پر یہی حرف رکھا۔ اب شائد عطائی بھی یہی کہیں کہ ہم چونکہ عطائی نہیں اس لیے ان سے جلتے ہیں، ان کی قدر نہیں کرتے۔ ان کا یہ کہنا زیادتی ہو گا۔ ہم باقاعدہ اشتہار نہیں دیتے یا اپنے نام کے ساتھ مخر الاطبا یا بنگالی بابا نہیں لکھتے تو اس کی وجہ ہماری طبیعت کا انکسار ہے یا پھر یہ بات ہے کہ ابھی ہمارے سامنے روز گار کے ایسے راستے ہیں جو سیدھے سیدھے قبرستان نہیں جاتے پالے جاتے ورنہ حکیمی علاجوں اور ٹوٹکوں سے ہماری بیاض بھی خالی نہیں۔ ہمارے رفیق کار میاں رفیق الدّین کے گھٹنے پر معمولی سی پھنسی نکلی تھی۔ ہم نے اس کے لیے مرہم دیا تو وہ پھوڑا بن گئی۔ اس پر

ایک پوڈر چھڑکنے کو دیا تو اس کے آس پاس کچھ اور پھوڑے نکل آئے۔ آخر ان کے عزیزوں نے انہیں ہسپتال میں داخل کیا، وہاں آپریشن ہوا اور تین چار مہینے ہی میں وہ بھلے چنگے ہو کر آ گئے۔ ہم دوا انہیں نہ دیتے تو ان کو آپریشن کی نوبت کیسے آتی اور انہیں صحت تام کیسے عطا ہوتی۔ یہ باریک باتیں ہمارے قاری تو سمجھ لیتے ہیں لیکن ان کے عزیزوں کی سمجھ میں نہ آئیں۔ پچھلے دنوں انہیں کھانسی ہوئی تھی۔ ہم نے نسخہ لکھ دیا کہ آم کے اچار میں چند قطرے گندھک کے تیزاب کے ڈال کر تولہ بھر افیم کے ساتھ چٹ کر جاؤ، مرض جڑ سے اکھڑ جائے گا۔ وہ تو راضی ہو گئے تھے لیکن کسی کیمسٹ یا عطار نے نسخہ نہ بنا کر دیا۔ کسی کے پاس آم کا اچار تھا تو گندھک کا تیزاب نہ تھا۔ گندھک کا تیزاب تھا تو افیم نہ تھی۔ پھر ان عزیز کے ایک بڑے بھائی ٹیڑھی طبیعت کے تھے۔ فرمانے لگے آپ کیسے معالج ہیں۔ ہمیں مرض کو جڑ سے اکھاڑنا مقصود ہے، مریض کو نہیں۔ اب انہیں کیسے سمجھاتے کہ ضرب مرض کی جڑ پر لگانی چاہیے۔ اگر مریض مذکور نہ ہوتے تو کھانسی کہاں سے آئی۔ معمولی دواؤں سے آج ان مریض کی کھانسی رفع ہو جائے تو کل کچھ اور ہو جائے گا، بخار ہو جائے

گا۔ پھر وہ دوا کے لیے بھاگتے پھریں گئے۔ پرانے زمانے کے حکما پائیدار علاج کیا کرتے تھے۔ آج کل تو تھمپو کرنے کا رواج ہے۔

خیر بہت سے محلّے والے ہمیں بھی عطائی یا عطا الاطباء کہنے لگے۔ اس لحاظ سے اس میں کچھ غلطی بھی نہیں کہ ہمارے تمام تر نسخے اور ٹوٹکے ایک سنیاسی بابا کا عطیہ ہیں جو جیل جاتے ہوئے ہمارے سپرد کر گئے تھے۔ جیل ان کو اس پاداش میں ہوئی تھی کہ انہوں نے ایک مریض کا حکیمی علاج کیا تھا اور حکیمی علاج میں تو یہی ہوتا ہے کہ اللہ کا حکم ہو تو مریض بچ جاتا ہے ورنہ۔۔۔ ہمارے عطائی بھائی ایک یہ نسخہ اپنی گرہ میں باندھ لیں کہ علاج صرف ایسے مریضوں کا کیا کریں جن کے قریبی رشتہ دار پولیس میں نہ ہوں۔ عاقلوں کے لیے اشارے کافی ہوتے ہیں۔

پچھلے دنوں کراچی کے اخباروں میں ایک حکیم صاحب کا مضمون چھپا کہ کراچی والوں کو مرچیں کھانی چاہیں۔ ہم نے تو اس روز ایک بوری منگالی اور کھانی شروع کر دیں لیکن ان کے بعض حریفوں کے مرچیں لگیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ مرچ تو بڑی ستیاناسی چیز ہے۔ اس آخری بیان کے خلاف ایک طرف مرچوں کے بیوپاریوں نے احتجاج کیا دوسری طرف بواسیر کا علاج کرنے والوں نے بُرا منایا کہ یہ

ہماری روزی مارنے کی ناروا کوشش ہے۔ ادھر ہم حیران ہیں کہ مرچوں کی باقی بوری کا کیا کریں۔ ڈاکٹروں میں اس قسم کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب کو نمونیہ تشخیص ہوا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے کہا اس کو لحاف اوڑھاؤ، اس کے آگے انگیٹھی رکھو۔ دوسرے نے کہا ارے یہ کیا کرتے ہو۔ اس کے سینے پر برف رکھو۔ وہ مریض مر گیا۔ اب یہ دونوں ڈاکٹر اس کا کریڈٹ ایک دوسرے کو دے رہے ہیں۔ ہم اس جھگڑے میں کیوں پڑیں۔ ہمارے نزدیک تو دونوں سچے ہیں۔

اخبار میں آیا ہے کہ کراچی کی بکرا پیڑھی میں ایک ڈاکٹر ہے کہ خود کو M-B-D-M-S لکھتا ہے۔ جانے اس کا کیا مطلب ہے۔ بکرا پیڑھی کے حوالے سے ہمارا قیاس یہ ہے کہ کوئی قصاب ہو گا۔ بقر عید کا کاروبار تو چند روز کا کاروبار ہے۔ اتنے دنوں خالی کیوں بیٹھے۔ الٹی چھری سے مریضوں کو کیوں نہ ذبح کرے۔ ممکن ہے کہ D کا مطلب ڈنگر ہو۔ دوسرے ڈاکٹر کے متعلق اس اخبار کا بیان ہے کہ اس نے اپنے نام ڈاکٹر فلاں الدّین کے نیچے موٹا موٹا لکھا ہے M-B-B-S لیکن نام اور ڈگری کے درمیان خفی لفظوں میں رقم ہے BETTER THAN یعنی بہتر از۔ اس سے معلوم ہو گا کہ ہمارے ہاں ایمانداروں کی کمی نہیں۔

پشّے سے سیکھے شیدہ مردانگی کوئی

جب قصد خون کو آئے تو پہلے پکار دے

دعوتوں پر پابندی (۲)

مغربی پاکستان کی حکومت نے دعوتوں میں کھانے پلانے کے لیے دو سو مہمانوں کی پابندی لگا دی ہے۔ اس پر بعض لوگ بہت پریشان ہیں۔ ایک صاحب نے کہا۔ ”غریب آدمی ہوں۔ لڑکی کی شادی کر رہا ہوں اور پچیس تیس آدمیوں کو بلانے کا ارادہ تھا۔ لیکن اب حکومت دو سو پر اصرار کر رہی ہے۔ کیا کروں؟“ ہم نے انہیں سمجھایا کہ کہیں سے دو سو تک پورے کرو۔ قانون کی پابندی تو لازمی ہے۔“ لیکن اس نے استطاعت کا عذر کیا۔ ایک بار ایک ڈرائیور بھی چالیس میل کی رفتار سے بس دوڑاتا پکڑا گیا تھا۔ یہ کراچی سے باہر کی بات ہے۔ حاشا وکلا کراچی میں اس پر

روک ٹوک نہیں۔ سنتری نے چالان کی کتاب جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بورڈ نہیں دیکھا جس پر لکھا ہے کہ حد رفتار پچیس میل۔“ بولا جناب میں اسی احتیاط کے چکر میں تو پکڑا گیا ہوں کہ رفتار پچیس میل کی حد سے نیچے نہ آنے پائے۔

دوسری طرف وہ لوگ پریشان ہیں جنہوں نے پانچ پانچ سو آدمیوں کو بلا رکھا تھا۔ اب جو تخفیف کا کلہاڑا کھٹ سے آن گرا تو حیران ہیں کہ کس کو بلائیں کس کو منع کریں۔ قانون سے بچنے کے طریقے تو بہت ہیں۔ لوگ خود سمجھدار ہیں۔ ہمارے بتانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو لوگ ذرا پابندِ قانون ہیں، پھر کارڈ چھپوانے کے لیے پریسوں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ خود ہمارے پاس کل ایک کارڈ آیا۔ باہر تو اس کے نویدِ مسرت ہی لکھا ہے۔ اندر کا مضمون یہ ہے۔

”عزیزی سیلقہ خاتون کے میاں دولت بخش سے نکاح کی خوشی میں اتوار کو غریب خانے پر ولیمے کا انتظام کیا گیا ہے۔ براہِ کرم شرکت نہ فرما کر ممنون فرمائیں۔“

یہ احتیاط تو خیر میزبان نے کی ہے، مہمانوں کو بھی احتیاط لازم ہے۔ ہم نے سرکاری حکم نامہ تو پابندی کا نہیں پڑھا لیکن ایسا بھی تو ممکن ہے کہ پولیس چھاپا مارے تو میزبان صاف کہہ دے کہ جناب کھانے والے تو یہ لوگ ہیں ان کو لے جایئے جہاں

لے جانا ہے۔ میرا تو انہیں بلانا فرض تھا۔ خود ان لوگوں کو تو عقل چاہیے تھی۔ انہوں نے تو اخبار میں پابندی کا آرڈر ضرور پڑھا ہو گا۔ چلے آئے ہیں مفت کی کھانے۔

ہم نے غور سے تو نہیں پڑھا کہ کس کس قسم کی دعوتوں اور کس کس قسم کے کھانے پر پابندی لگی ہے۔ ہم کبھی کبھی مرزا غالب کی یاد میں دعوتِ مژگاں کیا کرتے ہیں، اس میں اناج کا کوئی کام نہیں۔ فقط گوشت یعنی جگر لخت لخت درکار ہوتا ہے۔ منگل اور بدھ ناغے کے دن ہیں۔ اس میں ہم خود احتیاط کر لیتے ہیں۔ امید ہے نئی سرکاری پابندی کا اطلاق اس پر نہ ہو گا۔ آج کل رمضان کے دن نہیں ورنہ روزہ خور بھی پریشان ہوتے۔ ہم بزمِ ادب لالوکھیت کی طرف سے ایک مشاعرہ بھی کرا رہے ہیں اور شعرا کرام کے لیے تین سو دعوت نامے چھپوا لیے تھے کہ آیئے اور اپنا کلام گا کر خود خوش ہویئے، دوسروں کو خوش کیجئے۔ یک لخت آرڈر پہنچا کر خبر دار اگر دو سو سے زیادہ آدمی مدعو کیے۔ کیونکہ شاعری اور موسیقی کا شمار روحانی غذا میں ہے۔ پیشہ ور غمخواروں کو بھی سوچ سمجھ کر کہیں جانا چاہیے۔ سنا ہے شہر میں کل ایک میّت ہو گئی تھی۔ ایک چھوٹے موٹے قومی لیڈر انتقال کر گئے تھے اور لوگ صفیں بچھائے

بیٹھے غم کھا رہے تھے۔ ایک سرکاری کارندے کا گزر ادھر سے ہوا۔ پوچھا کیا بات ہے؟ ایک صاحب نے کیفیّت بتائی۔ کارندہ فرض شناس قسم کا تھا۔ اس نے گنا تو دو سو بیس آدمی تھے۔ بولا تم لوگوں کو قانون کی خلاف ورزی کرتے شرم نہیں آتی۔ دو سو سے زیادہ آدمیوں کو ایک ساتھ کچھ بھی کھانے کی اجازت نہیں۔ خواہ غم ہی کیوں نہ ہو۔ چلو تھانے۔

دعوتوں میں مہمانوں کی تعداد پر پابندی تو خیر کبھی کبھی لگتی ہے۔ دفعہ ۱۴۴ ایک عام بات ہے بلکہ اگر بہت دن نہ لگے تو تشویش ہونے لگتی ہے کہ جانے کیا بات ہے۔ اس کی زد میں تم ہوئے ہم ہوئے کہ میر ہوئے سبھی آتے ہیں۔ جہاں پانچ سے چھ آدمی ہوئے گرفتار۔ ایک بار پتنگ دیکھنے کے لیے چھ آدمی فٹ پاتھ پر ایک ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔ فوراً قانون کی زد میں آ گئے۔ ایک جگہ فلم قید دیکھنے کے لیے ٹکٹ گھر کے باہر قطار لگی تھی۔ پولیس والے پہنچ گئے کہ فلم پر پیسے کیوں ضائع کرتے ہو اصل قید خانہ بھی کچھ دور نہیں۔ ایک زمانہ میں تو اس دفعہ کی ہیبت لوگوں کے دلوں پر ایسی بیٹھی ہوتی تھی کہ پانچ سے چھ آدمی کھانے کی میز پر بھی نہ بیٹھتے تھے۔ ان ہی دنوں ایک بزرگ بھاگے بھاگے ہمارے پاس آئے تھے کہ پانچ بچے

ماشاء اللہ پہلے سے ہیں۔ بیوی زچہ خانے میں ہے۔ تھانے والوں سے کہا کہ تعرض نہ کریں۔ اس زمانے میں ہمیں خیال آیا تھا کہ اگر یہ دفعہ صحیح معنوں میں اور ذرا وسعت دے کر نافذ کی جائے تو فیملی پلاننگ کے محکمے کی ضرورت نہیں۔ فیملی پلاننگ والے تو درخواستیں کرتے اور استدعائیں کرتے پھرتے ہیں۔ تعدد اولاد پر دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق ہونے لگا تو خود ہی پولیس والے صورتِ حال سنبھال لیں گے۔

کوڑے والی گلی سے کوچہ ابن انشا تک

ایک انگریزی اخبار میں ایک خبر دلپذیر باتصویر شائع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوا ہے کراچی میں ایک سڑک کے دو دو نام ہیں اور ایک ایک نام کی دو دو سڑکیں ہیں۔ دو کی حد تک مضائقہ نہیں۔ ہم بھی گھر میں اس بچے کو جس کا نام اسکول میں مرزا نصیر الدّین جہاندار بیگ ہے، نونو کہہ کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور اپنے پرانے ہم سبق شیخ اسرار علی فاروقی قادری چشتی نظامی بلگرامی کو میاں مٹھو کہہ کے بلاتے ہیں کیونکہ اس زندگی مستعار میں کسی فانی انسان کے نام پر اس سے زیادہ وقت صرف کرنا ممکن نہیں۔ لیکن رپورٹر صاحب نے ایک سڑک ایسی ڈھونڈ نکالی ہے جس پر

تین مختلف ناموں کے ٹھپے ہیں۔ ایک جگہ "اِنگل روڈ" لکھا ہے کہ پرانا نام ہے۔ دس قدم پر "منیوالا روڈ" کا بڑا سا بورڈ نصب ہے۔ تھوڑا آگے چلیے تو اتنا ہی بڑا "شہید سرور روڈ" کا نشان ملے گا۔ اگر رپورٹر صاحب اپنی تحقیق کے بعد تھک نہ گئے ہوتے اور چائے پینے پریس کلب میں نہ داخل ہو جاتے جو اس سڑک پر واقع ہے تو عجب نہیں آگے ان کو اور بھی دو چار پھٹے دوسرے ناموں کے ملتے۔ خیر تین بھی بہت ہیں۔ اب تک فقط مایا کے تین نام ہوتے تھے۔ اب سڑک بھی محاورے میں آگئی۔

ایک سڑک کے تین تین نام۔ سٹر کا۔ سڑکو۔ سڑک رام

لیکن اسی کراچی میں ایسی سڑکیں اور ایسے کوچے بھی ہیں جن پر ایک بھی بورڈ نہیں۔ ہماری ہی گلی کو لیجیئے۔ اسے لوگ کوڑے والی گلی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ جمعدار لوگ ساری بستی کا کوڑا لا کر یہیں پھینکتے ہیں۔ بر محل ہونے کے باوجود یہ نام اچھا نہ لگتا۔ لہٰذا ایک روز اس امر کے اعتراف میں کہ ہم اُردُو کے مایہ ناز ادیب ہیں اور ہم نے قوم اور ملک کی بے لوث خدمت بھی بہت کی ہے ایک سِرے پر "کوچۂ حضرت ابن انشاء" کی تختی لگا دی۔ ہمارا مقصد نام و نمود ہر گز نہ تھا۔ کیونکہ اس سے ہم دور بھاگتے ہیں۔ فقط لوگوں کی رہنمائی مقصود تھی۔ لیکن دوسرے روز کیا دیکھتے ہیں کہ

کوچے کے دوسرے سرے پر گلی استاد امام دین پہلوان کا بورڈ لگا ہے۔ لوگوں کو خود تو کچھ سوجھتا نہیں ہاں نقل کے لیے ہوشیار ہیں۔ ایک تو ہماری طبیعت میں عفو روا داری اور در گزر کا مادہ بہت ہے۔ دوسرے معاملہ ایک پہلوان کا تھا لہٰذا ہم نے سوچا کہ کچھ مضائقہ نہیں۔ اعلان کرا دیں گے کہ ادھر پُل کی طرف سے آئے تو کوچہ حضرت ابنِ انشاء میں مُڑ جائے اور پاپوش نگر کے قبرستان کی طرف سے آئے (آپ کا زندہ ہونا شرط ہے) تو استاد امام دین پہلوان کی گلی کا نشان دیکھ لیجیے۔ لیکن پھر تو یہ ہوا کہ ہر شخص کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں کرسی کی ضرورت پڑ گئی۔ ہر شخص نے اس کوچہ کو اپنے نام نامی سے موسوم کرنے کا جتن کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ نبی بخش صدیقی داروغہ آب کاری کے گھر کے سامنے یہ گلی کوچہ شیخ نبی بخش صدیقی تھی اور جہاں ان کے گھر کی سرحد ختم ہوتی تھی وہاں ملک اللہ دتہ اسٹریٹ کا بورڈ لگا نظر آیا کیونکہ وہاں سے ملک اللہ دتہ تاجر چرم کا بنگلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس گھر سے کچھ آگے یہ گلی حوابائی حاجیانی روڈ بنی اور اس کا نام آگے چل کر گلی بندو خاں شیر فروش اور کوچہ فخر الاطبا حکیم سیّد ارشاد علی نشتر نظامی سہارن پوری ہو گیا۔ نشتر صاحب کے گھر سے آگے جن صاحب کا گھر تھا انہوں نے ذاتی نام و نمود کو برادری

کے مفاد پر قربان کیا اور اپنی لانڈری کی رعایت سے کوچہ دھوبیاں کا بورڈ لگایا۔ یہ بورڈ باقی سارے بورڈوں سے بڑا اور نمایاں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ نبی بخش صدیقی کے لڑکے کی منگنی ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی۔ اور آخر معزّزینِ کوچہ کے متفقّہ فیصلے سے یہ سب تختیاں اتار لی گئیں۔

دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے۔

آئین پر ہماری رائے تولی ہی نہیں گئی

نئے آئین کو اسمبلی نے منظور کر لیا اور لوگ باگ خوش خوش پھر رہے ہیں۔ جشن منا رہے ہیں۔ لیکن ہماری اطلاع کے مطابق ملک میں کم از کم چار افراد ایسے ہیں جن کو یہ آئین منظور نہیں ہے۔ ان میں ایک تو ہمارے راؤ صاحب ہیں جو اسمبلی کے اندر ہیں۔ باقی تین باہر ہیں۔ ان میں ایک بی بی ہیں بھاولپور کی، جن کا کہنا ہے کہ اسمبلی میں ۵۰ فیصدی عورتیں ہونی چاہیں۔ کیونکہ عورتوں کی آبادی ۵۰ فیصد ہے۔ دوسرے ہمارے بھتیجے پپو میاں ہیں، جن کا کہنا ہے کہ یہ اسمبلی آئینی نہیں ہے کیونکہ بالغ حقِ رائے دہندگی کی بنا پر بنی ہے، نابالغوں کو سراسر نظر انداز کیا گیا ہے۔

ان کا فرمانا ہے کہ اگر پچاس فیصدی نمائندگی مردوں کو اور پچاس فیصدی عورتوں کو دی جاتی ہے تو ڈیڑھ سو فیصدی کے قریب بچوں کو ملنی چاہیے جو فی خاندان تین کا اوسط ہے۔ اس آئین کو ناپسند اور نامنظور کرنے والے تیسرے اور آخری آدمی ہم خود ہیں۔ کیونکہ ہم نے ایک زمانے میں آئین کے لیے جو رہنما اصول پیش کیے تھے وہ اس میں شامل نہیں کیے گئے اور اگر شامل کیے گئے ہیں تو جملہ شرطیہ یعنی اگر مگر اور بشرطیکہ کے بغیر۔ حالانکہ یہی اگر مگر جمہوریت کی جان ہے اور ہر آئین و قانون میں ہوتی ہے تاکہ گلشن کا کاروبار چلتا رہے۔

ہمارے رہنما اصول جو ہم نے ۱۹۷۰ء کے وسط میں پیش کئے تھے اور اس زمانے کی حکومت کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ تھے حسب ذیل تھے۔

۱۔ کسی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر جیل نہ بھیجا جائے گا۔ تا آنکہ حاکم وقت ایسا کرنا ضروری نہ سمجھے۔۔!!

۲۔ تعلیم بالکل مفت ہو گی جب تک کہ بچہ گھر میں بیٹھ کر پڑھے۔ فیسوں اور چندوں کا سلسلہ پرائمری جماعت سے پہلے شروع نہ ہو گا۔ البتّٰہ نرسریاں

(پودوں والی نہیں بچوں والی) اور کنڈر گارٹن اسکول بچے کی تاریخ پیدائش ہی سے فیس وصول کرنے کے مجاز ہوں گے۔

۳۔ ہر فرد کے لیے روزگار کا بندوبست کیا جائے گا بشرطیکہ وہ کسی افسر یا سیٹھ کا عزیز اور قرابت دار ہو اور زیادہ پڑھا لکھا نہ ہوا۔

۴۔ جاگیریں اور زمینداریاں محدود کر دی جائیں گی، ان کے موجودہ مالکوں تک۔ کسان ہاری وغیرہ کسی قسم کا مطالبہ نہ کر سکیں گے۔

مزدوروں کو یونین بنانے کی آزادی ہو گی۔ بشرطیکہ وہ مالکان سے کوئی مطالبہ نہ کریں۔ موجودہ تنخواہ میں کام کرتے رہیں گے اور چھانٹی کی صورت میں شور نہ مچائیں۔

موجودہ آئین میں یہ ساری باتیں نامکمل صورت میں شامل ہیں یعنی اگر مگر بشرطیکہ تاآنکہ وغیرہ کے لوازم کے بغیر۔ بھلا ایسے آئین کو کون پسند کرے گا۔ سوائے غیر مفاد پرست طبقوں کے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک آئین بنانا ہمارا کل وقتی شغل رہا ہے۔ جن دنوں آئین نہ بن رہا ہو آئین بننے کی باتیں ہوتی ہیں اور جن دنوں باتیں نہ ہو رہی ہوں آئین بن ہو تا رہا

ہے۔ دوسرے ملک تو ایک آدھ آئین بنا لیتے ہیں، اس سے مدّت العمر کام لیتے ہیں۔ امریکہ نے اب تک ایک ہی آئین بنایا ہے، حالانکہ کاروں کے ماڈل ہر سال نئے لاتا ہے۔ ہندوستان بھی ترقی کے اتنے دعووں کے باوجود ایک سے زیادہ نہیں بنا پایا اور برطانیہ میں تو قاعدے کا ایک بھی آئین نہیں۔ وہ میگنا کارٹا ہی سے کام چلا رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں ایک آئین ۱۹۵۴ء میں بنا۔ ایک ۱۹۵۲ء میں، پھر ایک ۱۹۶۲ء میں۔ جناب یحییٰ خاں کے زمانے میں تو اور ترقی ہوئی اور آئین سازی کو گھریلو دستکاری کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ جہاں چار آدمی مل بیٹھنے پہلے تو تاش کی گڈی کی تلاش ہوئی۔ وہ نہ ملی تو آئین بنانا شروع کر دیا۔ چار تارے چرخ سے ٹوٹے چراغاں ہو گیا۔ الیکشن کے دنوں ایک مولانا ناظم آباد کے حلقے میں تقریر کر رہے تھے کہ "اے بھائیو۔ مجھے اسمبلی میں بھیجو تاکہ اسلامی آئین بنواؤں۔" ایک بدتمیز نے پوچھا۔ "حضرت قانون اور دستور کا فرق تو بتایئے۔" مولانا نے سوال کرنے والے کو اپنی شکل دکھانے کو کہا۔ کوئی نہ اٹھا تو فرمایا کہ سوال کرنے والا سوشلسٹ معلوم ہوتا ہے۔ آخر ان الفاظ میں وضاحت کی کہ دستور

دستور ہے اور قانون قانون ہے۔ دستور قانون کیسے ہو سکتا ہے اور قانون دستور کیسے ہو سکتا ہے۔لوگ عش عش کرتے چلے سے اٹھ گئے اور پنڈال خالی ہو گیا۔

انہی دنوں ایک لیڈر نے کراچی میں عورتوں کے ایک جلسے سے خطاب کیا اور فرمایا کہ مرد تو اپنی سی کوشش کر کے ہار گئے۔اب عورتوں کو چاہیے کہ میدان میں آئیں اور آئین بنائیں۔وہ یہ کہہ کر اور زندہ باد کرا کر چلے گئے۔ بیبیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کام میں جٹ گئیں۔ جسے دیکھو پکانا ریندھنا چھوڑ کر اس فکر میں ہے کہ دو ایوانی مقنّنہ رکھے یا ایک ایوانی جس کے اندر وہ بیٹھے اور مرد کو باہر دربانی پر بٹھائے۔ بے شک مرد بھی سیاست میں حصّہ لیں لیکن سیاست دربان کی حد تک۔ کسی کو آواز دو کہ بوا چلو، جامع کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کی سیل لگی ہے۔ تو وہ فوراً جواب دے گی کہ بی بی تم چلو میں ابھی آئین بنا کر اور ننھے کو چھی کرا کے آتی ہوں۔ جہاں دو نیک بیبیاں مل بیٹھیں گویا دبستان کھل گیا۔ سروتہ چل رہا ہے اور یہ بحث بھی کہ بنیادی حقوق کے باب میں کیا لکھا جائے۔ آیا مردوں کو کسی قسم کے حقوق دینے کی ضرورت ہے یا ان کا فرائض ہی سے کام چل جاتا ہے۔ بعض اوقات تو سر پھٹول بھی ہو جاتی تھی۔ ایک روز آمنے سامنے کے دو فلیٹوں کی بیگمات کو ہم نے دیکھا کہ ہاتھ

نچا نچا کر ایک دوسرے کے خاندان کے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی فاش کر رہی ہے کہ اری تیرے باوا نے بھی کبھی بنایا ہے آئین؟ ہم سمجھے کوئی مفت کا جھگڑا ہو گا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنجیدہ اختلاف ہو گیا ہے، اس بات پر کہ دفاع اور کرنسی مواصلات مرکز کے پاس رہیں یا صوبوں کے پاس۔

دیکھتے دیکھتے لوگوں میں سیاست کا ایسا مذاق پیدا ہوا کہ انہیں دنوں ضرورت رشتہ کے ایک اشتہار میں ہم نے دیکھا کہ لڑکی مطلوب ہے جو آئین سازی کی ماہر ہو۔ محض سگھڑ، پابندِ صوم و صلوۃ اور قبول صورت نہیں ہونی چاہیئے۔ ماؤں کی دیکھا دیکھی بچوں میں بھی آئین سازی کا ولولہ ایسا بیدار ہوا کہ ادھر چھٹی ہوئی اور انہوں نے ہانک لگائی کہ آؤ آئین آئین کھیلیں۔ کوئی بچہ شام کو دیر سے گھر آتا اور ڈانٹ پڑتی تو فوراً جواب دیا، ابو میں تو سلو کے ساتھ باغ میں بیٹھا آئین بنا رہا تھا۔ جھوٹ نہیں، آپ پوچھ لیجیئے اس سے۔ مجھے تو آپ کا ڈر تھا ورنہ میں اور سلو مرکز اور صوبوں میں تقسیم اختیارات ختم کر کے آتے۔

خیر صاحبان۔ اب جو آئین بن گیا ہے اور اس میں رائے کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے تو ہماری رائے بھی سنئے۔ ہم نے دیکھا کہ حقوق کی بات تو سبھی کرتے ہیں

فرائض کی بات کوئی بھی نہیں کر رہا اور اگر کرتا ہے تو بایں عنوان کے حقوق میں لے لیتا ہوں، فرائض آپ کی نذر ہیں، اگر قبول افتد زہے عزو شرف۔ اپنے مزدور اور محنت کش بھائیوں سے بھی اگر وہ ہمارا گھیراؤ نہ کریں عرض کریں گے کہ حقوق پر زور دیا جا چکا۔ اب چندے اپنے فرائض پر بھی تھوڑا زور ہو جائے کہ سوشلسٹ ملکوں میں یہی ہوتا ہے۔ اب جو کچھ ملے گا پیداوار میں سے ملے گا۔

اب موسم کا حال سنیے

یہ جو ہم اتنے دن کالم نہیں لکھ سکے اس کی وجہ یہ نہیں کہ کہیں باہر چلے گئے تھے۔ جائیں ہمارے دشمن۔ ہم کیوں ملک سے باہر جائیں۔ بس یہیں کراچی میں بیٹھے بارش کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں ہمارے چھاتا دوسرے میں برساتی۔ کوئی ہاتھ خالی ہوتا تو لکھتے۔ چھاتا تو ہم نے اس روز تان لیا تھا جس روز پہلی بار ٹیلی ویژن پر اناونسر ضیاء الحسن صاحب نے بشارت دی کہ کل صبح نہ صرف مطلع ابر آلود رہے گا بلکہ گرج چمک کے ساتھ بارش بھی ہو گی۔ خیر ایک دن کی غلطی ہم سب کی معاف کر دیتے ہیں کیونکہ سیر چشم آدمی ہیں۔ دوسرے دن خورشید طلعت صاحبہ نے اس

بشارت کو دہرایا۔ ہم نے کہا یہ لڑکی جھوٹ نہیں بول سکتی کیونکہ ابھی اس کی عمر جھوٹ بولنے کی نہیں ہوئی۔ پس ہم نے گھر والوں کو لکارا کہ آج تو جو ہوا سو ہوا۔ اب یہ تمہاری سہل نگاری نہیں چلے گی۔ چارپائیاں اٹھا کر ڈرائینگ روم میں رکھو (ہمارے ہاں اور کہیں جگہ نہیں) تاکہ بان بھیگ کر اکڑ نہ جائے اور لان پر دریاں بچھادو کیونکہ زیادہ پانی سے گھاس گل جاتی ہے۔

اس سے اگلے روز علی الصبح ہم نہار منہ ملہار گانے بیٹھ گئے۔ جب گا گا کر گلا بیٹھتا معلوم ہوا تو ہم نے پوچھا:

"کیوں بھئی لوگو بارش بند ہو گئی؟"

جواب ملا۔ "ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔"

تان سینی گولیاں منہ میں رکھ کر اور ایک اور تان اڑا کر (امڑ گھمڑ گھر آئے بدرا) ہم نے کہا "بادل تو خوب گھر گھر آئے ہوں گے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو گا۔ بتّی جلا دو احتیاطاً۔"

جواب ملا۔ "جی نہیں۔ بادل بھی نہیں آئے۔"

ہم نے کہا۔ "کم از کم پروائی تو سنکی ہو گی۔ نرم نرم پروائی۔ کوئل کوکی ہو گی۔ پپیہا بھی بولا ہو گا۔ پی پی پی۔"

علوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ پی پی پپیہا تک دغا دے گیا۔ غالباً احمد رضا قصوری گروپ میں شامل ہو گیا۔

اگلی شام پھر خورشید طلعت نے بتایا کہ کل گرج چمک کے ساتھ بارش ہو گی۔ شاید اولے پڑنے کا بھی کہا تھا۔ کچھ یاد نہیں ہے۔ ہم احتیاط پسند آدمی ہیں۔ انٹر نیشنل ہیئر کٹنگ سیلون کے خلیفہ اللہ دتّا سہارنپوری سے جا کر سر بھی منڈوا آئے کہ ویسے نہیں پڑتے تو یوں پڑیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکیاں جو سڑک کے رخ کھلتی ہیں وہ ہم نے پہلی ہی روز بند کرا دی تھیں تا کہ پانی اندر نہ آئے۔ ہمارے گھر والے کچھ ٹیڑھی طبیعت کے آدمی ہیں۔ حجت کرنے لگے کہ آپ خوامخواہ خود کو ہلکان کر رہے ہیں۔ بارش نہ آئی نہ آئے گی۔ ہم نے کہا، تو یہ موسمیات والے اور ٹیلی ویژن والے جھوٹ کہتے ہیں؟ جواب ملا۔ دیکھا نہیں خورشید طلعت صاحبہ بارش کی بشارت دینے کے بعد خود بھی مسکرا رہی تھیں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ وہ موسمیات والوں پر نہیں مسکرا رہی تھیں۔ ان کو ٹیلی ویژن کی طرف سے آرڈر ہوتا ہے، بات بے بات

مسکرانے کا۔ ہمارے گھر کے لوگ ایسے ہی ہیں کہ منڈیر پر بھنبیری چھوڑ کوا بھی آ بیٹھے تو یہ جان کر کہ ساون آیا اور بارش ہو گی مال پوڑوں کے لیے آٹا گھولنے بیٹھ جاتے ہیں اور موسمیات والوں نے جو ہزاروں لاکھوں روپوں کی مشینیں موسم کا حال معلوم کرنے کے لیے لگا رکھی ہیں ان کو کھڑاگ سمجھتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ آدمی ایک دن غلط بیانی کر سکتا ہے دو دن کر سکتا ہے۔ آج تیسرا دن ہے۔ کان دھر کر سن لو۔

آج تو انہوں نے نہایت ہی وثوق سے کہہ دیا کہ پورے جنوبی علاقے میں گرج چمک کے ساتھ بارش ہو گی۔ جل تھل ہو جائے گا۔ لوگ ڈبکیاں کھاتے پھریں گے۔ اس پر ایک عزیز نے کہا: "جنوبی علاقے کا مطلب آپ نے کراچی کیوں فرض کر لیا۔ مراد پاکستان کے جنوب سے ہے۔ جہاں سمندر ہے۔ خط استوا ہے۔ لنکا ہے۔ بلکہ ممکن ہے جنوبی علاقے سے مراد خط استوا سے جنوب کا علاقہ ہو۔"

ہم ایسے کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ دوسرے دن صبح چھاتا لے کر بارش کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ آپ کہیں گے کمرے کے اندر چھاتا لے کر بیٹھنے کا کیا مطلب؟ آپ لوگ نہیں جانتے۔ گرمی میں جب بارش آتی ہے تو بہت آتی ہے۔ دیواریں رسنے لگتی ہیں

اور چھتیں ٹپکنے لگتی ہیں اور ہمارے پاس ایک ہی سوٹ ہے۔ کوئی نو یا دس بجے ہوں گے کہ ایک صاحب آئے، نچڑتے ہوئے۔ ہم نے کہا۔ "بھئی تم بڑے بیوقوف ہو۔ ایسی بارش میں گھر سے چھاتے بغیر نکل آئے۔ ارے بارش کی پیش گوئی نہیں سنی تھی کیا؟ اب دیکھو تم نے فرش خراب کر دیا۔ سارا پانی تمہارے انگرکھے کا ہمارے قالین پر بہہ گیا۔"

بد تمیزی سے بولے۔ "جناب یہ بارش نہیں پسینہ ہے اور یہ قالین نہیں دری ہے۔"

ہمارے تیقن کی ایک وجہ تھی کہ کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن والوں نے اخباروں میں لمبا چوڑا اشتہار چھپوا دیا تھا کہ موسلا دھار بارش کی وجہ سے بجلی خراب ہو جائے تو فلاں علاقے والے ہمارے فلاں ایمرجنسی سنٹر پر فون کریں اور فلاں علاقے والے فلاں ایمرجنسی سینٹر کو کار لائقہ سے یاد فرمائیں۔ سنا ہے اخبار والوں نے بھی پارسال والی تصویریں بارش کی نکال رکھی تھیں اور اداریے بھی لکھ کر کاتب کو دے دیے تھے کہ بارش سے جھونپڑیوں کا از حد نقصان ہوا ہے۔ ایڈمنسٹریشن والے اپنے فریضہ سے غافل ہیں۔ حالانکہ ان کو ٹیلیویژن پر بارش کا اعلان سنتے ہی رضائیاں اور کھانے کی دیگیں لے کر مختلف کالونیوں میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ قصّہ پار

سال کی تصویروں کا یہ ہے کہ اخبار والے ایک سیٹ بارش کی تصویروں کا رکھتے ہیں تاکہ دوسرے اخباروں سے پہلے پیچھے نہ رہیں۔ آپ نے شاید غور سے نہ دیکھا ہو یہ تصویریں جن میں دو آدمی گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چھاتا لیے سڑک پار کر رہے ہوتے ہیں یا پانی میں پھنسی ہوئی موٹریں اور پانی میں کھیلتے ہوئے بچّے اور گرے ہوئے مکان اور جھونپڑیاں ایک بار بنالی جاتی ہیں اور برسوں کام آتی ہیں۔ کیونکہ ہر بارش میں فوٹو گرافر کا نکلنا مشکل ہے۔ کیمرہ پانی سے خراب ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ریڈیو والے دراز میں سے نکال کر جھٹ سے ریکارڈ لگا دیتے ہیں اور آپ اپنی سادہ لوحی میں سمجھتے ہیں کہ بھائی چھیلا پٹیالے والا مائیکروفون کے سامنے اسٹوڈیو میں بیٹھا گا گا کر بے حال ہو رہا ہے۔

ایک دن تو ہم نے حضرت آرزو لکھنوی کا نسخہ بھی آزمایا:

آج یہ کس نے ساغر پھینکا موسم کی بے کیفی پر

ایسا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب گیا میخانہ بھی

ساغر کا مطلب ہے پیالہ۔ پیالے تو ہمارے ہاں کوئی نہیں ہیں اور اگر چائے کی پیالیوں سے مطلب ہے تو انہیں ہمارے گھر والے تالے والی الماریوں میں رکھتے ہیں۔ ایک گلاس مل گیا تو اسی کو ہم نے کھینچ مارا۔ المومینیم کا گلاس تھا۔ آواز ہوئی تو لوگ بھاگے بھاگے آئے۔ بولے آج پھر بلی آگئی تھی دودھ پینے ؟ ہم نے جب دیکھا کہ آسمان پر بادل کے ٹوٹ کر برسنے کے آثار ابھی ہویدا نہیں ہوئے تو کہا۔ ہاں بلی ہی تھی بڑی نابکار ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ شراب والے ساغر سے مراد ہے اور چھلکنے سے اس میں شراب ہونی چاہیے چاہے دیسی ہو۔ اور آس پاس میخانہ بھی ہونا چاہیے۔ میخانہ نہیں ہو گا تو ڈوبے گا کیا؟ تو یہ قصور ہمارا ہی تھا۔ نسخہ کے سارے اجزا بہم نہیں کیے۔ تاہم مایوسی کی کیا بات ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھا

صاحبو۔ اتنا ہم نے اس لیے لکھ دیا کہ بہت دن سے لکھا نہیں تھا۔ اور صورت قدرت کی طرف سے یہ بنی کہ ایک مہربان دوست اس پر تیار ہو گئے تھے کہ ہمارا چھاتا تانے کھڑے رہیں گے تاکہ چھت ٹپکنے پر ٹپکا ہمارے سر پر نہ آئے۔ دمِ تحریر بھی وہ کھڑے ہیں لیکن کہہ رہے ہیں کہ میں تھک گیا ہوں۔ اب اپنا چھاتا خود

تھامیے۔ لا بھئی لا۔ دے دے چھاتا ہمیں۔ ارے قرون اولیٰ کے دوست تو اپنے دوستوں پر جان تک قربان کر دیتے تھے۔ تو گھڑی بھر کو چھاتا بھی پکڑ کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اچھا بھئی ہم قلم ہاتھ سے رکھتے ہیں۔ اور چھاتا تھامتے ہیں اور ہماری تان سینی گولیوں کی شیشی کہاں گئی؟ مل گئی۔ اب جا بھاگ جا۔ ہمارا گانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔

ام گھمڑ گھر آئے بدرا۔۔۔۔۔۔۔۔۔